فکشن ہاؤس کا کتابی سلسلہ (28)

سہ ماہی

تاریخ

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

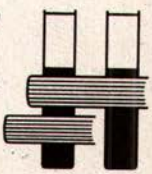

فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ لاہور

فون: 7249218-7237430

E-mail:FictionHouse2004@hotmail.com

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ

فون: 042-6665997

ای میل: mubarakali21@yahoo.com

خط و کتابت (برائے سرکولیشن)

پبلشرز ☜ فکشن ہاؤس

☜ 18-مزنگ روڈ، لاہور

فون ☜ 042-7249218-7237430

قیمت فی شمارہ ☜ 100 روپے

سالانہ ☜ 400 روپے

قیمت مجلد شمارہ ☜ 150 روپے

بیرون ممالک ☜ 2000 روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)

رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان

اہتمام ☜ ظہور احمد خاں

کمپوزنگ ☜ فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز ☜ حاجی حنیف پرنٹرز لاہور

سرورق ☜ عباس

تاریخ اشاعت ☜ جنوری 2006ء

ٹائٹل: تیمور، شاہ منصور کے خلاف جنگ کرتے ہوئے

انتساب

پروفیسر ریاض صدیقی مرحوم کے نام
جن کی اچانک وفات نے پاکستان کے
علمی و ادبی حلقوں کو
سوگوار کر دیا!

فہرست

مضامین

☆تقسیم، تشدد اور ہجرت: میانہ گوندل کی کہانی	احمد سلیم	9
☆حریفانہ تاریخ	کرشن کمار/ترجمہ: ظہور چوہدری	38
☆ہندوتوا اور اس کی میھسٹری (Mhystory)	پردیپ کمار دتا/ترجمہ: نیئر عباس زیدی	55
☆آثاریاتی شہادت بطور قانونی سند	ایم۔ایس۔گنیش رابندرا، شیریں رتناگر/ ترجمہ: نیئر عباس زیدی	66
☆انجمن ترقی پسند مصنفین کے بنیادی عوامل	اشفاق سلیم مرزا	76

تحقیق کے نئے زاویئے

☆مسکراہٹ کی تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	87
☆تہذیب کے نام پر	ڈاکٹر مبارک علی	91
☆کوئلہ کی تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	96
☆کافی کی تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	102

تاریخ کے بنیادی مآخذ

تذکرۃ الواقعات

مصنف: جوہر آفتابچی

ترجمہ: سید معین الحق

مضامین

تقسیم، تشدد اور ہجرت: میانہ گوندل کی کہانی

تحریر: احمد سلیم

(1) مغربی پنجاب میں مہاجرین اور آبادکاری کا ایک عمومی جائزہ

تعارف

پاکستان اور ہندوستان کی علاقائی تقسیم بہت اہم ہے کیونکہ اس سے مراد نہ صرف جنوبی ایشیا کی تاریخ میں پاکستان اور ہندوستان کی آزادی ہے بلکہ یہ دنیا بھر میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کا نقطۂ آغاز بھی ہے۔ بدقسمتی سے اس تقسیم سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کشمکش کا بھی آغاز ہوا۔

برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں دنیا کی تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی عمل میں آئی۔ تقسیم کے سلسلے میں پورے ہندوستان اور پاکستان میں ہونے والی اموات کی تعداد پانچ لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے جبکہ 10 سے 12 ملین افراد نے ترکِ وطن کی غرض سے پنجاب اور بنگال کی نئی بین الاقوامی سرحدوں کو پار کیا۔ اس کے علاوہ لاکھوں لڑکیوں اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی یا انہیں اغوا کر لیا گیا۔ تقسیم کے موقع پر ہونے والا تشدد اس کا سب سے غیر متوقع نتیجہ تھا جبکہ حد بندی ایوارڈ نے کئی اور مسائل کو بھی جنم دیا جن میں طویل مدت کی سرحدی کشمکش، بنیادی ڈھانچے کے مسائل اور کشمیر کا مستقل تنازعہ شامل ہیں۔ (1)

ہجرت

1947 میں تقسیم کے بعد بڑی تعداد میں لوگوں نے پرتشدد فرقہ وارانہ فسادات کی فضا میں

ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں کے آر پار نقل مکانی کی۔ لاکھوں لوگوں نے ایک سے دوسرے ملک کو نقل مکانی کی جس سے یہ دنیا کی معلوم تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی قرار پائی۔ (2)

ہجرت اور ہجرت کرنے والے لوگوں کے ان کہے دکھ اور تکالیف عصری ادب میں ایک نمایاں موضوع رہے ہیں۔ (3) ان موضوعات پر دنیا میں بہت سے مطالعات کیے گئے۔ بہر حال تاریخی مطالعات میں لوگوں اور معاشرے پر تقسیم کے اثرات کی نسبت تقسیم کی وجوہات پر زیادہ توجہ دی گئی۔

ہندوستان کی تقسیم میں جغرافیائی طور پر پنجاب اور بنگال کی تقسیم عمل میں آئی۔ دوسرے صوبوں میں ہجرت کا عمل ان دو صوبوں کی نسبت سست رہا۔ خاص طور پر سندھ میں یہ عمل محدود اور رضا کارانہ رہا اور مہاجرین ایک نسل تک یہاں آتے رہے۔ (4) جبکہ مغربی پنجاب میں یکا یک مذہبی گروہوں کے تعلقات بگڑ گئے اور اچانک بڑی تعداد میں مہاجرین کی آمد ہوئی۔ مغربی پنجاب میں مہاجرین کا مسئلہ ایک بڑے مسئلے کی صورت اختیار کر گیا کیونکہ بڑی تعداد میں بے گھر اور دہشت زدہ مہاجرین امرتسر، جالندھر، ہوشیار پور، اور لدھیانہ سے ہر روز یہاں پہنچ رہے تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں میں 73 فیصد مہاجرین مغربی پنجاب آئے اور اس طرح پنجاب کو پچاس لاکھ مہاجرین کو جگہ دینا پڑی جو نقل مکانی کا سلسلہ ختم ہونے پر یہاں کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ بنے۔ مثال کے طور پر لاہور کی 43 فیصد آبادی مہاجروں پر مشتمل تھی، ملتان میں یہ تناسب 49 فیصد تھا، گجرانوالہ میں 50 فیصد، جھنگ میں 65 فیصد، اور لائلپور اور سرگودھا میں 69 فیصد تھا (5)۔ نسبتاً مختصر مدت میں ایک بہت بڑی تعداد میں مہاجرین مغربی پنجاب میں آ بسے۔

اس سلسلے میں نمایاں رجحانات مختصراً درج ذیل ہیں:

☆ لوگوں نے انفرادی طور پر اور گروہوں کی شکل میں مصائب کا سامنا کیا اور اپنی جان بچانے کی خاطر اپنی املاک چھوڑ کر ہجرت کی۔ زیادہ تر لوگوں کے ساتھ جو سامان تھا وہ چند کپڑوں اور کھانے پینے کی اشیاء مثلاً بھنے ہوئے چنوں اور چھوٹی موٹی چیزوں پر مشتمل تھا۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو ننگے پاؤں تھے۔ چونکہ مذہبی فسادات کے پیچھے سب سے بڑا مقصد نسل کشی تھا اس لئے مسلح گروہوں نے مخالف نسلی گروہ کے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ فوری طور پر اپنا گھر بار چھوڑ کر نکل جائیں۔ اس لئے مہاجرین راستے میں پیش آنے والی دشواریوں اور مصائب کا

سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

☆ ایک مسئلہ جو مہاجرین کو پیش آیا وہ یہ تھا کہ مہاجر کیمپوں تک پہنچنے کے لئے ٹرانسپورٹ موجود نہ تھی۔ زیادہ تر لوگ کیمپوں تک پیدل جاتے تھے بہت کم لوگوں کے پاس بیل گاڑی تھی جس پر وہ اپنا سامان لے جا سکتے تھے۔ اس سست رفتار نقل و حرکت کی وجہ سے ان کے لئے حملہ آوروں کا خطرہ اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی ساز و سامان نہیں تھا کیونکہ مقامی پولیس نے یا فوج نے ان سے ہتھیار لے لئے تھے۔ صرف چند لوگ ایسے تھے جو کسی طرح اپنے ساتھ تلوار یا بندوق لے آئے تھے۔

☆ برطانوی فوج میں پنجاب کے لوگوں کی تعداد بہت تھی اور مغربی اور مشرقی پنجاب دونوں میں ہی تقریباً ہر خاندان میں سابق فوجی موجود تھے۔ اس وجہ سے حملے اور بھی زیادہ مہلک ثابت ہوئے۔ ان میں زیادہ تر حملے بڑے منظم تھے اور منصوبندی کے تحت کئے گئے تھے۔ (6)

☆ نقل و حمل کے ناقص ذرائع اور راستوں میں حائل دریاؤں اور بند پلوں کی وجہ سے لوگوں کے انخلاء میں زیادہ وقت صرف ہو رہا تھا۔ جبکہ مہاجر کیمپوں میں زندگی کئی طرح کے مسائل مثلاً ناکافی اور مضر صحت خوراک، حملوں کے خطرے اور اسہال کی وبا پھیلنے کی وجہ سے ایک تلخ تجربہ تھی۔ عام طور پر مہاجروں کو انتہائی ضرورت کی صورت میں بھی کیمپوں سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے اشیائے صرف کی قلت پیدا ہو گئی اور لوگوں کو سرکاری حکام کی طرف سے دیے جانے والے راشن پر یا پھیری والوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ مسلح حملہ آور مہاجر کیمپوں کے گرد گھومتے رہتے اور فوج کے سخت رویے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بے سر و سامان مہاجروں پر حملے کرتے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مقامی تحصیلدار اور سرکاری اہلکار مسلح گروہوں کو ان کے نسل کشی کے کام میں مدد دیتے تھے۔ جنڈیالہ گورو میں ایک واقعے میں سکھ فوج نے تقریباً 1500 مہاجروں کو گھیرے میں لے لیا اور جو کوئی بھی اس سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا اسے مار ڈالا جاتا۔ یہاں تک کہ لوگوں پر دستی بم بھی پھینکے گئے۔ (7)

☆ بہت سے لوگوں کے رشتہ دار فسادات اور ہنگاموں میں گم ہو گئے۔ بعض لوگ اس قدر بد دل ہو گئے کہ انہوں نے خود کو بلوائیوں کے حوالے کر دیا۔ جبکہ جو لوگ جان بچا کر یہاں پہنچے ان کے حوصلے پست تھے اور وہ پاکستان میں نئی زندگی شروع کرنے کے قابل نہیں تھے۔

☆ مذہبی فسادات اور قتل عام بڑے پیمانے پر ہوا۔ پورے کے پورے گاؤں جلا دیے گئے، ٹرکوں میں بھرے ہوئے مہاجروں کو مولی گاجر کی طرح کاٹ ڈالا گیا، بسوں اور قافلوں پر بار بار حملے ہوئے، بچے گم ہو گئے اور لڑکیوں کو اغوا کر لیا گیا۔ تقسیم کے بعد کے چند ماہ میں تقریباً پانچ لاکھ افراد مارے گئے۔

☆ برسوں سے سکھوں نے اپنے آپ کو باقی دو مذہبی گروہوں ہندوؤں اور مسلمانوں سے علیحدہ ایک گروہ منوالیا تھا۔ انہوں نے 1942 میں ''آزاد پنجاب'' اور 1944 میں ''خالصتان'' کا خیال پیش کیا۔ بعد میں انہوں نے مطالبہ کیا کہ اگر ہندوستان تقسیم نہیں ہوتا تو سکھوں کے لئے آئینی ضمانتیں موجود ہونی چاہئیں اور اگر ہندوستان کی تقسیم عمل میں لائی جاتی ہے تو ان کے لئے ایک آزاد ریاست قائم کی جانی چاہئے۔ ہندوؤں نے سکھوں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا جس وجہ سے سکھوں نے نسل کشی میں زیادہ حصہ لیا۔ سکھ جتھوں نے مشرقی پنجاب سے نکلنے والے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ (8)

☆ 1946-47 میں عورتوں کے اغوا اور ان پر حملوں کے واقعات میں اضافے سے بلا شبہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ 'دوسروں' کی عزت اور پہچان کے سب سے تحفظ یافتہ پہلو کو نشانہ بنانے کی کوشش تھی۔ (9) دیہات پر حملوں کے دوران عورتوں نے اپنی عزت بچانے کی خاطر کنوؤں میں چھلانگ لگا دی۔ ہزاروں عورتوں اور بچوں کو سرحد کے دونوں اطراف اغوا کر لیا گیا اور ان کے خاندانوں کی طرف سے انہیں واپس قبول کرنے سے انکار نے ان کی تکالیف میں مزید اضافہ کیا۔ عورتوں اور بچوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک اور بے رحمی سے قتل کے مناظر عام تھے۔ ان کی لاشوں میں اکثر تلوار یا کرپان گڑی ہوتی تھی۔

☆ تقسیم پنجاب کے بارے میں ریڈکلف ایوارڈ جس کا اعلان تقسیم ہندوستان کے تین دن بعد کیا گیا، میں گورداسپور، لدھیانہ اور امرتسر کے مسلم اکثریت والے علاقوں کو پاکستان میں شامل کرنے سے انکار کر دیا گیا (10)۔ اس ایوارڈ کے پاکستان کی جغرافیائی صورت

اوراس کے مستقبل پر جو اثرات ہوئے سو ہوئے، اس نے ہزار ہا لوگوں کو مذہبی فسادات کے خطرے سے بے خبر رہنے دیا۔ وہ اپنے علاقوں کی پاکستان میں شمولیت پر مٹھائی بانٹ رہے تھے مگر انہیں تشدد کی لہر نے آلیا اور ان میں سے ہزاروں مارے گئے۔

☆ بعد میں 1965 اور 1971 میں ہونے والی جنگوں نے ثابت کر دیا کہ ریڈ کلف ایوارڈ کی طے کردہ سرحدیں واضح حد بندیاں نہیں تھیں بلکہ ناپختہ اور بے امن تقسیم تھی۔ (11)

☆ اس کے علاوہ ریڈ کلف کی حد بندی نے پنجاب کے ترقی یافتہ بنیادی ڈھانچے کے نظام کو بھی کاٹ ڈالا، سڑکیں، ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کا مواصلاتی نظام درہم برہم کر دیا، اور سب سے اہم یہ کہ علاقے کا اہم آبپاشی نظام درہم برہم کر دیا۔ 1960 میں سندھ طاس معاہدے کے ذریعے پنجاب کے پانی سے متعلق مسائل حل ہو پائے۔ تاہم بنیادی طور پر پانی کے یہ مسائل کشمیر کے مسئلے سے منسلک تھے جو آج تک پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات میں خرابی کی وجہ ہے۔ (12)

☆ بعض لوگوں نے مغربی پنجاب چھوڑ کر جانے سے بچنے کے لئے اسلام قبول کر لیا۔ انہیں مقامی لوگوں نے دیندار کا نام دیا اور ان کی املاک اور جائیدادیں محفوظ رہیں۔

☆ شدید نسلی تناؤ کی فضا میں بعض لوگوں نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر دوسرے گروہوں کے لوگوں کو بحفاظت ہجرت میں مدد کی۔

☆ مہاجرین کی اکثریت کا خیال تھا کہ تقسیم ایک عارضی مرحلہ ہے کیونکہ ہندو رہنما ایسی افواہیں پھیلا رہے تھے اور پیشگوئیاں کر رہے تھے۔ اس لئے لوگوں نے نیم دلی سے ہجرت کی یا اس وقت ہجرت کی جب انہیں دوسرے گروہوں کے لوگوں نے اس پر مجبور کر دیا اور ان کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ واپس اپنے علاقوں میں آ جائیں گے۔ انہیں اپنے آبائی دیہات سے لگاؤ تھا اور انہیں وہ اپنی شناخت اور فخر کی بنیاد سمجھتے تھے۔

☆ جب پاکستان وجود میں آیا تو اس کے وسائل بہت کم تھے اور معاشی مسائل بہت زیادہ تھے، جن میں سے ایک مسئلہ لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کی موجودگی تھا، زیادہ تر لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ پاکستان چند ماہ سے زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکے گا۔

☆ اپنے ماضی کی شان و شوکت کی نشانی دہلی شہر کی یاد لوگوں کو ستاتی تھی۔ یہ جنوبی ایشیا کے بہت

سارے مسلمانوں کے لئے گہرے دکھ اور زیاں کا احساس تھا جو تقسیم کے تجربے میں اہم ترین حیثیت رکھتا تھا۔ (13)

آبادکاری

لاکھوں مہاجرین کی آبادکاری ایک دشوار کام تھا جس کے لئے ٹھوس منصوبہ بندی اور برسوں کی محنت درکار تھی۔ ایک معاشی لحاظ سے بدحال اور نئی قائم شدہ ریاست کے لئے یہ اور بھی مشکل کام تھا۔ صنعتوں اور زیر کاشت زمینوں کی بحالی کافی نہیں تھی بلکہ ان دونوں کی توسیع ضروری تھی تا کہ لاکھوں لوگوں کو روزگار مل سکے جو مہاجر کیمپوں میں رہ رہے تھے۔

پنجاب کی تقسیم کی وجہ سے مغربی حصے میں مسلم اکثریتی معاشرہ وجود میں آیا۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے زیادہ تر مہاجرین ایک سال کے اندر اندر نئی سرزمین پر آباد ہو چکے تھے۔ ان کے جائیدادوں کے کلیم بھی طے پا چکے تھے کیونکہ ہندوستان کے ساتھ محصولات کے ریکارڈ کا تبادلہ جلد ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے کئی لوگوں نے مہاجرین کے معاملات کے ذمہ دار افسران کے ساتھ مل کر جھوٹے کلیم داخل کیے اور دولت اکٹھی کر لی۔ (14)

1947 کی تقسیم پاک و ہند کے نتیجے میں تارکین وطن کی آبادکاری پر کیے گئے مطالعات سے درج ذیل رجحانات واضح ہوتے ہیں:

☆ بعض علاقوں میں لوگوں نے مہاجرین کا خیر مقدم کیا، انہیں رہائش، زمینیں اور کھانا پیش کیا اور انہیں مختلف قسم کے کاروبار شروع کرنے میں مدد دی۔

☆ مہاجرین کے نئے وطن میں پہنچنے کے تجربات ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ بعض کے رشتہ دار یہاں موجود تھے جنہوں نے ان کو سہولتیں مہیا کیں اور وہ جلد ہی اپنے پرانے پیشوں میں کام کرنے لگے۔ کم خوش نصیب لوگ وہ تھے جنہیں اپنے لئے خود راستہ بنانا پڑا۔ انہیں کچھ مدت تک مصائب برداشت کرنا پڑے اور کئی کئی ماہ کیمپوں میں حوصلہ شکن بے کاری میں کاٹنے پڑے۔

☆ عمومی طور پر مہاجر کیمپوں کی حالت بری تھی۔ وہاں خوراک اور دوسری اشیائے صرف کی کمی تھی کیونکہ بدعنوان سرکاری اہلکار مہاجرین کے لئے عطیات میں ملنے والی چیزیں بلیک

مارکیٹ میں بیچ دیتے تھے۔

☆ بعض علاقوں میں لوگ مہاجرین کے خلاف تعصب رکھتے تھے اور انہیں ایک معاشی بوجھ سمجھ رہے تھے۔ اگرچہ ایسا زیادہ تر سندھ میں ہوا لیکن پنجاب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ لوگ مقامی اہمیت کے کسی بھی معاملے میں مہاجرین کی مداخلت کو ناپسند کرتے تھے۔

☆ جب ہندو اور سکھ ہندوستان کی طرف ہجرت کر گئے تو ان کی شہری اور دیہی جائیداد پر اس علاقے میں آباد بعض مقامی لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ مگر جلد ہی جب حکومت نے متروکہ املاک کو ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کو الاٹ کرنا شروع کیا تو مقامی لوگوں کو یہ جائیداد واپس کرنا پڑی۔ اس کی وجہ سے بھی آنے والے مہاجرین کے خلاف ناپسندیدگی بڑھی۔

☆ کلیم کی ادائیگی کا نظام نہ تو منظم تھا اور نہ ہی شفاف، رشوت، سرکاری حکام سے تعلقات یہاں تک کہ بعض اوقات جعلسازی سے ادائیگی کے عمل کو تیز تر کرنے یا کلیم کے حصول کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ وہ لوگ جن کو یہ ذرائع میسر تھے انہوں نے اس کا بہت فائدہ اٹھایا اور انہیں آسانی سے کلیم حاصل ہو گئے۔ بہت سے لوگ جن کے پاس مشرقی پنجاب میں کچھ بھی نہیں تھا جعلسازی کے ذریعے یہاں بڑی جائیدادوں کے مالک بن گئے۔

☆ زیادہ تر خوشحال مہاجرین کو مغربی پنجاب میں کم کلیم ملا۔ اس کی وجہ ان کی رشوت دینے کی استعداد نہ ہونا یا رشوت دینے یا کوئی اور ناجائز طریقہ اختیار کرنے پر رضامند نہ ہونا ہو سکتی ہے۔ تاہم کچھ خوش نصیب لوگ ایسے بھی تھے جن کے کلیم کی ادائیگی شفاف طریقے سے ہوئی اور جو اس سے مطمئن تھے۔

☆ بعض مہاجرین ہمیشہ مشرقی پنجاب میں اپنے گھروں کو لوٹ جانے کا سوچتے رہے۔ اس سوچ میں ہجرت کی وجہ سے بے خانمائی کا احساس بہت نمایاں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس بے خانمائی کی وجہ سے نئے وطن میں ان کے کوئی کام کرنے یا کاروبار شروع کرنے کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بہت سا وقت واپس جانے کی کوششوں میں ضائع کر دیا اور اس وجہ سے یہاں اچھی طرح آباد نہ ہو سکے۔

☆ سیاسی شعور رکھنے والے اور پڑھے لکھے لوگ سمجھتے تھے کہ تقسیم ناگزیر تھی۔ انہوں نے پاکستان پہنچنے کے فوراً بعد ہی ایک نئی زندگی شروع کر دی۔

☆ جن لوگوں نے نئے وطن میں بدلتے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی انہوں نے پُر امیدی اور محنت کی مثال قائم کی۔ انہوں نے اپنے پرانے پیشوں میں کام کرنا شروع کیا یا بالکل نئے کاروبار میں لگ گئے۔

☆ کچھ لوگ اپنی قیمتی چیزیں اور املاک اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کے حوالے کر آئے تھے کہ حالات بہتر ہونے پر واپس آجائیں گے مگر بدقسمتی سے وہ کبھی ایسا نہیں کر سکے۔

☆ نسبتاً کم وقت میں مغربی پنجاب میں مہاجرین دوبارہ آباد ہو چکے تھے۔ قتلِ عام اور خوفناک مذہبی فسادات کے نتیجے میں ان کے اندر احساسِ عدم تحفظ، مسلم تشخص کو لاحق خطرات اور مسلح افواج پر انحصار کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے عام طور پر مارشل لا حکومتوں کے حامیوں کا کردار ادا کیا یا ہندوستان مخالف اور اتحادِ اسلامی کی پالیسیوں کی وجہ سے دائیں بازو کی پارٹیوں کی حمایت کی۔ مہاجروں کی سیاسی شناخت زیادہ اہمیت رکھتی تھی کیونکہ ان کی بڑی تعداد شہروں میں آباد تھی۔

☆ مغربی پنجاب میں بڑی تعداد میں مہاجرین کی آمد نے اسے پاکستان کا بڑا صوبہ بنا دیا۔ اسے فوجی، افسر شاہی اور معاشی قوت کے اعتبار سے مرکزی مقام مل گیا۔

تقسیم نے بہت بڑے پیمانے پر دکھ اور مصائب پیدا کیے جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے، گرچہ اموات کی تعداد متنازعہ ہے۔ جنوبی ایشیا میں تقسیم کی باقیات صرف ہندوستان اور پاکستان کی آزادی نہیں بلکہ تشدد اور تشدد کی یادیں بھی ہیں۔ ان زخموں کے نشان اگر جنوبی ایشیا کے بہت سے لوگوں کے جسموں سے مٹ بھی گئے تو ذہنوں میں باقی ہیں اور یہ اثرات اصل زخم اٹھانے والوں سے ان کی اگلی نسلوں کو بھی منتقل ہوئے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تصادم جنوبی ایشیا کا لازمی حصہ ہے۔ دونوں حکومتوں کی طرف سے نہ ختم ہونے والا پراپیگنڈا اور عوامی سطح کے بعض سلسلے جن میں میڈیا اور تعلیمی اداروں کے سلسلے بھی شامل ہیں سرحدوں کے آر پار نفرتوں کو بڑھاتے رہے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے 56 برس بعد، بنگلہ دیش کے قیام کے 32 برس بعد اور افغانستان سے آخری سوویت فوجی دستوں کے انخلاء کے 14 برس بعد آج بھی پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مہاجرین کی سیاست ہو رہی اور آبادکاری کا عمل اور مسلح تصادم کے نتیجے میں آنے والے لاکھوں مہاجرین کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ (15)

(2) جائزے کے لئے میانہ گوندل کا انتخاب کیوں؟

تقسیم، ہجرت اور آبادکاری کے حوالے سے ہم نے میانہ گوندل کا تفصیلی جائزہ لیا۔ میانہ گوندل مغربی پنجاب کا ایک گاؤں ہے جسے 1947 میں تقسیم ہندوستان کے وقت مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔

اسلام آباد سے لاہور موٹروے پر واقع میانہ گوندل، ضلع منڈی بہاؤالدین کا ایک گاؤں ہے۔ گاؤں کے ایک طرف ضلع سرگودھا کے شہر پھلروان اور بھلوال ہیں اور دوسری طرف ضلع جہلم کی تحصیل پنڈ دادن خان ہے۔ میانہ گوندل ایک چھوٹا سا گاؤں ہے مگر اس کی تاریخ کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں پر ایک ڈسپنسری، ایک ڈاکخانہ، اور لڑکوں کے لئے ایک پرائمری سکول انیسویں صدی کے اواخر میں قائم کیا گیا تھا۔

1947 کی تقسیم سے پہلے یہ گاؤں مسلمانوں اور ہندوؤں کا وطن تھا جن میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ آس پاس کے دیہات میں ہندو اور سکھ اکثریت میں تھے جن کو اس مطالعاتی جائزے میں شامل کرنا اس لئے ضروری ہوگیا تا کہ مقامی صورتِ حال کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔ اس علاقے میں تقسیم کے فسادات ہوئے، مہاجرین آئے اور ملک چھوڑ کر جانے والے گئے۔ ان سب باتوں نے اس گاؤں کی سماجی و معاشی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے۔ آج یہ گاؤں پُرامن ہے مگر شہر میں تبدیل ہونے کی روز بدلتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بارے میں پریشان ہے۔ 1998 کی مردم شماری کے مطابق 8173 ایکڑ کے علاقے پر پھیلے ہوئے اس گاؤں کی آبادی 17,872 (9,243 مرد اور 8,629 عورتیں) ہیں جس میں 106 غیر مسلم ہیں جبکہ قریبی دیہات چک 26 اور ڑیایت کی آبادی بالترتیب 3974 اور 3205 ہے اور ان کی غیر مسلم آبادی بالترتیب 153 اور 12 ہے۔ (16)

میانہ گوندل میری جائے پیدائش ہے اور میں اسے بہتر انداز میں سمجھ سکتا تھا مگر میں 1947 میں صرف ڈھائی سال کا تھا اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو مہاجرین کے آجانے کی وجہ سے گاؤں کی صورت بدل چکی تھی۔ چنانچہ یہ ضروری تھا کہ ان لوگوں سے بات چیت کی جائے جنہوں نے تقسیم کے فسادات دیکھے اور جو یہ بتا سکتے تھے کہ مہاجرین کی آمد کے بغیر میانہ گوندل کیسا تھا۔

یہ بات نوٹ کی جانی چاہئے کہ 1947 کی تقسیم پر دنیا بھر میں جو مطالعاتی جائزے لئے گئے ان میں صرف پاکستان کے نمایاں علاقوں مثلاً لاہور، لائلپور (فیصل آباد) پر توجہ دی گئی۔ کسی نے بھی دوردراز کے دیہات پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ نہیں لیا۔ دوسرے، ان میں زیادہ تر مطالعات میں قتلِ عام کو مرکزی مسئلے کے طور پر دیکھا گیا اور جانیں بچانے کے واقعات کے حوالے خال خال ہی ملتے ہیں۔ ایک اور مقبول موضوع مذہبی گروہوں کے درمیان تناؤ ہے جو کہ تقسیم کے دوران علاقائی بدامنی کی بنیادی وجہ بنا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے بہت سے واقعات پر تحقیق نہیں کی جاسکی۔

تاہم، اس مطالعاتی جائزے میں اندرون پنجاب کے ایک گاؤں کو توجہ کا مرکز بنا کر سماجی طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور مالی درجہ بندی میں معیشت کے کردار کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے مذاہب کے لوگوں کی جانیں بچانے کے واقعات کو اجاگر کر کے دوسرے محققین کی جانب سے اختیار کیے گئے طریقے کی خامیوں اور کمزوریوں کو واضح کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔

اس مطالعے کی افادیت کیا ہے؟

اس مطالعے کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں ایک بالکل نئے موضوع کا احاطہ کیا گیا ہے جس پر اس سے پہلے کبھی نہیں لکھا گیا۔ میانہ گوندل کی اہمیت تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد غیر متنازعہ ہے اور اس مطالعاتی جائزے کو تقسیم کے بارے میں پہلے سے موجود بہت سے مطالعات سے ممتاز کرتی ہے۔

پاکستان کی 70 فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے اس لئے ملک کے نقشے اور واقعات کی تاریخ میں دیہات کو اہمیت حاصل ہے۔ پنجاب میں مہاجرین کی اکثریت کو دیہات میں آباد کیا گیا جبکہ مہاجرین کی کل تعداد پچاس لاکھ تھی۔ اس لئے یہ انتہائی اہم ہو جاتا ہے کہ تقسیم سے پہلے کی زندگی، تقسیم کے ان علاقوں پر اثرات اور اس کے بعد کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔ اس طرح یہ جائزہ میانہ گوندل کے بارے میں زمینی حقائق کو اجاگر کر سکتا ہے، جو کہ ایک پنجابی گاؤں ہے اور بہت سے ایسے دوسرے دیہات کی نمائندگی کرتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں میانہ گوندل اندرون پنجاب کے دوسرے دیہات سے بہت

مشابہہ ہے وہاں اس کی کچھ خصوصیات مختلف بھی ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں تقسیم کے دوران تباہی بھی ہوئی اور انسانیت کے مظاہر بھی دیکھنے میں آئے۔ ایک طرف تو مکانات جلائے جا رہے تھے اور ہندوؤں اور سکھوں کو قتل کیا جا رہا تھا اور بھگایا جا رہا تھا جبکہ دوسری طرف لوگ دوسروں کی زندگیاں بچانے میں بھی مصروف تھے یہاں تک کہ بعض نے خود اپنی جانیں خطرے میں ڈال دیں تا کہ دوسرے مذہب کے لوگوں کو علاقے سے بحفاظت نکلنے میں مدد دے سکیں۔ میرے دادا خواجہ فضل کریم کے خاندان نے سکھوں کو علاقے سے نکلنے میں مدد دی اور ان کی جانیں بچانے کی کوشش کی۔

اس جائزے سے ملتے جلتے مطالعاتی جائزے جن میں مختلف علاقوں میں کسی ایک علاقے کا جائزہ لیا گیا ہو اور مذہبی گروہوں کے درمیان تصادم اور ہم آہنگی کو معروضی انداز میں دیکھا گیا ہو۔ تقسیم کے بارے میں ان نظریات کو تبدیل کرنے میں مدد دیں گے جو عمومیت پر مبنی ہیں۔ اس طرح یہ غیر صحیح تاریخی حقائق کو دور کرنے میں مددگار ہوں گے جو ہندوستان اور پاکستان میں چھپنے والے مواد میں موجود ہیں اور ایک دوسرے کو دشمن کے طور پر دکھانے والے پراپیگنڈے کو بھی کم کر سکیں گے۔

(3) جائزے کا طریقِ کار

اس علاقے پر تقسیم کے اثرات کو سمجھنے کے لئے ایسے بہت سے لوگوں سے رابطہ کیا گیا جنہوں نے تقسیم کے فسادات دیکھے تھے۔ ان میں میانہ گوندل، وڑیایت اور چک 26 کے پرانے باشندے بھی شامل ہیں اور وہ لوگ بھی جو ہجرت کر کے یہاں آئے۔ ان لوگوں کے انٹرویوز کی روشنی میں اس مطالعاتی جائزے کو تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

الف۔ تقسیم سے قبل کی صورتِ حال

ب۔ مہاجرین

ج۔ آبادکاری کے مسائل

تقسیم سے قبل کی صورتِ حال

ان مقامی لوگوں کے مطابق جو اس عمر کے تھے کہ واقعات کو یاد رکھ سکیں اور اس دور کی روزمرہ

زندگی کے انداز اور واقعات کو بیان کر سکیں، گاؤں میں ہندو، مسلمان اور سکھ آباد تھے، جن میں مسلمان اکثریت میں تھے، جبکہ قریبی دیہات چک 26 (جسے پہلے گوبند پورہ کہا جاتا تھا) اور چک 28 میں غیر مسلموں کی تعداد زیادہ تھی۔ (17)

چک 28 کی ساری آبادی سکھوں پر مشتمل تھی جو بڑے زمیندار تھے۔ ان میں زیادہ تر برطانوی فوج کے ریٹائرڈ افسر تھے اور حکومت نے ان کی خدمات کے صلے میں انہیں وسیع اراضی الاٹ کی تھی۔ جبکہ چک 26 میں مسلمان اقلیت غیر مسلم چودھریوں کے لئے چھوٹی موٹی مزدوری کرتی تھی۔ بہرحال، ان دیہات کے لوگوں کے مسلمانوں سے اچھے تعلقات تھے۔ (18)

میانہ گوندل میں غیر مسلم جو زیادہ تر ہندو تھے تجارت پیشہ تھے۔ وہ امن پسند لوگ تھے اور کسی بھی قسم کے فسادات سے بچنا چاہتے تھے۔ کاروباری ہونے کے ناطے غالباً وہ بحث اور اختلافات پر وقت اور پیسہ ضائع کرنے کو بے کار سمجھتے تھے۔ جب بھی ان کی آپس میں لڑائی ہوتی تو کبھی تشدد اور مار کٹائی کی نوبت نہیں آتی تھی بلکہ محض دھمکیاں دی جاتیں اور ایک دوسرے کو چوہڑے، مُصلی وغیرہ کے القابات دیے جاتے۔ (19) ان کے اپنے کھوجی بھی ہوا کرتے تھے۔ اگر کسی گاؤں والے کو لوٹ لیا جاتا تو وہ چوروں کے قدموں کے نشانوں کا پتہ لگاتے اور بعض اوقات چوری شدہ مال واپس بھی لے آتے۔ (20)

غلام حسین پرانی یادوں میں کھوئے ہوئے لہجے میں کہتے ہیں کہ تقسیم سے پہلے تمام مذہبی گروہ ایک دوسرے کے ساتھ امن و آشتی سے رہتے تھے اور ایک دوسرے پر انحصار کرتے تھے۔ ان کے آپس میں بہت اچھے تعلقات تھے اور یہ گاؤں ایک دوسرے پر انحصار اور باہمی دوستی کی ایک عمدہ مثال تھا۔ (21) چودھری شیر علی بھی مندرجہ بالا بیان کی تصدیق کرتے ہوئے پڑوس میں آباد سکھوں سے اپنے خاندان کے تعلقات کو یاد کرتے ہیں۔ ان کے دو بھائیوں گوپی سنگھ اور صاحبزادہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے اور ان کی زرعی زمین مشترک تھی۔ وہ بے شمار زرعی سرگرمیوں مثلاً ہل چلانے، جڑی بوٹیاں نکالنے، پانی دینے اور فصل کی کٹائی میں ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ انہوں نے مزید کہا کہ چک 26 کے ہندوؤں نے ان کے خاندان کی زمین بعض مزارعوں کے قبضے سے واپس لینے میں بھی مدد کی۔ (22) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض صورتوں میں مالی درجہ بندی اور طبقاتی شعور مذہبی شعور سے بالاتر تھا۔

موت اور شادی کے موقعوں پر ہر مذہب کے لوگ دوسروں سے اپنی اپنی روایات کے مطابق ملتے۔ فاطمہ بی بی کے بقول جیسا کہ ہندو اور سکھ زیادہ خوشحال تھے وہ مسلمانوں کی ان موقعوں پر مدد کرتے تھے۔ خوشی کے موقعوں پر وہ مسلمانوں کو مٹھائی اور تحائف بھی بھیجتے تھے۔ یہ ان قرضوں کے علاوہ تھا جو وہ مسلسل مسلمان کاشتکاروں کو فراہم کیا کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ اس پر سود لیا کرتے تھے مگر یہ اس وقت ایک بہت بڑی سہولت تھی۔ جب ہندو یہاں سے چلے گئے تو مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ان کی مدد کے لئے اب کوئی موجود نہیں ہے۔ (23) مسلمان بھی اپنے انداز میں ان کی مدد کیا کرتے تھے اور میلوں اور تہواروں مثلاً بیساکھی اور دیوالی میں شریک ہوتے تھے۔ بیساکھی کے موقع پر لوگ گھڑ دوڑ، کشتی اور کبڈی میں حصہ لیتے تھے۔ (24) جہاں تک مذہبی آزادیوں کا سوال ہے، حاجی احمد بخش کے بقول لوگوں کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی تھی، کوئی دوسروں کی مذہبی سرگرمیوں میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ (25)

مذہبی اختلاف کی وجہ سے مسلمان اور ہندو اکٹھے کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ ان کے کھانے پینے کی عادات ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ ہندوؤں کو ان کا مذہب مرغ اور چھوٹا گوشت کھانے کی اجازت دیتا تھا مگر گائے کا گوشت کھانا ان کے ہاں سختی سے منع تھا۔ اس وجہ سے وہ اکٹھے نہیں کھاتے تھے۔ اس سلسلے میں ہندو زیادہ محتاط تھے۔ اگر کوئی مسلمان ان کے کھانے پکانے کی جگہ (چوکا) کے پاس سے گزر جاتا تو ان کی عورتیں اسے گوبری سے صاف کرتیں۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں: ایک تو یہ کہ گائے کو ہندو مذہب میں مقدس مانا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ دیہات میں یہ عام رواج تھا کہ لوگ خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو اپنے گھروں کے صحن کو گوبری سے لیپتے تھے۔ اس سے گھر صاف اور نیا نیا دکھائی دینے لگتا۔ جواب دہندہ نے یہ بھی بتایا کہ اگر اتفاقاً بھی کسی ہندو عورت کے کپڑوں کو کسی مسلمان کا ہاتھ چھو جاتا تو وہ گھر جاتے ہی کپڑے تبدیل کرتی کہ اس کے کپڑے ناپاک ہو گئے ہیں۔ مسلمان بھی ہندوؤں سے کھانے کی کوئی چیز نہیں لیا کرتے تھے صرف خشک اناج وغیرہ کا ایک دوسرے سے تبادلہ کر لیا کرتے تھے۔ (26) فاطمہ بی بی نے بتایا کہ چک 26 کے سکھوں کا رہن سہن زیادہ اچھا نہیں تھا۔ وہ عام طور پر گندے رہتے تھے اور کبھی بھی حلال گوشت نہیں کھاتے تھے۔

چونکہ دونوں مذہبی گروہوں کے لوگ ایک دوسرے کی پکائی ہوئی چیزیں نہیں کھاتے تھے اس

لئے شادیوں پر خصوصی انتظامات کیے جاتے۔ ہندو مسلمان باورچی کا انتظام کرتے کہ وہ مسلمانوں کے لئے کھانا پکائے اور مسلمان بھی ایسا ہی کیا کرتے۔

کاروبار کے لحاظ سے مقامی ہندو دکاندار تھے اور غلے کی تجارت کرتے تھے۔ بعض کسان بھی تھے۔ ان کسانوں میں بعض نے ترکِ وطن کے وقت اپنی زمینیں علاقے کے بااثر لوگوں کو بیچ دیں۔ حساب کتاب میں اچھے اور محنتی ہونے کی وجہ سے مقامی کاروبار پر ہندوؤں کی اجارہ داری تھی اور زیادہ تر دکانیں انہی کی تھیں۔ جواب دہندہ کا خیال ہے کہ وہ اپنا مال کم قیمت پر بیچتے تھے مگر دھوکے کے ذریعے زیادہ منافع کماتے تھے۔ مثال کے طور پر اپنی زیادہ تر چیزیں ادھار پر بیچتے تھے اور اپنے کھاتوں میں ادھار کی رقم بڑھا دیتے تھے۔ یہ کھاتے لنڈئی میں لکھے ہوئے ہوتے تھے جو تمام مسلمانوں کو پڑھنی نہیں آتی تھی۔ ان کی دوسری خصوصیت ان کی کاروبار کے بارے میں سمجھ بوجھ تھی۔ وہ سرگودھا اور منڈی بہاءالدین کی بڑی منڈیوں میں غلے اور فصلوں کی تجارت کے ہر پہلو سے واقف تھے۔ اس کے برعکس مسلمان لاعلم اور ان پڑھ تھے۔ کھیتوں میں زیادہ محنت کرنے کے باوجود وہ ہمیشہ ہندو ساہوکاروں کے قرضوں تلے دبے رہتے۔ (28)

ہندو ہر کسی کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آتے اور اس طرح اپنے خریدار بڑھاتے۔ مثال کے طور پر اگر دوسرے گاؤں سے عورتیں ان کی چکی سے آٹا لینے آتیں تو انہیں مقامی خریداروں پر ترجیح دی جاتی یہاں تک کہ اگر شام ہو جائے تو انہیں ان کے گاؤں تک چھوڑ کر آیا جاتا۔ اس کے علاوہ پرانی روایت پر عمل کرتے ہوئے وہ خریداری کے سامان میں کوئی چھوٹی سی چیز مفت دیا کرتے۔ اسے جھونگا کہا جاتا تھا۔

غلام حسین محمد کا کہنا ہے کہ اگر ہندو مارکیٹ سے زیادہ قیمت بھی وصول کر رہے ہوتے تھے تو مسلمانوں کو اس کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ ان پڑھ اور لاعلم تھے گو وہ محنت بہت کرتے تھے۔ وہ کھیتوں میں تمباکو، گندم اور چاول اگاتے تھے مگر منافع غیر مسلموں کو ملتا تھا۔ (29)

اس کے علاوہ، جیسا کہ شیر محمد نے بتایا، مسلمانوں میں دولت جمع کرنے کا رجحان نہیں تھا وہ ہر وقت ہندوؤں کے مقروض رہتے تھے۔ وہ سال بھر اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ان سے قرضے لیتے رہتے۔ جب سال ختم ہوتا تو قرض کی رقم خاصی زیادہ ہو چکی ہوتی اور انہیں اپنی ساری کی ساری فصل قرض کی ادائیگی میں دینا پڑتی اور وہ پھر نئے سرے سے قرض لینا شروع ہو جاتے۔

حتیٰ کہ بڑے زمیندار مسلمان بھی اسی طرح قرض دار ہوتے۔ مسلمان اس صورتِ حال پر شاکی تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کس طرح وہ ہندو ساہوکاروں کے رحم وکرم پر ہیں لیکن اس منحوس چکر سے نکلنے کے لئے وہ کوئی عملی کوشش نہ کرتے۔ (30)

ایک اور حقیقت جو غلام حسین نے بتائی وہ یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کو اس بات پر قائل کیا کرتے کہ وہ اپنی پوری کی پوری فصل بیچ دیں تاکہ اسے چھڑنے اور ذخیرہ کرنے سے بچ جائیں اور پھر وہ اپنی روزمرہ کی ضرورت کے لئے غلہ خریدتے رہتے مگر ہندو اس سے دگنی قیمت پر غلہ بیچتے جس قیمت پر انہوں نے خریدی تھی۔ (31)

مسلمان ان سے شادیوں کے موقع پر اور کسی اور ضرورت کے لئے ادھار بھی لیا کرتے تھے۔ جلد ہی سود کی وجہ سے رقم کئی گنا بڑھ جاتی تھی جس سے مسلمان مالی لحاظ سے بے بس اور ہندوؤں کے دست نگر ہو جاتے۔ اس لئے تقسیم کے وقت جب ہندوؤں کا انخلاء ہوا تو تقریباً ہر مسلمان ان کا مقروض تھا اور بعض بڑے زمیندار تو لاکھوں روپے کے مقروض تھے۔ (32)

تقسیم: تشدد اور تحفظ

تقسیم کے اعلان پر ہندوؤں اور سکھوں کو اپنی زمینیں، مکان اور کاروبار چھوڑ کر ہندوستان جانا پڑا جس طرح مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے آنا پڑا۔ فاطمہ بی بی کا کہنا ہے کہ اگرچہ آبادی کے تبادلے کی باتیں ہو رہی تھیں مگر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سارا عمل اس قدر تیزی سے ہوگا۔ گوبند پورہ (چک 26) کے سکھ باشندے اپنے گھروں کو تالے لگائے بغیر نکل گئے اور ان کی عورتیں روتی رہیں۔ (33)

تقسیم کے بعد مذہبی فسادات نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہندوستان سے آنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی لوٹ مار اور ظلم کی کہانیوں پر مقامی مسلمانوں کو غصہ آیا۔ غیر مسلم اپنی جان و مال کو بچا کر تیزی سے ہندوستان جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا انخلاء آسانی کے ساتھ ہو گیا مگر چک 26 ان سے مختلف تھا۔ ملک چھوڑ کر جانے والوں کو پہلے فوج سرگودھا اور مکوال کے کیمپوں میں لے گئی اور وہاں سے وہ ہندوستان جانے کے لئے بسوں میں سوار ہوئے۔

اس بالکل بدلی ہوئی صورتِ حال میں گاؤں کے لوگوں میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ بدقسمتی

سے چک 26 مسلمان بلوائیوں کا نشانہ بن گیا۔ چک 26 کے سکھ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے اور اپنے گھروں کے باہر مورچے بنا لئے تا کہ کسی حادثے سے بچ سکیں۔

برکت علی کے بقول آس پاس کے دیہات کے مسلمان چودھری مانک بوسال کے ڈیرے پر جمع ہوئے اور چک 26 پر حملے کا فیصلہ کیا۔ راجا صابر خان کچھ آدمی اور بندوقیں لے آیا۔ قریبی گاؤں بارموسیٰ کے کچھ لوگوں نے، جن میں چودھری رحمت خان اور چودھری لال خان بھی شامل تھے، مقامی انسپکٹر سے بات کی جو مسلمان تھا اور اس نے بھی انہیں اسلحہ فراہم کیا اور حوصلہ افزائی بھی کی۔

مسلمانوں نے چک 26 کا محاصرہ کر لیا، اور دشمنی کے جذبات سے بھرپور نعرے لگائے۔ وہ سکھوں کے پیچھے بھاگے اور انہیں مار ڈالا۔ انہوں نے سکھوں کے گھروں اور گوردوارے کو بھی آگ لگا دی۔ جن لوگوں نے گوردوارے کو آگ لگائی ان میں وڑیایت کے بخش تیلی اور اسلام تیلی بھی شامل تھے۔ بخش تیلی جب گوردوارے کے اندر داخل ہوا تو ایک سکھ عورت نے جو گوردوارے کے اندر چھپی ہوئی تھی اس پر تلوار سے حملہ کر دیا مگر آخر کار وہ ماری گئی۔ اس حملے میں حالات پر قابو پائے جانے تک ایک ہزار سے پندرہ سو تک افراد مارے جا چکے تھے۔ (34)

غلام حسین چک 26 سے سکھوں کے انخلاء کے بارے میں بتاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے، جن میں طاہری سمور، اسماعیل لوہار اور باقر رانجھا بھی شامل تھے، ان ٹرکوں پر حملے کا منصوبہ بنایا جو سکھوں کو لے جا رہے تھے۔ انہیں ایک سکول کے پاس سے گزرنا تھا (جہاں اب میانہ گوندل کا ہسپتال ہے) اور حملہ آوروں نے پورے دن وہاں ناکہ لگائے رکھا مگر ٹرکوں نے راستہ تبدیل کر لیا۔ حملہ آوروں نے ٹرکوں کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا اور مسلمان افسر جو ان ٹرکوں کو بحفاظت لے جا رہا تھا اس نے لوگوں کو خبردار کیا کہ وہ کسی غلط حرکت سے باز رہیں۔ ان کی بات نہ ماننے پر فوج نے ان پر فائر کھول دیا جس سے اسماعیل لوہار ہلاک ہوا اور طاہری سمور کی ٹانگ زخمی ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گروہ پیچھے ہٹ گیا۔ طاہری سمور اس واقعے کے بعد چند سال مزید زندہ رہا۔ (35)

ہندوؤں اور سکھوں کے انخلاء کے بارے میں رسولاں بی بی کا کہنا ہے کہ جب وہ وڑیایت سے جا رہے تھے تو انہوں نے اپنے مسلمان پڑوسیوں کو تحفظ اور بچ کر نکلنے کے راستے کے لئے پیسے دیے۔ مسلمانوں نے پیسے لے لئے مگر اس سے پہلے کہ وہ نکل جاتے ان میں سے کچھ کو مار

ڈالا۔ (36)

تاہم عمومی تاثر کے برخلاف، چودھری شیر محمد اور عمر حیات گوندل کا کہنا ہے کہ گاؤں مذہبی فسادات میں تباہ نہیں ہوا تھا۔ اول الذکر کا کہنا ہے کہ جب غیر مسلم جا رہے تھے تو صرف فصلوں کو آگ لگائی گئی تھی۔ (37) جبکہ موخر الذکر نے بتایا کہ غیر مسلموں کو پہنچنے والا نقصان بہت معمولی تھا۔ خود ان کے بزرگوں کی ہندو اور سکھ بہت عزت کیا کرتے تھے۔ ان کا گاؤں وڑایت چک 26 اور چک 28 کے درمیان واقع ہے اور ان کے لوگوں کے غیر مسلموں سے اچھے تعلقات تھے۔ جب کچھ لوگوں نے انہیں نقصان پہنچانا چاہا تو ان کے بڑوں نے انہیں ایسا نہ کرنے دیا اور انہوں نے غیر مسلموں کو پھلروان ریلوے سٹیشن سے پُر امن طریقے سے چلے جانے میں مدد بھی کی۔ (38)

فاطمہ بی بی کا کہنا ہے کہ جونہی گاؤں سے سکھ گئے، گاؤں کے سب لوگ، جن میں عورتیں بھی تھیں، ان کے گھروں کی طرف دوڑے تا کہ خالی گھروں سے استعمال کی چیزیں اٹھا لیں۔ یہ کپاس کا موسم تھا۔ بہت سے لوگوں نے کھیتوں سے کپاس چننا شروع کر دی۔ کچھ دیر بعد چودھریوں اور کچھ دوسرے جانے پہچانے لوگوں نے آ کر ان گھروں کو تالا لگایا تا کہ جو چیزیں وہاں موجود ہیں وہ ہندوستان سے آنے والے مہاجروں کے لئے محفوظ رہیں۔ اس سے پہلے چودھری مولا داد اور حاجی خان نے سکھوں کو بحفاظت نکلنے میں مدد دی۔ (39)

''دیندار''

تقسیم کے فسادات کے دوران بعض غیر مسلموں نے اپنی حفاظت کی خاطر اسلام قبول کر لیا تا کہ انہیں اپنا ملک اور گھر بار چھوڑ کر نہ جانا پڑے۔ ان لوگوں کو مقامی لوگوں نے ''دیندار'' کا نام دیا۔ احمد بخش کے مطابق مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان لڑائی کے دوران گوبند پورہ میں دونوں فریقوں کا کچھ جانی نقصان ہوا۔ بعض غیر مسلم بھاگ گئے جبکہ بعض نے اسلام قبول کر لیا۔ مگر جیسے ہی فسادات ختم ہوئے وہ سب کے سب ہندوستان چلے گئے۔ (40)

رسولاں بی بی نے کہا کہ وڑایت کے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو مشورہ دیا کہ وہ وطن چھوڑ کر نہ جائیں بلکہ مسلمان ہو جائیں۔ انہوں نے بہت سے سکھوں کے لمبے بال کاٹ دیے اور پھر سب غیر مسلموں کو ایک دعوت پر بلایا جس میں گائے کا گوشت پیش کیا جو ان کے مذہب

میں ممنوع ہے۔ زیادہ تر مہمانوں کو گائے کا گوشت کھانے پر مجبور کیا گیا جبکہ کئی ایک وہاں سے بھاگ گئے۔ (41)

ایسے بھی بہت سے واقعات ہیں جن میں غیر مسلموں نے نہ تو اپنا گھر بار چھوڑا اور نہ ہی اپنا مذہب تبدیل کیا۔ میرے بچپن کے زمانے میں، غالباً پچاس کی دہائی کے شروع میں، جب میں ایک دیندار خاتون سے ملا تو وہ چھپ کر گرنتھ صاحب پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کتاب جلدی سے چادر کے نیچے چھپادی اور رونا شروع کر دیا کہ اسے اس کے سابقہ مذہب کی تعمیل کرتے دیکھ لیا گیا۔ اس نے مجھ سے قسم لی کہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ میں کبھی بھی کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ خاتون کی موت تک میں نے اس عہد کی پابندی کی۔

دیندار خاندانوں کے کچھ لوگ خصوصاً عورتیں پوشیدہ طور پر تقریباً دو دہائیوں تک اپنی مذہبی رسومات پر عمل کرتی رہیں۔ لیکن اب ان کے خاندان مسلمانوں میں پوری طرح گھل مل چکے ہیں۔

ہندوستان میں ایک ایسی ہی صورتِ حال کے بارے میں ظفر احمد بتاتے ہیں کہ مشرقی پنجاب کی تحصیل پھگواڑہ میں ان کے گاؤں کے ایک گجر خاندان نے تقسیم کے فسادات کے دوران ہندو مذہب اختیار کر لیا۔ انہوں نے ایسا صرف مذہبی فسادات میں خود کو بچانے کے لئے کیا تھا۔ بعد میں پاکستانی فوج کی مدد سے وہ خاندان پاکستان آ گیا۔ (42)

غیر مسلموں کا تحفظ

تاہم ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ میانہ گوندل کے مسلمانوں نے ہندو خاندانوں کو علاقے سے بحفاظت نکلنے میں مدد دی۔ سردار اچدھڑ ان مسلمانوں میں سے ایک تھا جنہوں نے ہندوؤں کو پھلروان کیمپ تک بحفاظت پہنچایا۔

چودھری نذیر کے مطابق آس پاس کے علاقوں کے مسلمانوں نے چک 28 پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ وڑایت کے مولا داد اور حاجی خان محمد ان کے راستے میں کھڑے ہو گئے اور انہیں ایسا کرنے سے روکا۔ وہ چک 28 پر حملے کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف مسلح مزاحمت کے لئے بھی تیار تھے۔ اس طرح انہوں نے غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت کی اور انہیں بحفاظت مہاجر کیمپ تک پہنچایا۔ (43)

چودھری شیر محمد کا کہنا ہے کہ جب ہندو اور سکھ جا رہے تھے تو آس پاس کے علاقے سے لوگ انہیں نقصان پہنچانے کی نیت سے آ پہنچے۔ شیر محمد کے خاندان نے اپنے دوستوں کو ان حملہ آوروں سے بچایا اور انہیں بحفاظت نکل جانے میں مدد دی۔ خاندان کے بزرگوں، چودھری محمد حیات گوندل، حاجی محمد خان، مولا داد اور دوست محمد نے اپنے سکھ اور ہندو پڑوسیوں کو بچانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ہندو خاندانوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے چک 26 بھی گئے۔ وہاں دو بڑے ہندو زمینداروں رام لبھایا اور رام ودھایا نے انہیں شیر محمد اور ان کے چچا سے کہا کہ وہ ان کی ذخیرہ شدہ گندم لے لیں مگر انہوں نے انکار کر دیا کہ انہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ غیر مسلموں کو تحفظ دیا گیا کیونکہ غصے سے بھرے ہوئے حملہ آور انہیں زندہ چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔

وطن چھوڑ کر جانے والوں کی املاک کے بارے میں غلام حسین نے بتایا کہ مسلمانوں نے، جو چیز بھی ان کے ہاتھ لگی اس پر قبضہ کر لیا۔ ان میں کچھ چیزیں رضا کارانہ طور پر مہاجروں کو دے دی گئیں، باقی چیزیں حکومت نے ضبط کر لیں اور بعد میں نیلام کر دیں۔ (44) جبکہ شیر محمد کا کہنا ہے کہ ان کے خاندان نے خالی ہونے والے تمام گھروں کو تالے لگائے اور وہاں لوٹ مار کرنے والوں سے جو کچھ بچ گیا تھا ان چیزوں کی حفاظت کو یقینی بنایا اور آخر کار ہر چیز ہندوستان سے آنے والے مہاجروں کے حوالے کر دی۔ (45)

گاؤں چھوڑ جانے کے بعد بھی ہندوؤں نے اپنے سابقہ دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ رابطہ رکھا۔ فاطمہ بی بی نے بتایا کہ تقسیم کے چند سال بعد کچھ غیر مسلم خاندان اپنی وہ چیزیں لینے کے لئے آئے جو وہ اپنے مسلمان دوستوں کی حفاظت میں رکھوا گئے تھے۔ (46) شیر محمد نے بتایا کہ چودھری انار خان کے پاس ان کے خط آتے رہے۔

ان میں سے بعض وڑیایت بھی آئے اور ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ آیا اور چودھری محمد حیات گوندل کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ چودھری شیر محمد کی بھی خان سنار اور کرم چند سے دوستی تھی مگر وہ کبھی واپس نہیں آئے۔ ایک اور دوست گلاب سنگھ اپنے مرنے تک انہیں خط لکھتا رہا۔ (47)

مہاجرین

میانہ گوندل میں آباد زیادہ تر مہاجرین لدھیانہ، جالندھر اور ریاست کپورتھلہ سے ہجرت کر

کے آئے۔ وہ مختلف راستوں پر چلتے ہوئے قافلوں کی صورت میں گاؤں پہنچے۔ وہ لوگ جو پیدل آ رہے تھے وہ قصور کے راستے آئے (48)، جبکہ ٹرین سے آنے والے لاہور کے راستے آئے۔

مرد پیدل آ رہے تھے جبکہ عورتیں اور بچے کچھ ضروری چیزوں، جن میں چارپائیاں، برتن اور کھانے پینے کی اشیاء شامل تھی، بیل گاڑیوں پر آئے۔ ان کی حالت افسوسناک تھی اور حوصلے پست تھے۔ تقسیم کے فسادات میں ان کی تمام املاک چھن گئی تھیں اور بہت سے رشتہ دار مارے گئے تھے۔ مثال کے طور پر نیاز محمد اس قدر بددل تھا کہ اس نے پاکستان کے راستے میں تین مرتبہ خودکشی کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے اسے بچالیا گیا۔ (49)

تقسیم سے پہلے کے ہندوستان میں حالاتِ زندگی سے متعلق انٹرویوز میں زیادہ تر لوگوں نے بتایا کہ وہ امن و آشتی سے دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ان میں سے بعض مشرقی پنجاب میں زراعت پیشہ تھے اور ان کے ہندوؤں اور سکھوں سے اچھے تعلقات تھے۔ (50) اگرچہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے، مگر ان میں سے بعض شادیوں اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر ایک دوسرے کے گھر جاتے اور اکثر تہواروں میں اکٹھے شریک ہوتے۔ مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی تھی اور تمام مذہبی گروہ ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے تھے۔ مہر علی کے مطابق کچھ ہندو اور سکھ اس کے والد کے بہترین دوست تھے۔ اس کے والد نے ان میں سے ایک کی بیٹی کو جہیز میں گھوڑا دیا تھا۔ (51)

دلچسپ بات یہ ہے کہ انٹرویو دینے والوں میں سے بعض کا خیال ہے کہ مشرقی پنجاب میں امن اس وقت تک تھا جب تک برطانوی حکومت موجود تھی۔ کیونکہ تمام مذہبی گروہ انگریزوں کے غلام تھے وہ ایک دوسرے کے خلاف زیادہ شرارت نہیں کر سکتے تھے۔ (52)

جہاں تک تجارت اور کاروبار کا تعلق ہے ہندو اور سکھ مسلمانوں سے کہیں آگے تھے۔ ہندوؤں کی مقامی منڈیوں میں اجارہ داری قائم تھی۔ غریب اور ان پڑھ ہونے کی وجہ سے، مسلمانوں کی اکثریت ان سے قرضے لیتی تھی۔ ہندو اس رقم پر سود وصول کرتے اور اس طرح قرضداروں کو اپنا محتاج بنا لیتے تھے۔

تقسیم کے اعلان پر تینوں مذہبی گروہوں کا رویہ ایک دوسرے کی جانب تبدیل ہو گیا اور دوست بھی دشمن بن گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے جتھوں نے مشرقی پنجاب میں دیہاتوں پر حملہ

کر دیا تا کہ مسلمانوں کو وہاں سے نکالا جا سکے۔ انہوں نے قتل عام کیا، گھروں کو آگ لگا دی اور مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر لیا۔

مغربی پنجاب میں ہونے والے مذہبی فسادات کا تعلق بہت حد تک مشرقی پنجاب کے واقعات سے تھا۔ محمد نیاز نے کہا کہ ہندوستان میں ان کے علاقے میں مذہبی فسادات اس وقت شروع ہوئے جب پاکستان سے ہندوؤں اور سکھوں کو لے جانے والی ایک ٹرین پر مسلمانوں نے لالہ موسیٰ کے نزدیک حملہ کیا اور بہت سے لوگ مارے گئے۔ جب وہ ٹرین ہندوستان میں پھگواڑہ پہنچی تو دہشت اور فساد کی ایک لہر نے پورے علاقے کو قبضے میں لے لیا۔ اس پر جوابی حملے ہوئے اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر قاتلانہ حملے کرنے شروع کر دیے۔ نیاز کے دوستوں اور رشتہ داروں نے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو ایک قریبی گاؤں میں منتقل کر دیا۔

مہاجرین کو بالکل اچانک اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ اس وجہ سے وہ اپنے ساز و سامان کی منتقلی کے لئے انتظامات نہ کر سکے اور صرف آسانی سے اٹھائے جانے والی چند چیزیں ساتھ لا سکے۔ ان کے قافلوں پر حملے کیے گئے اور کیمپوں تک پہنچنے سے پہلے ہی ان میں سے بہت سے لوگ مارے گئے اور عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔ (53)

بعض مہاجرین کئی ماہ تک مہاجر کیمپوں میں رہے۔ وہاں ہر وقت جان کا خطرہ رہتا تھا۔ لوگوں کو فاقے کرنا پڑے کیونکہ کھانے پینے کی اشیاء لانے کے لئے کیمپ سے باہر جانا غیر محفوظ تھا۔ مہر علی کا کہنا ہے کہ کیمپ میں وہ فوج کی حفاظت میں تو تھے مگر ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ ان کے دو بھتیجے جو بڑے بہادر نوجوان تھے کچھ کھانا لانے کے لئے کیمپ سے باہر نکلے اور انہیں سکھوں نے پکڑ لیا۔ ان میں سے ایک تو بچ کر بھاگ نکلا مگر دوسرے نے یہ کہہ کر بھاگنے سے انکار کر دیا کہ وہ کافروں سے خوفزدہ نہیں ہے۔ اسے مار ڈالا گیا۔ کیمپ میں مہر علی کی ماں اور خالہ بیماری سے مر گئیں۔ (54)

یہ ایک کانٹوں بھرا راستہ تھا۔ سکھ ان قافلوں پر بھی حملہ کر دیتے تھے جو فوج کی مدد کے تحت جا رہے تھے۔ (55) جان اور عزت دونوں داؤ پر لگی ہوئی تھیں کیونکہ مسلح گروہ نہ صرف لوگوں کو مار ڈالتے تھے بلکہ جوان لڑکیوں کو بھی اٹھا لے جاتے تھے۔ بلقیس بی بی نے بتایا کہ ہجرت کے وقت ان کی کزن کو سکھ اٹھا کر لے گئے مگر بعد میں وہ بچ کر نکل آئی۔ (56)

اس خوفناک نسل کشی کے دوران کچھ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو بچ کر نکل جانے میں مدد دی۔ نیاز کا کہنا ہے کہ گاؤں تھالی کے ایک سکھ مہر سنگھ نے ان کے خاندان کی اور دوسرے مسلمانوں کی بہت مدد کی اور انہیں کھانے پینے کی اشیاء بھی فراہم کیں۔ چک 29 (مشرقی پنجاب) میں مسلمانوں نے بڑی تعداد میں ہندوؤں اور سکھوں کو قتل کیا تھا۔ تاہم، نیاز کا خاندان کیمپوں میں جوابی حملوں سے محفوظ رہا۔ (57)

اس کے علاوہ بعض ہندو اور سکھ ایسے بھی تھے جنہوں نے مہاجروں سے کہا کہ وہ ان کی مدد کے بدلے میں اپنی جائیداد ان کے نام کر جائیں۔

تمیزہ بی بی نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ جالندھر میں ان کے گاؤں پر سکھوں نے حملہ کیا اور ان سب کو اپنے گھروں میں بند کر دیا اور پھر قتل کرنا شروع کیا۔ ان کے خاندان کے انیس افراد مارے گئے۔ پھر مقامی گوردوارے کے ایک چمار (ہندو ذات پات کے نظام میں ایک نیچ ذات، جو صفائی کا کام کرتا تھا یا مردہ جانوروں کی کھالیں اکٹھی کرتا تھا) نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ سکھوں کو یہ نہ بتائیں کہ وہ رانا خاندان سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ کہیں کہ وہ ان کے نوکروں میں سے ہیں۔ اس بات کا سکھوں پر اچھا اثر ہوا کیونکہ رانا خاندان سے سکھوں کی پرانی دشمنی تھی۔ گوردوارے کے کچھ سکھوں نے انہیں کیمپوں تک پہنچنے میں بھی مدد دی۔ (58)

یہ مہاجرین بڑی مشکلوں سے میانہ گوندل پہنچے اور شروع میں مقامی لوگوں کو ان کا اندازِ زندگی مختلف لگا تاوقتیکہ وہ مقامی سماجی ماحول میں پوری طرح سے گھل مل گئے۔ غلام حسین کا کہنا ہے وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے زمین پر بیٹھ کر اور ننگے پاؤں کھانا کھایا کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بعض مہاجرین جو ہندوؤں کے گاؤں سے آئے تھے زیادہ مذہبی اور صاف ستھرے نہیں تھے۔ (59)

مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے مہاجرین کا خیر مقدم کیا اور ان کا خیال رکھا۔ انہوں نے انہیں کھانے پینے کی اشیاء فراہم کیں۔ وہ لوگ جنہوں نے ان کی سب سے زیادہ مدد کی ان میں باقری راجھا، مولا داد، مرزا خان، حاجی محمد خان، حاجی مشتاق رکنانہ اور متلی ولد شاہو شامل تھے۔

ابتدا میں زیادہ تر مہاجرین نے ایک یا دو روپے روزانہ پر محنت مزدوری شروع کی۔ انہوں نے سرگودھا سے گجرات تک جی ٹی روڈ کی تعمیر میں بھی ایک روپیہ یومیہ پر مزدوری کی۔ وہ لوگ

جن کے پاس بیل گاڑی تھی انہوں نے مال کی نقل وحمل کا کام شروع کر دیا مثلاً وہ مونا ڈپو سے چارہ لاتے اور کپاس کی فصل پھلروان لے جاتے۔ باقی لوگوں نے مقامی کسانوں کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ عموماً مرد فصلوں کی حفاظت کرتے، جبکہ عورتیں کٹائی کے موسم میں کپاس چنتی تھیں۔ جب مہاجرین کی جائیداد کے کلیموں کا فیصلہ ہو گیا تو انہوں نے اپنی زمینوں پر کاشت کرنا شروع کر دی۔ (60)

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گاؤں میں پہلے سے آباد لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین نے ان پر اچھے اثرات ڈالے۔ برکت علی کا کہنا ہے کہ مہاجرین اپنے ساتھ جدید طریقے لائے۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو گنے سے بہتر گڑ بنانا سکھایا اور اس سے انہیں آگے چل کر شکر بنانا آ گیا۔ (61)

آبادکاری کے مسائل

ہندوستان کے ساتھ جائیدادوں کی دستاویزات کے تبادلے کے بعد مہاجرین کو زمینیں اور ہندوؤں اور سکھوں کے چھوڑے ہوئے گھر الاٹ کر دیے گئے اور جن لوگوں کو اس علاقے میں زمینیں نہ مل سکیں انہیں دوسرے علاقوں مثلاً لائلپور (جواب فیصل آباد ہے) میں زمینیں دی گئیں۔ جواب دہندگان بتاتے ہیں کہ مہاجرین سے متعلق قانون کے تحت، مشرقی پنجاب میں 10 ایکڑ زمین کے مالک کو میانہ گوندل میں تقریباً ساڑھے تین ایکڑ زمین الاٹ کی گئی (62) اور پچیس ایکڑ سے زیادہ کے مالک کو گیارہ ایکڑ زمین دی گئی۔

گاؤں کے لوگوں نے مہاجرین کو اپنا کاروبار شروع کرنے میں مدد دی۔ انہوں نے ان کو ہل اور غلے کے بیج مہیا کیے۔ مثال کے طور پر، چودھری صلہون نے اپنے مزارعوں کو مہاجرین کی زمینوں پر ہل چلانے کے لئے بھیج دیا اور انہیں تقریباً چالیس سے پچاس من اناج کے بیج بھی فراہم کیے۔ (63)

مہاجرین عموماً اردو اور پنجابی بولتے تھے۔ ان کا لہجہ مقامی گاؤں والوں سے مختلف تھا جس کی وجہ سے ان کے درمیان رابطہ مشکل تھا۔ حاجی احمد بخش کا کہنا تھا کہ گاؤں والے مہاجرین کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے کیونکہ وہ پنجابی کے مختلف لہجے میں بات کرتے تھے۔ (64)

اگر چہ زیادہ تر مہاجرین میانہ گوندل میں بس گئے اور تقسیم کے دوران ہونے والے نقصانات کا ازالہ کر لیا مگر کرامت بی بی کا کہنا ہے کہ ان میں خودداری ختم ہوگئی تھی۔ گاؤں کے لوگ آج بھی انہیں پناہ گیر کہتے ہیں جو کہ ایک توہین آمیز لفظ ہے۔ (65) یہ بات قابلِ غور ہے کہ شہری علاقوں خصوصاً سندھ میں مہاجرین کی صورتِ حال دیہی علاقوں کی نسبت بالکل مختلف تھی۔ ان علاقوں میں ہندوستان سے آنے والے لوگ آج بھی اصرار کرتے ہیں کہ انہیں مہاجر کہا جائے۔ دراصل سندھ میں آنے والے مہاجرین کی کچھ مختلف خصوصیات تھیں۔ اپنے ساتھ غیر سندھی زبان، رواج اور ثقافت لانے والے مہاجرین نے مہاجر قومیت نافذ کر دی جو جلد ہی افسر شاہی، تعلیم اور ثقافت میں بالادستی کا نشان بن گئی۔

حاجی احمد بخش نے آبادکاری کے مسائل کو مختصراً بیان کرتے ہوئے کہا کہ: وہ جب پہنچے تو بہت غریب تھے اور ہم نے ان کی بہت مدد کی۔ ابتدا میں انہوں نے چھوٹی ملازمتیں اور محنت مزدوری کی مگر بعد میں اپنے کاروبار قائم کر لئے۔ اب وہ اپنے کاروبار میں آگے بڑھ چکے ہیں اور مالی لحاظ سے زیادہ تر پہلے سے آباد لوگوں کے مقابلے میں خوشحال ہیں۔ وہ شاہانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ (66)

برکت علی آج کے میانہ گوندل کا برطانوی راج کے دنوں کے میانہ گوندل سے ایک دلچسپ انداز میں موازنہ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ برطانوی راج کا زمانہ آج سے کہیں زیادہ محفوظ تھا۔ عورتیں زیورات پہن کر آزادی سے گھوم پھر سکتی تھیں، مگر آج کل، آپ سورج غروب ہونے کے بعد باہر نہیں نکل سکتے کیونکہ چوری ڈاکے عام ہیں۔ (67)

(4) اختتامیہ

تقسیم کے وقت مذہبی فسادات کی ایک لہر پورے خطے میں پھیلی۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں کے آر پار تاریخ میں سب سے بڑے پیمانے پر لوگوں نے نقل مکانی کی۔ لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کی بحالی اور آبادکاری معاشی لحاظ سے کمزور نئے قائم شدہ ملکوں کے لئے خاصہ مشکل کام تھا۔

اس صورتِ حال میں چھوٹے دیہات مثلاً میانہ گوندل سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس

میں شک نہیں کہ اس گاؤں کو مرکزی حیثیت اس کے طویل تاریخ پر پھیلے ہوئے سماجی و معاشی حالات کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ یہ ایسا گاؤں تھا جہاں ہندو اور مسلمان امن و سکون سے مذہبی رواداری کے ساتھ رہتے تھے۔ مہاجروں کے یہاں آنے اور غیر مسلموں کے یہاں سے جانے سے گاؤں کے سماجی، سیاسی اور معاشی منظر نامے میں کچھ تبدیلیاں آئیں۔ یہ مطالعاتی جائزہ تقسیم کے دوران اس گاؤں کے انفرادی کردار کو نمایاں کرتے ہوئے انہی تبدیلیوں کو اجاگر کرتا ہے۔

اس کے علاوہ جواب دہندگان کے بیانات نے ہمیں یہ طے کرنے میں مدد دی کہ کس طرح دوسرے مذاہب کے لوگوں کی جانیں بچانے کے واقعات اور ایک دوسرے کے خلاف تشدد کے واقعات ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور کس طرح سماجی تعلقات اور طبقاتی تصادم اور مالی درجہ بندی مذہبی شناخت سے بالاتر رہی۔ ہندو مقامی کاروبار پر حاوی تھے اور سکھ زمیندار تھے جبکہ مسلمان زیادہ تر اپنے ان پڑھ ہونے کی وجہ سے ان سے کم تر حیثیت میں تھے۔ جو چند ایک مسلمان زمیندار تھے ان کے ہندوؤں اور سکھوں سے گہرے تعلقات تھے۔ اس عنصر نے بھی مسلمان اکثریت والے اس علاقے میں بین المذاہب ہم آہنگی میں اہم کردار ادا کیا۔ مگر تشدد کی جس لہر نے تقسیم کے وقت پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اس نے ہندوؤں اور سکھوں کو یہ علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ لوگوں نے اپنے تحفظ کی خاطر اور وطن چھوڑنے سے بچنے کے لئے اسلام قبول کر لیا۔ کچھ لوگ امن و امان بحال ہونے کے بعد ہندوستان چلے گئے جبکہ بہت سے نومسلم یہاں رہے اور اب ان کے خاندان مسلمانوں میں پوری طرح سے گھل مل گئے ہیں۔

اس علاقے میں بڑی تعداد میں مہاجرین یکدم آ گئے۔ گاؤں کے لوگوں نے ان مہاجرین کا خیر مقدم کیا اور انہیں میانہ گوندل میں رہنے میں مدد دی اور ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین نے علاقے پر مثبت اثر ڈالا۔ مثال کے طور پر وہ اپنے ساتھ جدید طریقے لائے۔

ان کے نئے سماجی ماحول میں گھل مل جانے کے بعد بھی بعض مہاجرین کا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی خودداری کھو دی ہے کیونکہ مقامی لوگ اب بھی انہیں پناہ گیر کہتے ہیں۔ مہاجروں کے تجربے کا یہ پہلو سندھ کے مہاجرین سے بالکل مختلف ہے جہاں مہاجر قومیت کو افسر شاہی، تعلیم اور ثقافتی بالادستی کا نشان مانا گیا۔

حوالہ جات

1- لوسی چیسٹر،

The 1947 Partition, Drawing the Indo-Pakistan Boundary, (http://www.unc.edu/depts/diplomat)

2- ایئن ٹالبوٹ Bengal, Punjab and Partition of the Sub-Continent in Region & Partition, Literature and the Human Drama of 1947 Partition، (آکسفورڈ 1990)، صفحہ 228

3- سلیم اللہ خان (تدوین)، The Journey To Pakistan، نیشنل ڈاکومینٹیشن سنٹر، اسلام آباد، 1993، صفحہ XV

4- محمد وسیم، Migration and Assimilation: A Comparative study of Pakistani Punjab in Region and Partition، (آکسفورڈ 1990)، صفحہ 204

5- ایضاً، صفحہ 217

6- ایضاً، صفحہ 208

7- سلیم اللہ خان (تدوین)، صفحہ XV

8- محمد وسیم، کتاب مذکور صفحہ 209

9- ایئن ٹالبوٹ، کتاب مذکور Literature and the Human Drama of 1947 Partition (آکسفورڈ 1990)

10- محمد وسیم، کتاب مذکور صفحہ 204

11- اوسی چیسٹر، صفحہ 204، (http://www.unc.edu/depts/diplomat)
12- ایضاً۔
13- بین ٹالبوٹ، کتاب مذکور صفحہ 244
14- محمد وسیم، ایضاً صفحہ 216
15- Pakistan: Economic Policy Analysis, The McKeever Institute of Economic Policy, 3060 Curran Avenue, Oakland, CA 94602, USA.
16- District Census Report of Mandi Bahauddin، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد 2000
17- چودھری شیر محمد
18- چودھری انار خان
19- غلام حسین
20- بشیر احمد
21- غلام حسین
22- شیر محمد
23- فاطمہ بی بی
24- چودھری محمد نذیر
25- احمد بخش
26- غلام حسین
27- احمد بخش
28- شیر محمد
29- غلام حسین
30- شیر محمد
31- غلام حسین

32- شیر محمد
33- فاطمہ بی بی
34- برکت علی ولد علم دین
35- غلام حسین
36- رسولاں بی بی
37- شیر محمد
38- عمر حیات گوندل
39- فاطمہ بی بی
40- احمد بخش
41- رسولاں بی بی
42- ظفر احمد
43- محمد نذیر
44- غلام حسین
45- شیر محمد
46- فاطمہ بی بی
47- شیر محمد
48- کرامت بی بی
49- نیاز محمد
50- ظفر احمد
51- مہر علی
52- دلاور خان
53- نیاز محمد
54- مہر علی
55- بشیر احمد

56- بلقیس بی بی
57- نیاز محمد
58- تنظیمہ بی بی
59- غلام حسین
60- غلام حسین
61- برکت علی
62- نذیراں بی بی
63- برکت علی
64- احمد بخش
65- کرامت بی بی
66- احمد بخش
67- برکت علی

(اس مقالے کی تیاری کے دوران، ان دیہات میں انٹرویوز کی ریکارڈنگ اور ان کی ٹرانسکرپشن میں امت الحفیظ اور شمع شہزادی نے میری بھرپور معاونت کی ہے۔ اس ضمن میں میرے ساتھیوں عقیل احمد اور ضیاً الرحمان نے بھی میری مدد کی جس کے لئے میں ان تمام کا بے حد شکر گزار ہوں)

❁❁❁❁❁

حریفانہ تاریخ

کرشن کمار/ترجمہ: ظہور چوہدری

جدوجہدِ آزادی بطور داستان

14-اگست 1947ء کو جب گھڑی نے رات کے بارہ بجائے تو پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا ''جبکہ دنیا سو رہی ہے، ہندوستان زندگی اور آزادی کے لئے جاگ رہا ہے'' نہرو بظاہر اقوام عالم سے مخاطب تھا یعنی آزاد قومی ریاستوں کے ایک معاشرے سے جس میں خود بھارت شریک ہونے کو تھا۔ نوآبادیاتی حکمرانوں سے آزادی لینے کی جدوجہد تمام ہو چکی تھی اس جدوجہد نے ایک بہت بڑے پیچیدہ معاشرے کو قومی دھارے میں تبدیل کر دیا تھا جو کہ ذات پات کی وراثت اور لاتعداد زبانوں اور عقائد کا حامل معاشرہ تھا۔ مذہبی تقسیم، زبانوں اور ذات پات کی تقسیم سے زیادہ مشکل ثابت ہوئی۔ نوآبادیاتی ماحول میں انہوں نے ایک ایسی زمین پیدا کی تھی جس نے ایک حریف قومی دھڑے (پاکستان) کو عروج دیا۔ پاکستان کے لئے آزادی کے معنی مختلف تھے کیونکہ اس کا وجود ہندوستانی جدوجہد آزادی کا نتیجہ تھا محض ''بیداری'' نہ تھی جیسا کہ پنڈت نہرو نے کہا تھا لیکن ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے انگریزوں سے جنگ کی ''یاد'' بہت زیادہ قیمتی تھی۔ اسے محفوظ کرنے اور پھر اسے اگلی نسلوں تک منتقل کرنے سے وہ اپنے آپ کو قومی ریاست کا درجہ دینے کی امید کر سکتے تھے۔ بعض پرانی قومی ریاستوں نے بھی اٹھارہویں صدی

تک ایسا ہی کیا تھا۔ نسل در نسل انہوں نے بچوں کو بقول اینڈرسن (1) ''تصور کی گہرائی'' میں مصروف رکھا۔ جس سے قومی معاشرے میں پختہ عقیدہ رکھنے کی تعلیم ملتی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کو بھی ایسی ہی چیز کی ضرورت تھی کہ وہ اپنی تحریکِ آزادی کے ریکارڈ کو اگلی نسلوں کے لئے ایک داستان بنا کر پیش کریں۔

بالغوں کی یہ عام خواہش کہ بچوں کو یہ بتایا جائے کہ ان کی پیدائش سے قبل کیا کچھ پیش آیا تھا، دراصل ماضی کے تجربات کو کہانی کی شکل میں بیان کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ بغیر کسی باقاعدہ منصوبہ بندی کے، یادیں خود بخود ایک داستان یا کہانی کا تانا بانا اور اسلوب اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسے آغاز اور انجام جیسے نقوش جنہیں ہم برجستگی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور داستان کو ایسے پُر یقین لہجے میں سنانا کہ یہ کہانی مصدقہ قرار پائے۔ ہر طرف یہ رویہ ہمیں اس تصور کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو کہ سکول کی درسی کتب کے مورخین کے کام کے بارے میں ہے۔ اس ساری کتاب میں میں نے ان مورخین کو ''سکولوں کے مورخین'' کہا ہے اگرچہ مجھے اس بات کا علم ہے کہ ان میں سے کچھ پیشہ ور تاریخ دان ہیں جنہوں نے سکولوں کی درسی کتابیں ایک خاص ذمے داری کے تحت تحریر کی ہیں۔ جب وہ تاریخ کی علمی کتابیں لکھتے ہیں تو وہ ماضی کو یوں بیان کرتے ہیں جیسے کوئی وکیل ایک مقدمے کے دوران یا پھر کوئی ماہر تعمیر عمارت بناتے وقت کرتا ہے۔ اُس وقت وہ (مورخ) اپنے پیشے کے تمام تر ہنر کے ساتھ ماضی کی تعمیرِ نو اور نمائندگی کرتا ہے۔ البتہ جب وہ سکول مورخین کے طور پر کام کرتے ہیں تو ان کے پاس ایک خاص نوعیت کا کام ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کوئی سرکاری وکیل یا کسی قومی یادگار کا نقشہ بناتے ہوئے کوئی ماہر تعمیر کرتا ہے۔ سکولوں کی تعلیم کا جدید منصوبہ ناگزیر طور پر ایک ریاستی منصوبہ ہے اور کسی بھی علم کے بارے میں ریاست اتنی حساس نہیں جتنی کہ وہ تاریخ کے مضمون کے ڈھانچے، انداز اور نمائندگی کے بارے میں ہے۔ تاریخ اس ڈھانچے کی سمت ریاست کی بے چینی کو مرتکز کرتی ہے جیسا کہ رینی کہتا ہے ''یہ ایک مشترکہ ماضی کا تصور ہوتا ہے جسے مختلف گروپوں کو جوڑنے اور یک جہتی کے قیام کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔'' (2)

ہندوستان اور پاکستان کی سکولوں کی درسی کتابوں میں ہمیں نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہونے کی دو طرز کی کہانیاں ملتی ہیں۔ ظاہری شکل میں یہ دونوں ایک مشترکہ ماضی کے دو پہلو نظر

آتے ہیں اور ہر پہلو میں کئی اختلاف ملتے ہیں لیکن ہر طرز میں کوئی ایسا اختلاف ایسی شدت ظاہر نہیں کرتا جس سے ان کا فرق واضح ہو جائے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ''قومی جہت'' کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دونوں، نئی نسل کو قومی شناخت میں سما جیانے کے لئے ایک خاص تعلق کا سہارا لیتی ہیں۔ ایسا تعلق جو کہ تاریخ کی دو جہتوں کو استعمال کرتا ہے اور چونکہ یہ تعلق مخاصمت پر مبنی اور باہمی یگانگت کی نفی کرتا ہے لہٰذا دونوں تاریخی یادوں کو قومی تصور کا ایک ذریعہ بتانے کی حریفانہ کوششیں کرتے ہیں۔

آئندہ ابواب میں آزادی کی کہانی کے دو اصلی مواد، بطور ''عظیم داستان'' کے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ اصطلاح ایک اشتراک ہے جو ہر ملک کی تاریخ کی مختلف درسی کتب میں قومی مقصد کو ظاہر کرتا ہے اور بلاشبہ یہ اس قومی تصور سے تعلق رکھتا ہے جسے مختلف مصنفین نے مخصوص واقعات کو بیان کرنے میں استعمال کیا ہے چونکہ ہر ایک ملک کے سکول مورخین نے ماضی پر ایک ''قومی'' رویے کا مظاہرہ کیا ہے، ہمیں ہابس بام کی یہ بات یاد آتی ہے کہ ''تاریخ آباء واجداد کی یاد یا اجتماعی روایت کا نام نہیں بلکہ یہ وہ ہے جسے لوگ پادریوں، سکول ماسٹروں، تاریخی کتب کے مصنفوں اور رسالوں اور ٹیلیویژن کے مرتبین سے سیکھتے ہیں۔''(3)

تین خصوصیات

اس مطالعے میں ''دو عظیم داستانوں'' کے تقابل کے لئے تین نمایاں نقوش کو استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ''بیاہ کی سیاست'' ہے دوسرے رفتار اور تیسری انجام کا تصور یا ادراک۔ پہلی دو کو بالعموم تاریخی داستانوں کے مطالعے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ تیسری کو اس مطالعے کے لئے ایک توجہ حاصل ہے۔ ''بیان کی سیاست'' سے میری مراد وہ فیصلہ ہے جو ایک واقعے کو داخل، خارج یا کسی دوسرے واقعے کا حصہ بنا دے۔(4)

کسی نام کو بیان کرنے یا نظر انداز کر دینے کا فیصلہ ایک ہی بات ہے کیونکہ ایسے فیصلے یادداشت کی سیاست کا عکس ہوتے ہیں اور تاریخ کے موضوع کا جزو لاینفک بھی، خاص طور سے جب یہ موضوع سکول جانے والے بچے کے لئے ماضی کی داستان کا کام کرتا ہو۔ اس مطالعے کے دوران بیان کردہ لاتعداد مثالیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ایک واقعے یا شخص کے ذکر کرنے یا نہ کرنے

کے فیصلوں کا براہ راست تعلق ایک قومی پس منظر میں شناخت کی تعمیر کا عمل ہوتا ہے۔ وہ طریقہ کار، بچوں کے لئے تاریخ نویسی کرنے کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ اور بڑا ہے لیکن بچوں پر اس کے اثر کا انکار ممکن نہیں۔ کسی بھی دیئے گئے اشارے پر ''سکول مورخین'' قومی تعمیر کے بڑے طریقہ کار سے متاثر ہو جاتے ہیں جیسا کہ وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کون سی بات قابلِ بیان ہے؟ کوئی وضاحت پیش کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کی بھی یہی وجوہات ہیں۔ جن چیزوں کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ناگزیر طور پر ایسی ہوتی ہیں جن کو قومی انتظام اور یک جہتی کے عمل میں ہمعصر اہمیت حاصل ہو۔

''رفتار'' داستان گوئی کا ایک ایسا پہلو ہے جس کا پیشتر بیان کی گئی سیاست کے ساتھ بہت تعلق ہے۔ لیکن اس کا واسطہ تعلیمی نظام کی نوعیت پر بھی ہوتا ہے، بالخصوص یہ کہ اس کا علم کے ساتھ کیا رویّہ ہے یعنی یہ حقائق کی تجسیم ہے یا سمجھنے کے مواقع سے متعلق ہے؟

ہندوستان اور پاکستان دونوں میں تعلیم کے امتحانی مراکز کا نظام جاری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کو سمجھانے کے عمل میں آپس کے تعلقات کی بجائے فرداً فرداً حقائق کو جاننے کی ترتیب دی جاتی ہے۔ (5) تاریخ کے مضمون میں ایک واقعہ سے دوسرے واقعے تک سرعت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور واقعے کی سمت بعض نکات کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔ سکول مورخ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک واقعے سے دوسرے تک تیزی سے سفر کرے گا اور وہ چیز بتائے گا جسے ہم یادداشت کے سلسلے کی ایک کڑی قرار دے سکتے ہیں۔ درسی کتابوں کا ایک لگا بندھا سائز، قیمت کم رکھنے کے نقطہ نظر سے بھی اس بات کی گنجائش نہیں رکھتا کہ فضول وضاحتیں کی جائیں۔

تیسری خصوصیت اُس نکتے کے انجام کا تصور ہے جہاں ایک تاریخی داستان ختم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی جدوجہد آزادی میں یہ نکتہ 1947ء پر آ کر رک جاتا ہے۔ دونوں ملکوں کی داستانوں میں اس اختتامی نکتے کا تصور مختلف ہے اور اس کا تعلق قومی یادداشت کی قسم اور اس منطق سے ہے جو یہ داستانیں تعمیر کرتی ہیں۔ ہندوستان کے لئے یہ ''اختتام'' ایک عظیم کامیابی کے حصول کی نشاندہی کرتا ہے جس میں نقصان اور اداسی کی خوفناک آمیزش ہے۔ پاکستان کے لئے یہ ''اختتام'' شاندار کامیابی ہے جس میں کسی حد تک ناانصافی ہونے کا قلق موجود ہے۔ اس کے علاوہ کئی دیگر پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ پاکستانی داستانوں میں ''خود حفاظتی'' اور فرار جبکہ

ہندوستانی صورت میں تقسیم کی ''سازش'' کو ناکام بنانے میں ناکامی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ دونوں ملکوں میں ''سکول مورخین'' مذکورہ اختتامی نکتے کے مخصوص کردار کے بارے میں شدت سے حساس ہیں جس کا تعلق دو قومیتوں سے ہے۔ وہ باقاعدگی سے ''اختتام'' کے اپنے اس علم کو تاریخ میں پائے جانے والے ''اداکاروں'' پر کچھ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ خواہشات اور خدشات نمایاں ہوسکیں۔

دونوں ملکوں میں یاد کے طور پر یہ ''اختتام'' ایک اور پہلو بھی رکھتا ہے جس سے اس کی اہمیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں زیادہ تر ریاستوں میں جدوجہد آزادی کے اختتام کا مطلب تاریخ کی کتاب اور اس کے نصاب کا اختتام ہے۔ آزادی کے پچاس سال گذرنے کے بعد بھی بھارتی تعلیمی نظام، آزادی کے بعد کی ہندوستانی تاریخ کو سکولوں کے نصاب میں شامل نہیں کر سکا۔(6) کئی ریاستوں مثلاً اتر پردیش میں 1947ء سے اب تک کے واقعات کا سرسری سا جائزہ شامل ہے لیکن اس طرز کا تذکرہ ایک ''فہرست'' تو ہوسکتا ہے تاریخ نہیں۔ سکولوں کے بچوں کی اکثریت کے لئے ہندوستان کی تاریخ زمانہ قدیم سے شروع ہوتی ہے اور 1947ء میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح جدوجہد آزادی کے اختتام کا مطلب تاریخ کے مضمون کا خاتمہ بھی ہے۔ چنانچہ تقسیم ہند پاکستان کے بارے میں طلبہ کو یہی ''تازہ خبر'' سناتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ خبر ناموں اور فلموں کے ذریعے علم حاصل کرتے ہیں لیکن اس علم پر ''سند'' کی وہ مہر ثبت نہیں ہوتی جو سکول لگاتے ہیں۔ نیز کوئی اور منظم ادارہ بھی ایسا ''مستند'' علم مہیا نہیں کرتا۔

اس ضمن میں پاکستانی صورت واضح طور پر مختلف ہے۔ یہاں ''اختتام'' قومی مملکت پاکستان کے قیام کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور اس میں کوئی حیرانگی کی بات نہیں کہ پاکستان میں، ہندوستان کے برعکس آزادی کے بعد کی تاریخ کو تعلیم کے شعبے میں مختلف سطحوں پر شامل کیا گیا ہے۔ پاکستان میں ماضی کے متعلق علم کے ڈھانچے میں تقسیم ہند کو، جدوجہد آزادی میں ''اختتام'' کے طور پر یوں شامل کیا گیا ہے کہ یہ ایک طویل تاریخ بن گئی ہے جو دراصل 1947ء سے شروع ہوتی ہے۔ بہت سی درسی کتابیں آزادی کے فوراً بعد پیش آنے والے مسائل مثلاً اثاثوں کی تقسیم وغیرہ کے بارے میں بحث کرتی ہیں۔ اعلیٰ ثانوی درجوں کی درسی کتب میں قراردادِ مقاصد، آئین سازی کے لئے کوششوں، پنج سالہ ترقیاتی منصوبوں اور نفاذِ اسلام کی کوششوں کے متعلق خاصا مواد

موجود ہے۔ یہ تمام موضوعات بالخصوص نفاذِ اسلام کے عمل کا طریقہ کار، تحریکِ پاکستان کی تاریخ کا تسلسل ہیں جو کہ آزادی کی داستان کا مرکزی نقطہ ہے۔ البتہ اعلیٰ درجے کے انگریزی میڈیم سکولوں میں رائج چند درسی کتابیں بھی 1971ء میں پاکستان کے دولخت ہو جانے کے دردانگیز موضوعات، پیش کرتی ہیں۔

دھندلی سمتوں کا سفر

جدوجہد آزادی کے ''اختتام'' کی مذکورہ بالا نشاندہی کے طور پر ہماری خواہش ہے کہ کاش دونوں ملکوں کی درسی کتب میں موجود تاریخ، ایک دوسرے کے لئے آئینے کا کام کر سکتی ہے ایسی خواہش 1947ء سے لے کر آج تک کی مستقل دشمنی کے ضمن میں قدر کی نظروں سے دیکھی جائے گی۔ دونوں ملکوں کے ذرائع ابلاغ نے آپس میں ہونے والی جنگوں کے علاوہ، زمانہ امن میں ہونے والی خانگی ترقی اور واقعات کو بھی تضاد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ دونوں کے کوئی مشترک ہیرو نہیں ہیں تو پھر دونوں کی درسی کتابیں کیوں نہ انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی متضاد نمائندگی کریں گے۔ دونوں ملکوں میں تاریخ کی عظیم داستانیں متضاد ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی واقعے کو جس کی ایک کے نزدیک زیادہ اہمیت ہے دوسرا اسے گھٹا کر پیش کرتا ہے بلکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تاریخی حقائق کا ایک انتخاب ہے جس کے بعد قابلِ وضاحت حدودِ فاصل موجود ہیں۔ جیسے ہی ہم ''اختتام'' یعنی جدوجہد آزادی اور تقسیم کی جانب بڑھتے ہیں تو یہ انتخاب شدید ہوتے چلے جاتے ہیں اور دونوں کی داستانوں میں تضاد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ابتدائی واقعات میں کسی واقعے کا بیان، بحث یا اس پر خاموشی اختیار کرنا شاذ و نادر ہی ملتا ہے اور سیاسی یادوں سے ممیز مبہم واقعات، آخر میں جا کر واضح ہوتے جاتے ہیں۔

واقعات کے بیان کی پیچیدگی، نامور شخصیات کے ذکر میں بھی اسی طرح پائی جاتی ہے۔ یہ درست نہیں کہ ایک کی داستان کے ''ہیرو'' دوسرے میں ''ویلن'' ہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں ملکوں کی درسی کتابوں کے مصنفین، شخصیات کے ایک مشترکہ سیٹ کو مختلف سطحوں کی اہمیت دیتے ہیں۔ کئی صورتوں میں کسی فرد کی سوانح عمری کے مختلف حصے زیادہ نمایاں کر دیئے جاتے ہیں اس ضمن میں سرسید احمد خاں اور علامہ اقبال کی مثالیں قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستانی درسی کتب اپنی توجہ کو

اپنی زندگیوں کے ابتدائی دور تک جبکہ پاکستانی درسی کتابیں بعد کے حصے پر مرکوز رکھنے کو ترجیح دیتی ہیں۔

پاکستان میں مہاتما گاندھی اور ہندوستان میں محمد علی جناح کو پیش کرتے وقت ہم دیکھتے ہیں کہ شدید گڑبڑ کی گئی ہے لیکن جن تفاصیل میں انہیں نظر انداز کیا گیا ہے وہاں ان کی خراب نمائندگی (جو اسم ہائے صفت کی مدد سے کی گئی ہے) کے باوجود وہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ دونوں قومی ریاستوں کے اپنے اپنے سرکاری رویّوں میں مخاصمت اور فرق کے باوجود، ان کی سکول کی درسی کتب میں بعض جگہوں پر مشترکہ یادیں بھی پائی جاتی ہیں اور ان میں ان افراد کی یادیں بھی شامل ہیں جنہوں نے تحریکِ آزادی کے دوران شہرت حاصل کی۔ اگر کبھی جنوبی ایشیا کی جدوجہد آزادی کی تاریخ، ہندوستان، پاکستان اور علاقے کے دیگر ملکوں کے بچوں کے مشترکہ مطالعے کے لئے لکھی جائے تو ایسی مذکورہ یادوں کی بڑی قدر و قیمت ہوگی۔

ایک وجہ کہ دونوں عظیم داستانیں اس قدر مخالف سمت میں نہیں ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے لئے آئینے کی شبیہیں ثابت ہوں، وہ یہ ہے کہ دونوں میں کئی طرح کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ہم پہلے ہی تیسرے باب میں یہ بحث کر چکے ہیں کہ بھارت اور پاکستان کے مشترکہ نوآبادیاتی تعلیمی ورثے میں یکسانیت کے ذرائع کیا ہیں جیسا کہ تجویز کردہ درسی کتب، کمرۂ جماعت کی پڑھائی میں مجموعی کردار ادا کرتی ہیں۔ مثلاً دونوں صورتوں میں ان کا زور سماجی حرکیات کی بجائے ''اونچی سیاست'' پر ہے۔

کچھ ہندوستانی درسی کتابوں کا دعوے ہے کہ وہ تاریخ پر ایک جامع نظر ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں اور اس میں سماجی اور معاشی پہلو بھی شامل ہوتے ہیں۔ دوسروں سے زیادہ NCERT کی شائع شدہ درسی کتابیں اس بات پر زور دیتی ہیں کہ ان کا ارتکاز، طاقتوں، تحریکوں اور اداروں پر ہے نہ کہ فوجی، سیاسی، انفرادی منتظمین اور راہنماؤں کے واقعات کی تفصیل پر۔(7)

اس دعوے کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ 20 ویں صدی کے مقابلے میں 18 ویں اور 19 ویں صدی کے واقعات کی تفاصیل کہیں زیادہ بیان کی گئی ہیں۔ NCERT کی یہ کتابیں دیگر ہندوستانی درسی کتابوں کے مقابلے میں 20 ویں صدی کے دوران تحریکِ آزادی کے حصے میں سماجی جھلک دکھانے سے قاصر ہیں۔ سارا زور سیاسی واقعات اور ان فیصلوں پر ہے جو بڑے

راہنماؤں اور برطانوی حکمرانوں نے کئے۔ بہت سی صورتوں میں واقعات، راہنماؤں کے فیصلوں کے نتائج کی نمائندگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ ''رغبت'' خاص طور پر مسلم معاشرے اور اس کی سیاست کی نمائندگی کے بارے میں خاصی مضبوط ہے۔ مسلم علیحدگی پسندی کی وضاحت چند سیاسی راہنماؤں کی تحاریک اور رویّوں تک محدود ہے۔ لاکھوں مردوں اور عورتوں کا نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کے لئے ایک معاشرے کا قائم کرنے کا خیال، درسی کتابوں کے چھوٹے قاری کو تو پسند آ سکتا ہے لیکن درسی کتابیں بذاتِ خود اس خیال کو حوالے کے ایک مستقل فریم کے طور پر استعمال نہیں کرتیں۔ یہ عام افراد جہاں بھی نمودار ہوتے ہیں تو وہ ایسی اشیاء کا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں جو طاقتور سیاستدانوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں اور انہیں ان کی ہدایت پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے۔ پھر یہ کہنا کہ یہ لاکھوں لوگ بیک وقت سماجی و معاشی تبدیلیوں سے گذر رہے تھے جن کی اپنی اپنی نفسیاتی اور سماجی خصوصیات تھیں۔ اس توجہ کے دائرے سے کہیں دور ہے جو سکولوں کی درسی کتب کے مصنفین نے بنایا ہوتا ہے۔ مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی ایک داستان، لوگوں کے تجربات کی رنگارنگی، ادراک اور تحریکوں کو آسانی سے بیان نہیں کر سکتی۔

''جدوجہد آزادی'' کو جیسا کہ راہنماؤں نے اصطلاحاً استعمال کیا ہے محض سیاست تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے نمایاں سماجی اصلاحی تبدیلیاں بھی پیدا کیں جس کی مثال مہاتما گاندھی کی چھوت چھات کے خلاف تحریک ہے۔ درسی کتب ان سماجی لہروں کو ان راہنماؤں کے حوالے سے بیان کرتی ہیں جنہوں نے انہیں شروع کیا یا ان کی وکالت کی۔ لیکن واضح رہے کہ یہ سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کے پہلو سے نہیں تھیں۔ 19 ویں صدی کے پس منظر میں ہونے والی ان تبدیلیوں کے بڑے طریقہ کار کا ذکر بھی عمومی اہمیت کا حامل ہے جو ٹیکنالوجی اور صنعت نے، مواصلات، روزگار اور تعلیم کے میدانوں میں برپا کیں۔ چند ایک درسی مصنفین نے کسی حد تک ان طریقہء ہائے کار کو زیرِ بحث لانے کی کوشش کی ہے مگر وہ ان کے اور سماجی و سیاسی تبدیلیوں کے درمیان رابطہ قائم نہیں رکھ سکے۔

اس بڑے طریقہ کار تک پہنچنے کے لئے ہدایت کے تصور کو ابھارنا ضروری ہے حالانکہ یہ مبہم ہے اور اس کی وضاحتوں کے کئی طریقے ہیں۔ فرد کا معاشرے کی اکائی ہونے کا نظریہ اور مختلف معاشروں کا حقیقی ذاتی تصورات سے متاثر ہونا، صنعت اور جدیدیت کے طریقہ ہائے کار سے

اشتراک کا حامل ہے۔

ٹیکنالوجی نے مواصلات اور اطلاعات کے ذخیرے اور معاشیات میں (جس کا تعلق سرمایہ دارانہ ترقی سے ہو) جو تبدیلیاں پیدا کی ہیں وہ انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے تاریخی طور پر ذاتی شناخت کی ذمے دار ہوتی ہیں۔ جیسا کہ فریڈنگ نے کہا ہے کہ ذاتی شناخت تمام جدید معاشروں میں ابتدائی قومی سیاست کا مرکز ہوتی ہے۔(8) اس قسم کی سیاست 19 ویں صدی کے خاتمے تک نوآبادیاتی ہندوستان میں جڑیں پکڑ رہی تھی اور اس میں ذاتی شناخت کی تشکیل اور اظہار کے لئے ایک جدید کردار موجود تھا۔ اس دور میں حد سے زیادہ محدود حلقہ ہائے رائے دہی کی بنا پر، مذہبی گروپوں اور ذات برادریوں میں شدید طرز کا مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس میں جمہوریت کے رسمی نقوش موجود تھے تاہم جہاں اس نے نئے خواب اور جذبات تخلیق کئے وہاں مجموعی اضطراب اور خوف کے جذبوں کو بھی ابھارا۔ بدقسمتی سے کوئی ہندوستانی یا پاکستانی درسی کتاب، برطانوی راج کے دوران سیاسی زندگی کی نوعیت اور منطق پر روشنی نہیں ڈالتی اور نہ ہی یہ وضاحت کرتی ہے کہ یہ آج کے دور کی سیاست سے کیونکر مختلف تھی۔

پاکستانی داستانوں میں شروع سے مذہبی مصلحین اور سیاسی راہنماؤں کی بہت بڑی موجودگی رہی ہے۔ حتیٰ کہ پرائمری سکول کے بچوں کو ناموں کی تمام فہرستیں ازبر کرنا پڑتی ہیں۔ ان فہرستوں میں شامل بعض نام عہدِ وسطیٰ کے دور کے ہیں۔ درسی کتب میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی برصغیر میں رہنے والے مسلمانوں نے ہندوؤں کی غالب اکثریت کے باوجود اپنا علیحدہ ثقافتی تشخص برقرار رکھا۔ لیکن ان کتابوں میں اس ثقافتی زندگی کی کوئی جھلک نہیں ملتی جسے بچے مذکورہ تشخص سے جوڑ سکیں یا پھر اس کے بارے میں مزید جستجو کر سکیں۔ پرنٹ ٹیکنالوجی اور ذرائع مواصلات نے ثقافت اور زبان کو کس طرح متاثر کیا ہے یہ ان لاتعداد علمی مقاصد میں سے ایک ہے جسے پاکستانی اسکول مورخین نے مکمل طور پر نظر انداز کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہندوستانی کتابیں ان مسائل کو مقابلتہً بہتر طریقے سے پیش کرتی ہیں۔

شہری زندگی کا واحد پہلو تعلیم ہے جسے پاکستانی درسی کتب کے مورخین، داستانِ آزادی میں سمونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہاں بھی صرف ایک فردِ واحد ایسا ہے جس کی کوششوں پر زور دیا جاتا ہے اور وہ ہیں سید احمد خان۔ البتہ ان کی شخصیت کو کچھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ

بچوں کو ان کے بارے میں بمشکل کسی ایسی تفصیل کا علم ہوتا ہے جسے وہ انہیں کسی تاریخی پس منظر میں دیکھ سکیں۔ بچے کے تصور کو نظر انداز کرنے کے معاملے یا اس کے لئے کچھ ایسے نشان چھوڑنے سے کہ جن کی مدد سے وہ سکول کی درسی کتب کے علم میں اضافہ کر سکے، پاکستانی لکھاری اپنے ہندوستانی بھائیوں کی طرح ہی ہیں۔ ان کی مشترکہ سرگرمیوں کا مقصد ایک مندر تعمیر کرنا ہے جس کے اندر سونے کے حروف کھدے ہوئے ہوں، جس سے تعظیم پیدا ہوتی ہو اور جس کا مقصد بچوں میں یہ تحریک پیدا کرنا ہو کہ وہ معروف افراد کی زندگیوں کا معائنہ، تحمل اور تجسّس سے کر سکیں۔

دونوں ملکوں کی عظیم داستانوں میں دوسری یکسانیت یہ ہے کہ دونوں تحریکِ آزادی کو ایک تمثیل کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کا مقصد بچوں کو یہ یاد دلانا ہے کہ وہ اقدار کے عظیم گودام کے وارث ہیں۔ عظیم شخصیات کو لازماً اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ نیکوں اور اقدار کا مجموعہ بن جائیں اور چھوٹے قاری متوقع طور پر ان کے نظریات کو جذب کر لیں۔ تصور یہ ہے کہ جدوجہد آزادی کی کہانی اقدار کے جزوِ لاینفک مجموعے کو واضح کرتی ہے۔ یہ خیال کہ قومی تحریک میں شامل بہت سے عظیم راہنما منتشر خیالی کے نظریات رکھتے تھے، ان ''داستانوں'' میں گڑبڑ پیدا نہیں کرتا۔(9) مثالیت محض انفرادی شخصیات کے حصے میں نہیں آتی بلکہ جدوجہد بذاتِ خود بھی اسی میں شامل کی جاتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں بچوں کو جدوجہد کی جو کہانی پڑھائی جاتی ہے وہ مختلف منزلوں پر حال کا ماضی سے لگاتار پیش آنے والا ''صوتی احساس'' ہے۔ اس سطح پر داستان، مجموعی اقدار و شناخت کا ایک بیان بن جاتی ہے اور بچوں کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ ہم وہی لوگ ہیں جنہوں نے انگریز سے لڑائی لڑی تھی۔

یاد کے اشتہار

مجموعی یادداشت، انفرادی یادداشتوں کی اوسط نہیں ہوتی بلکہ اس کا اپنا ایک نیا ڈھانچہ ہوتا ہے۔ اس کی تشکیل دورانِ بلوغت، ماضی کے علم کی منتقلی میں دو طرح سے ہوتی ہے یعنی غیر رسمی طور پر گھر میں اور رسمی طور پر سکول کی پڑھائی کے دوران میں۔ اس علم کا حصول اور اس کا جذب کرنا، نشوونما کا ایک اہم حصہ ہے لیکن ماضی کے علم کے بارے میں بچے کو غیر جانبدارانہ حوالہ جات تک

رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ ایک مجموعی یادداشت کی حمایت کرنا اور اس پر مبنی شناخت کے ادراک کی ترقی پانا، سماجیت کے عمل کا ناگزیر پہلو ہے۔ اگر تاریخ کی ایک داستان اس طرح ترتیب دی جائے کہ بچوں کو اس کی بنیاد یا منطق کا کوئی نشان نہ ملے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسے یادِ ماضی کے ''اشتہار'' کا ایک سلسلہ سمجھیں گے یا پھر ماضی کے ایسے مناظر جو وقت کے فریم سے باہر لٹک رہے ہوں۔ سکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ ایسے ''اشتہارات'' کے پروپیگنڈے کے لئے بہت معاون ثابت ہوتی ہے۔ سکولوں میں پڑھائے جانے والے دیگر مضامین کے مقابلے میں تاریخ، بچوں کے لئے بہت کم مواقع ایسے مہیا کرتی ہے کہ وہ دلائل یا فیصلے دے سکیں اس لئے کہ ان کے لئے طریقہ ہائے کار کے ایسے نشانات موجود نہیں ہوتے جنہیں مؤرخین استعمال کرتے ہیں۔ سکول کی تاریخی درسی کتب کا مؤرخ عظیم شخصیات یا سیاسی ڈرامے کے مناظر کو اپنی جادو بیانی سے پیش کرتا ہے۔ چنانچہ یہ چیز ماضی کی اشتہاری مہم کا حصہ بن جاتی ہے جس کا وقت کی آگاہی یا عقلی تجزیئے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

''جنگجو'' لوگوں کا ذاتی خاکہ ان بڑے یادداشتی اشتہاروں کا بنیادی مقصد ہوتا ہے جو کہ سکولوں کی سطح پر پڑھائی جانے والی تاریخ پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہندوستانی اور پاکستانی عظیم داستانوں میں ایک بڑا ساختی فرق موجود ہے۔ ہندوستانی داستانوں میں ''جنگجو'' وہ لوگ ہیں جنہوں نے برطانیہ سے جنگ کی۔ ''جنگ کا تصور'' روایتی ہے جس میں شکست خوردہ کو اس سرزمین سے باہر نکال دیا جاتا ہے جہاں جنگ لڑی گئی۔ جنگِ آزادی کی یہ کہانی بچوں کے لئے کیپسول کی شکل میں اور بڑوں کے لئے ذرا واضح انداز میں لکھی جاتی ہے۔ یہ بیانیہ کانگریسی راہنماؤں اور انگریزوں کو آمنے سامنے کھڑے دکھاتا ہے جبکہ اس ''جنگ'' کا طویل دورانیہ تین صفحوں کی کہانی میں سمیٹ دیا جاتا ہے۔ اس قدر سمٹی ہوئی شکل میں جو پرائمری سکول کے بچے کے لئے یادگاری اشتہارات کی ڈوری کا کام کرتی ہے، ڈرامائی محاذ آرائیوں کی شکلیں تراشتی ہے۔ ان کی مزید وضاحت اس وقت ہوتی ہے جب ڈھیر ساری شخصیات اور واقعات کو بڑی عمر کے بچوں کے لئے کہانی کی صورت میں سمویا جاتا ہے۔ اصل کہانی وہی رہتی ہے یعنی اس بات کا انکشاف کہ انگریزوں کو کس طرح جسمانی طور پر ملک سے باہر دھکیلا گیا۔ اُنہیں ایک ایسا تھکا ماندہ دشمن بنا کر پیش کیا جاتا ہے جو ظلم اور بربریت کے طریقے اختیار کرتا ہے۔

بھارت اور پاکستان دونوں کی درسی کتابیں یہ وضاحت نہیں کرتیں کہ برطانوی نوآبادکار، ابتدائی فاتحین سے یوں مختلف تھے کہ ان کا ہندوستان میں مستقل قیام کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ مڈل اور سیکنڈری جماعتوں کے نوبالغ بچے محدود سوچ ہونے کی بنا پر ایسے عمومی تصورات کی جانب راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کے لئے ایک سنجیدہ عالمانہ چیلنج ہوتا ہے کہ وہ ''حکمران'' اور ''فتح'' جیسی اصطلاحات کو یوں پہچان لیں کہ ان کے اعلیٰ مخصوص مطالب ان پر نوآبادیاتی تناظر میں واضح ہو جائیں۔ اس چیلنج کے مقابلے کے لئے انہیں احتیاط سے مرتب کیا ہوا نصاب پڑھنے کی ضرورت پیش آئے گی جس میں تقابلی تبصرے اور تناظری تفصیلات موجود ہوں۔ بھارت اور پاکستان میں درسی کتب کے مصنفین کی بھاری تعداد اس کام کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتی۔ وہ تو اس حد تک بھی جانے کو تیار نہیں ہوتے کہ ان کا قاری یہ بات بھی جان لے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی تعداد آبادی کے لحاظ سے کس قدر غیر اہم تھی۔ سکولوں کے تاریخ دان پس منظر کی معلومات کی غرض سے اپنے قارئین کو یہ ضرور بتاتے ہیں کہ برطانوی راج کا مقصد ہندوستان کا معاشی استحصال اور اسے ثقافتی طور پر مطیع کرنا تھا لیکن یہ معلومات بھی محض نوآبادیاتی دور کے قوم پرست زمانے کی تاریخ میں پائی جاتی ہے۔ ایک بار جب آزادی کی داستان شروع کی جاتی ہے تو نوآبادیاتی حکومت کا استحصالی کردار اور اعمال مرکز سے بھٹک جاتے ہیں۔ ایسی نمائندگی ناگزیر طور پر تحریکِ آزادی کے مرتبے کو بدنام کرتی اور اس کے منفرد کردار اور سماجی مقاصد کو دھندلا دیتی ہے۔(10) خاص طور پر یہ سیکولر انسانیت اور انصاف کے تصور کو ہندوستانی لوگ کو انگریزوں کے خلاف ایسی لمبی اور تکلیف دہ جنگ لڑنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس سوال کا جواب جو بھارت اور پاکستان دونوں کی درسی کتب میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ''کیونکہ انگریز غیر ملکی اور باہر سے آئے ہوئے تھے'' دونوں ملکوں کی سکولوں کی کتابیں اس بات پر متفق ہیں کہ ''ہم'' انگریزوں سے لڑے کیونکہ وہ انگریز تھے۔ آزادی کا بیانیہ انگریزوں کی ''غیر ملکیت'' کو زیادہ اہمیت دیتا ہے کہ اس ہندوستانیوں کو ان سے کیوں لڑنا پڑا بجائے اس کے یہ کہا جائے کہ برطانوی کالونیل حکمرانی نے ہندوستان کو مفلس اور قلاش بنا دیا تھا۔ برطانویوں کے غیر مقامی ہونے کا نظریہ سادہ اور سچا ہے اور اس میں اس کی طاقت بھی موجود ہے البتہ اس نظریئے کے واضح سچ کو مان لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ آزادی کے بیانیے کو اس عمیق فن کاری کے اولین نقوش میں کھو جانے دیا جائے جو بھارت کی طویل تاریخ اور مسلسل شناخت کی عوامی

سوجھ بوجھ کو کنٹرول کرتا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہندوستان کی داستان مسلسل کے حصے کے طور پر آزادی کی جدوجہد محض ایک اور باب کا اضافہ کرتی ہے جس میں غیر ملکیوں سے جنگ ہوتی ہے۔ نہ تو بھارت اور نہ ہی پاکستان کے سکولوں کے تاریخ دان اس قابل ہیں کہ نوجوان قارئین کو اپنے ہمراہ لے کر چل سکیں جس سے نوآبادیاتی نظام کو سمجھنے کے لئے ایک نظری یا عمومی سمجھ پھل پھول سکے۔ بے شک دونوں ملکوں کے درسی مصنفین ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان ایک نمایاں اور مجسم جنگ کی سطح سے بمشکل اوپر ابھرتے ہیں۔

رسوا کرتی ہے جو جدوجہدِ آزادی کے دوران میں اعلیٰ اقدار کے مالک اذہان کی زندگیوں اور رویّوں میں پایا جاتا ہے۔

ذاتی شناخت اور لڑنے والوں کے سلسلے میں جس بنیادی عامیت کے مفہوم کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے اس سے قطع نظر ایک مخصوص تعبیر پاکستانی درسی کتب میں ملتی ہے۔ یہ ایک طرح کے فرار سے برآمد ہوتی ہے اور ''بیداری'' کا نتیجہ ہے۔ پاکستانی سکولوں کے مؤرخین آزادی کے بیانیے کو بیداری کے دعوے کے ساتھ پھیلاتے چلے جاتے ہیں جو کہ اس ''ثقافتی بیداری'' سے یکسر مختلف ہے جو ہم بھارتی درسی کتب میں 19ویں صدی کے تناظر میں پڑھتے ہیں۔ پاکستانی درسی کتب میں مستعمل اصطلاح ''بیداری'' کا مطلب خطرے سے آگاہی ہے۔ پاکستانی سکولوں کے مؤرخین کا اس بیداری کے متعلق دعویٰ مزید شدید اس وقت ہو جاتا ہے جب وہ جدوجہدِ آزادی کی آخری دو دہائیوں پر پہنچتے ہیں۔ یہاں ''بیداری'' میں الگ طریق ہائے کار شامل ہو جاتے ہیں مثلاً ایک سیاسی وجود کی صورت میں اتحاد اور اس بات پر زور کہ مسلمانوں کی ایک اپنی الگ منزل تھی جس پر وہ چلنا چاہتے تھے۔ ''بیداری'' کے یہ عناصر ایک پیچیدہ بیان پر آ کر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور وہ ہے کہ ''ہم نے تقسیم پر اصرار کیوں کیا؟''

اگرچہ ''بیداری'' کی پاکستانی کہانی ایک تاریخی داستان ہے تاہم اسے بچوں کے سامنے ایک ''ابدی'' انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ واقعات جو مختلف ادوار میں پیش آئے اور مختلف قسم کی شخصیات مثلاً شاہ ولی اللہ، سید احمد خاں اور جناح کو اس طریقے سے جوڑا گیا ہے کہ ہندوستانی برصغیر میں مسلمانوں کی ایسی ''بیداری'' کی ایک داستان بن جائے جو انکشاف انگیز، مرحلہ وار اور اٹل تقدیر سے عبارت ہو۔ اس داستان میں جو بہادرانہ شان و شوکت ان مشاہیر آزادی کی بیان کی

جاتی ہے اس کا ایک لازمی جزو یکساں طور پر مذہبی داستان بھی ہوتا ہے۔ یہ مذہبی داستان سیاسی داستان کے متوازی چلتی ہے اور نو آبادیاتی دور سے جدوجہد آزادی تک آتی ہے اور ایک باقاعدہ ''علیحدگی'' کی تحریک کا جواز اور وضاحت مہیا کرتی ہے جس کی قیادت مسلم لیگ نے جدوجہدِ آزادی کی آخری دو دہائیوں میں کی۔

چنانچہ پاکستانی سکولوں کا مؤرخ دو ''راہوں'' کا احاطہ کرتا ہے ایک تو ''وطن'' کے تصور کو دھیرے دھیرے واضح کرنا اور دوسرے اس تصور کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے سُست سیاسی ترقی کی نشاندہی کرنا۔ پاکستان کی قومی یادداشت سکولوں کی درسی کتب میں ایک ایسے سانچے کے طور پر ابھرتی ہے جس میں یہ دونوں ''دوراہے'' متبادل طور پر موجود ہوتے ہیں نوجوان قاری کی توجہ دونوں کے درمیان معلق ہو جاتی ہے۔ یہ ایک خوبصورت توازن ضرور ہے تاہم اگر ہم اس کا مشاہدہ تفسیری طور پر کریں تو پتہ چلے گا کہ اس کا رجحان دوسرے راستے یعنی سیاسی راستے کی طرف زیادہ ہے۔ ایک مسلم ''وطن'' کی تلاش ایک شاندار منظر کو پیش کرتی ہے جس کے پیچھے ''سیاسی جنگجوؤں'' کی تکلیف دہ جدوجہد موجود ہے۔ ان کو اپنی منزلِ مقصود حاصل کرنے کے لئے اس قدر سختیاں کیوں جھیلنا پڑیں، یہی اس داستان کا اصل خلاصہ ہے۔ ایک نوجوان قاری اس کہانی کی تہہ میں جو بات لازماً پاتا ہے وہ یہ کہ اگرچہ ایک تصور موجود تھا تاہم اس تصور کو روشنی اس وقت ملی جب شدید سیاسی کوششیں کی گئیں۔ اور یہ سخت سیاسی جدوجہد اس لئے کرنا پڑی کہ تصور کو حاصل کرنے کے متبادل ذرائع معدوم ہو چکے تھے۔

مختصراً ہم بھارتی اور پاکستانی داستانوں میں تمیز اس طرح کر سکتے ہیں کہ اوّل الذکر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ آزادی ''کیسے'' حاصل کی گئی جبکہ آخرالذکر کا زور اس بات پر ہے کہ اسے بہ صورت ''کیوں'' دی گئی؟ بھارتی داستان کا زیادہ تر حصہ قدرے آسان ہے اگرچہ اس کے پھیلاؤ میں ایک مخفی پیچیدگی موجود ہے اس کا بنیادی مقصد گاندھی کی زیر قیادت کانگرس کی کامیابیوں کا شہرہ کرنا ہے لیکن یہ ساتھ ساتھ دیگر تنظیموں اور ان کے راہنماؤں کی کارگذاری کا ذکر کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ اس میں نوجوان قارئین کو یہ جاننے نہیں دیا گیا کہ جدوجہدِ آزادی میں کوئی اتصالی اقداری رجحان موجود نہ تھا اور یہ کہ مختلف تنظیموں اور ان کے راہنماؤں کی شدید مخصوص اقداری ترجیحات موجود تھیں اگرچہ ان کے تصورات یکساں نظر آتے ہیں۔ بھارتی

داستان کی فراخدلانہ فطرت میں اس وقت یہ کمی نظر آتی ہے کہ وہ محض ایک تنظیم یعنی مسلم لیگ اور اس کے تصور کو جائز مقام نہیں دیتی۔ بھارت کی آزادی کے رزمیے سے لیگ کو ابتدا ہی میں نکال باہر کیا جاتا ہے اگرچہ پاکستانی داستان میں صرف اسے (کانگرس) بیان کیا گیا ہے لیکن اس میں بھی پیچیدگیوں کا دخل ہے کیونکہ اس کا لازمی عنصر لیگی سیاست کو مسلمانوں کی بیداری سے جوڑنا ہے۔ یہ داستان دوراہوں کا استعمال کرتی ہے کہ لیگی راہنماؤں کو کانگرس سے اپنے تصورات اور حکمتِ عملیوں کو الگ ''کیوں'' کرنا پڑا؟

References

1- Benedict Anderson, Imagined Communities (London: Verso, 1983).

2- R. Rennie, 'History and Policy Making', International Social Science Journal (156: June 1998), pp. 289-301.

3- Eric Hobsbawm, On History (London: Weidenfeld & Nicolson, 1997).

4- For a discussion of the politics of mention, see A. Megi.l, 'History, Memory, Identity', History of the Human Sciences, (11: 3, 1999), pp. 37-62. Daud Ali, (ed.), Invoking the Past, (Delhi: Oxford, 1999), presents several studies of the uses which history-writing has served in South Asia.

5- Every commission on education appointed since Independence in both India and Pakistan has lamented the ills of the examination system and has suggested reforms which proved either too hard to implement within the existing structure of the system of education or had a short life. Books and reports written on Indian education

before Independence carry an identical lament, indicating that the examination system exemplifies a continuity in educational policies since colonial days. For a discussion of this and other aspects of the continuity, see Krishna Kumar, Political Agenda of Education, op. cit.

6- Bipan Chandra, Modern India: A History Textbook for Class XII (New Delhi: NCERT, 1990; rep. 1998), foreword.

7- A committee was set up by the Ministry of Human Resource Development in 1992 for the drafting of a syllabus for post-Independence history. Although it met several times and considered a number of strategies to introduce post-Independence history, it could not conclude its work and recommend a plan.

8- Sandra B. Freitag, Collective Action and Community (Delhi: OUP, 1990).

9- Marjorie Sykes makes the point in 'Moral Education', Seminar (297: May 1984).

10- K.M. Munshi, op. cit.

❁❁❁❁❁

ہندوتوا اور اس کی ''میھسٹری'' (Mhystory)

پردیپ کماردتا/ترجمہ: نیئر عباس زیدی

ہندوتوا اور اس کی تاریخ کے درمیان رشتے نے گذشتہ ایک دہائی سے فرقہ واریت کے مخالفین کے درمیان شدید بحث چھیڑ رکھی ہے۔ اس صورت حال کا آغاز سنٹر فار ہسٹر ورک سٹڈیز (جے این یو) کی جانب سے 1989ء میں شائع کردہ ایک کتابچہ سے ہوا جس کا عنوان تھا ''دا پولیٹیکل ابیوز آف ہسٹری بابری مسجد/ رام جنم بھومی ڈسپیوٹ (تاریخ کی سیاسی دشنام طرازی بابری مسجد/ رام کی جائے پیدائش کا تنازعہ) اس کتابچہ میں اس ہندوتوا دعویٰ کے سامنے دلائل ترتیب دیئے گئے تھے کہ رام واقعی ایک فرد تھا جو اس خاص جگہ پیدا ہوا جہاں بابری مسجد تعمیر کی گئی۔

اس کی دلچسپ بات یہ تھی کہ اس کتابچے کی اشاعت نے فرقہ واریت کے ان مخالفین میں بھی ایک تنقیدی صورت پیدا کر دی جو آزاد خیالی کے بھی مخالفین تھے جن میں دینا داس اور اشیش نندی جیسے دانشور بھی شامل ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ شہادتوں کی بنیاد پر ہندوتوا دعوؤں کا مقابلہ کرنے سے نہ صرف یہ کہ ہندوتوا کا یہ نکتہ ہاتھ سے جاتا رہے گا کہ یہ عقائد کا مسئلہ تھا بلکہ اس سے بھی بدتر یہ کہ روشن خیال لوگوں نے بھی ہندوتوا خیالات و نظریات کی تائید کی، اس کسوٹی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ حقیقت ان مقامی نظریات اور اساطیر کی تخفیف بلکہ پردہ داری پر مبنی ہے کہ جنہیں عالمی رائے عامہ اور ریاست کے پھیلائے ہوئے نظریات سے یکجا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اشیش نندی نے اپنے ایک ہیجان انگیز مضمون میں، کہ جس میں روشن خیال تاریخ دانوں

سے عداوت زیادہ ہے بہ نسبت ہندوتوا نظریات کے، اعتراضات ہندوتوا نظریات کے دعویٰ کیا ہے کہ یہ روشن خیال تاریخ دان ماضی کے نظریات کی جامع اصلیت معلوم کرنے کی کوشش میں انہیں از سرنو تعمیر کر رہے ہیں (اساطیر کے بالکل برعکس کہ جو ماضی کے بارے میں اخلاقی کہانیاں ہی دہراتی ہے) اور ان کے خیال میں یہ ہندوتوا نظریات رکھنے والے لوگوں کے خلاف ایک سازش ہے کیونکہ وہ لوگ روشن خیال تاریخ کو اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ وہ ''موزوں سائنسی'' نہیں۔

بدقسمتی سے نندی کو سمجھ میں آنے والی ہندوتوا تاریخ پر کچھ مناظرانہ چھاپ ہے۔ میرے خیال میں مسئلہ اس مضمون کے ساتھ نہیں بلکہ اس بحث کے ساتھ ہے کہ جس کا محور روشن خیالی کی برائیوں یا تاریخ کی بدی کے گرد گھومتا ہے (اکثر دونوں کے گرد) یا پھر اساطیر اور یادداشتوں کی خوبیوں کے گرد اور اس کے بالعکس۔ قریہ داری کے مخالفین کے درمیان ہونے والے انتہائی شدید مباحثے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوتوا تاریخ نے محض بحث و تمحیص کا موقعہ فراہم کیا ہے جبکہ وہ خود بے تصریح ہی ہے۔ مسئلے کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ہندوتوا کے علمبرداروں نے اب اپنی تاریخ کے اصول بھی وضع کرنے شروع کر دیئے ہیں، کیونکہ سکولوں کے نصاب کی کتب اور ''ترقی کی جانب'' نامی قوم پرست تحریک پر مبنی آئی سی ایچ آر پراجیکٹ کی کتابوں پر وہ لوگوں کی تنقید کا نشانہ بنے۔

ہندوتوا تاریخ کی ایک اور برمحل تعریف کے آر ملکانی نامی ہندوتوا کے ایک سرگروہ علمبردار کی طرف سے آئی، جو ایک ساختہ اصول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس الزام کے جواب میں کہ ایچ آر ڈی وزارت تاریخ کے نام پر اساطیر کو ترویج دے رہی ہے، ملکانی کہتے ہیں ''حقیقت یہ ہے کہ عموماً اساطیر میں تاریخ زیادہ ہوتی ہے اور تاریخ میں اساطیر''[1] اساطیر اور تاریخ کے تشریحی بیانات اور اس کی انوکھی خاصیت کو بیان کرنے کے لئے ایک نئی اصطلاح کی ضرورت ہے، جو اصطلاح میں یہاں استعمال کر رہا ہوں وہ ہے ''میہسٹری'' (mhystory) (اساطیر اور تاریخ کو ملا کر)

علم کی وہ خاص قسم جو اس طرح کے غیر مساوی طریق وضع کرے اس کے اپنے کچھ اندرونی اصول بھی ہونے چاہیں، جس سے وہ ربط و تسلسل کو برقرار رکھ سکے۔ یقیناً اس کے اصول بیرونی اور

1- کے آر ملکانی، ہسٹری اینڈ نیشنلزم دا سٹیٹس میں، 23- دسمبر 2001ء

ماورائی منبے سے حاصل کئے گئے ہیں جو قوم پرستی ہی تھے۔ ملکانی اپنے ''فاتحانہ'' نچوڑ میں بیان کرتے ہیں کہ ایک اچھی تاریخ وہی ہے جو ایک اچھی قوم بنا سکتی ہے جبکہ تنقیدی تاریخ دان اپنی دشنامی پر نادم ہیں۔ ماضی محض ایک ذریعہ ہے کہ جس سے ہندوؤں کے لئے ایک مثبت (خود دشنامی کے برعکس) خودتصور کی جائے۔ اس میں دو عناصر شامل ہیں۔ پہلا یہ کہ تاریخی شہادت کی قیاسی نوعیت کو پیمان حتمی طور پر تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ہندو قوم پرستی پر کئے گئے اپنے حتمی کام میں گولوالکر واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ آریاؤں کے فاتحانہ نظریے والے مفروضے کی غیر یقینی حیثیت کو یہ تیقن رد کر دیتا ہے کہ ''ہم ہندو کسی بھی سرزمین سے ہجرت کر کے نہیں آئے، بلکہ ہم، غیر معینہ مدت سے اس سرزمین (ہند) کے فطری سپوت ہیں۔''

دوسرا اور اضافی عنصر دانستہ فراموشی کا ہے۔ کوئی بھی ایسی تفصیل جو ہندوؤں کے خودتصوری کے مثبت تاثر کو چکنا چور کرے اسے قابل دست برادری سمجھا جاتا ہے۔ ملکانی یہ بات (مجبوراً) تسلیم کرتے ہیں کہ قدیم ہندوستان میں کچھ لوگوں نے ضرور گائے کا گوشت کھایا ہوگا، اور نچلی ذات کے لوگ یقیناً کھاتے رہے ہیں، لیکن نصاب کی کتب میں اس کا ذکر کرنا ''ہندوؤں کے گائے کے احترام'' کا مذاق اڑانا ہے۔

حقیقت اور افسانے کو ضم ہو جانے کی صورت میں جبکہ افسانہ زیادہ غالب آ جائے (جیسا کہ ملکانی کی گوشت کی مثال سے ظاہر ہے، ایسے میں منطقی طور پر یقین کی ضرورت ہے) ماضی کو ہو بہو درست تسلیم کرنے سے لے کر حالیہ نظریات کی سند اور دانستہ فراموشی کے جدید نظریہ، کہ جس میں خیالات کے تنوع کو دبانے اور متضاد تفاصیل کو خلط ملط اس لئے کہا جاتا ہے کہ اساطیر تخلیق کی جانے تک ہندوتوا اساطیری ڈھانچوں سے یکجا ہوتا نظر آتا ہے۔ ماسوائے دو اہم عناصر کی موجودگی کے پہلا یہ کہ یہ نظریہ اساطیری ثقافت کی توثیق نہیں کرتا۔ اساطیر کو ایک ثقافت کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو مختلف طبقات کو مختلف مفاہیم فراہم کرنے کا راستہ دے، ایک وسیع بیانیہ ڈھانچہ جو بنیادی بیانیہ نکات اور وہ بنیادی خیال یا تصور پیش کرتا ہے جو تبدیل ہو سکیں اور جن کی تشریق نو ہو سکے۔ ایسی ہی ایک ثقافت سے، اپنے مختلف اختراع شدہ تراجم کی وجہ سے، رامائن کا تعلق ہے (جیسا کہ پولا رچمین کی کتاب ''مینی رامائنیز'' (کئی رامائنیں) سے ظاہر ہے)۔ اس ثقافت کے لئے ہندوتوا کی عدم برداشت کا واضح اور کھلا مظاہرہ ساہمت کی نمائش ''ہم سب

ایودھیا'' اور ایم ایف حسین کی سرسوتی کی تصویری نمائش سے ہوتا ہے۔ ایک اور وصف جو ہندوتوا کی اساطیر سے وابستگی ظاہر کرتا ہے وہ حقائق کی قیمت بندی ہے۔

ہندوتوا کے نظریے کی خود ساختیت سے وابستگی اور اس کا روشن خیال تاریخ دانوں سے عناد ملکانی کی تحریروں سے ظاہر ہے، اسی طرح کی دیگر کوششیں جیسی کہ حال ہی میں کی گئی ہے جس میں ہڑپہ کی سیلوں (Seals) کو معنوی رنگ دینے کے لئے کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا استعمال کیا گیا تاکہ اس کے وادی سندھ اور ویدتہذیبوں کے درمیان، تسلسل کے لئے، شہادت کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ حقائق کو خلط ملط کرنے کی کوششوں میں سے ایک اہم کوشش رام جنم بھومی احتجاج بھی شامل ہے، جس کا مقصد ماضی پر یقین دلانا ہے یعنی رام کا وجود تھا اور ایودھیا کے مقام پر اس کی پیدائش ہوئی ہے اور اس خواب کو ممکن المس بنانے کے لئے اس خاص مقام پر مندر کی تعمیر کی جائے۔

اس مہم اور کار اندازی کی کچھ گنجلک تفاسیر ہیں۔ مثلاً گولوالکر (باوجود اس کے کہ بعد کی تحریروں میں اس نے اس مفروضے کو رد کر دیا ہے) گمنام ماہرین علوم شرقیہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بھگوت گیتا گوتم بدھ سے تقریباً 1500 سے 2000 سال قبل لکھی گئی جبکہ گوتم بدھ 600 قبل از مسیح گذرے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ مہا بھارتہ 4500 سے 5000 سال قبل مرتب ہوئی۔ اور یہ کہ بھگوت گیتا ایک انتہائی پیچیدہ اور ترقی یافتہ تہذیب کو اُجاگر کرتی ہے جس کا ارتقائی سفر صدیوں پر محیط ہے (وہ ان 2000 سالوں کا حوالہ دیتا ہے جس کے بعد عیسائیت نے تہذیب کی موجودہ صورت اختیار کی اور جواب بھی مقابلتاً اس سماجی ڈھانچے سے کم تر ہے جو اس لافانی گیت (رزمیہ) میں بیان کیا گیا ہے) اس کا مطلب ہے کہ ہندو اس دھرتی پر تقریباً 8000 سے 10000 سال سے قابض ہیں۔

گولوالکر قاری پر مختلف مفروضات کے وسیع تر طریقوں سے بمباری کرتے ہیں۔ معیاری کا حقیقی سے تعدیل کہ جس نظر سے وہ گیتا کو دیکھتے ہیں، دانشورون کا حوالہ درحوالہ، دیگر تہذیبوں سے موازنہ، جو کہ باری باری بتدریج تاریخ کے استخراج کے لئے استعمال ہوسکتا ہے جسے بالآخر ایک شاندار اور زبردست توثیق کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ استخراجی طریقہ کار میں اندرونی کوئی ربط نہیں ہوتا اور یہ اس مقصد کے لئے ہوتا بھی نہیں، اس کا اصل مقصد تو جوش بیان

ہوتا ہے جو قاری کو اس بات پر رضامند کرنے کے لئے ہوتی ہے کہ ماضی کا اجلا پن، درحقیقت، بنایا گیا ہے۔

یہ ایک طے شدہ برجستگی ہے کہ جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ کس طرح اساطیری ڈھانچے ضرورتاً تعمیر کر لئے جاتے ہیں تاکہ انہیں تصدیق شدہ شہادت کے طور پر شامل کر لیا جائے۔ جو چیز زیادہ دلچسپی کا باعث ہے وہ ہندوتوا کا ایک خاص حد تک حقائق پر انحصار ہے تاکہ اپنے لئے اور دیگر افراد کے لئے مقبولیت اور ظاہرداری پیدا کی جا سکے، باوجود اس امر کے کہ وہ جس انگیختہ سوچ اور عقائد پر کاربند ہیں۔ اس بات کی جڑیں شاید اس دفاعی تدبیر میں پنہاں ہیں جو بیسویں صدی میں شروع ہوئیں اور جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ہندوستان کی ایک اصلی اور شاندار تاریخ ہے، یہ ثابت کرنے کے لئے انہوں نے رزمیہ نظموں کے استعاروں اور ''پورناؤں'' کا سہارا لیا جس میں ہندوستانیوں کو اس اہل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ اڑ سکتے ہیں، نیوکلیائی ہتھیار بنا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ہندوتوا کے پراجیکٹ نے اپنا اظہار خیال بڑھا لیا ہے وہ مقبولیت کے اظہار کے لئے ان حقائق کا استعمال کرنے لگی ہے جو فہم و فراست کی حیثیت سے تاریخ دان استعمال کرتے ہیں وہ ماضی کی چیزوں سے متعلق مستحکم اور درست حقائق بتاتے ہیں۔ تاریخی حقائق کو عموماً ایسے دیکھا جاتا ہے۔ انہیں مشہور تاریخوں اور نصاب کی کتب کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ کہ جیسے وہ غیر مشروط طور پر حقیقت کے برابر ہوں۔ ہندوتوا کے لئے یقیناً حقائق بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ وہ اس عقیدے کو مضبوط تر بناتے ہیں کہ ماضی انتہائی تابناک تھا اور آج کے ہندوؤں کا اس سے رشتہ اٹل ہے۔ تاریخی حقائق کی اہمیت پر زور دینے کی ایک اور مربوط وجہ ہے اور وہ زمانہ حال سے اس کا رشتہ جوڑنے اور عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری ہے، میں اگلے حصے میں اس پر بحث کرتا ہوں۔

''میہسٹری'' (mhystory) کا مسئلہ ان اساطیری ڈھانچوں کو بیان کرتا ہے کہ جنہیں اگر ایک مرتبہ علیحدہ کیا گیا اور پھر ہم نوع بنایا گیا تو وہ سازکاری کی نسبت زیادہ قابل قبول ہوں گے کیونکہ وہ عقائد کی علامت ہیں اور انہیں انہی عقائد کی بنا پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے اندر لچک بھی رکھتے ہیں جو تاریخی تفصیلوں کو بھی مروج کروا سکتی ہے اور حقیقت پر مبنی ان مفروضوں پر جو

ان کے اندر سموئے ہوں۔ یہ لچک ہندوتوا نظریے کے لئے ضروری ہے کیونکہ یہ ایک ایسے بڑے پراجیکٹ میں مصروف عمل ہے جو ایک ہندو قومی شناخت کو پروان چڑھا رہی ہے جو زمانہ حال میں ماضی کی صف آرائی کر رہی ہے۔

ہندوتوا کے پراجیکٹ کو بڑے ثمر آور انداز میں سمجھا جا سکتا ہے اگر ہم اسے چارلیس ٹیلر کے ادراک کے خلاف پیش کریں کہ جنہوں نے اپنے ایک مقالے میں شناخت کی سیاست کو آگہی کی ضرورت اور اسی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ کسی ایک شخص کی طرح ایک طبقے کو بھی پہچان کی ضرورت ہوتی ہے، اس آگہی کی نفی اور اس طبقے کا دوسرے کی نسبت کم تر سمجھا جانا اس کی خودی کو نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔

یہاں پر میرا مقصد ٹیلر کے دلائل کو دوہرانا نہیں ہے لیکن میں ٹیلر کے بنیادی ادراک کو ہندوتوا کے متوازی پراجیکٹ کو بیان کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہوں، ٹیلر کا ادراک دوسروں کی سند کی قیمت بندی کرتا ہے اور کسی فرد کے دیگر لوگوں کے ساتھ تعلق، اس کی غیر منصفی اور اس کی چارہ سازی کا متلاشی ہے۔ جبکہ ہندوتوا، اس کے برعکس خودشناسی کے منصوبے پر گامزن ہے۔ اس کی دلچسپی یہ ہے کہ ہندو خود کو کیسا سمجھتے ہیں بجائے اس کے کہ لوگ انہیں کیسا جانتے ہیں۔ اس میں دیگر لوگوں سے رشتوں میں خودی کا تصور زیادہ عیاں ہے۔ اس بات پر زور دیتے ہوئے یہ پراجیکٹ دیگر لوگوں سے غیر متوازی تعلقات بنانے میں دلچسپی رکھتا ہے بجائے ان کو ختم کرنے کی۔

ہندوتوا کے لئے خودی ہندو قوم ہے۔ اس خودی کے تصور میں کوئی تقسیم اور کسی بھی قسم کا تضاد نہیں ہے اور نہ ہی اس میں انفرادی اور اندرونی خودی کا ذکر ہے۔ گولوالکر کے اس مندرجہ ذیل مقالے میں ''مشترک'' کی یقین دہانی بھی ہے جہاں وہ ہندو قوم کو نسل کی صورت بیان کرتے ہیں ایسا اشارہ اس ناممکن اور پیچیدہ مسئلے کی شدت کو ضرورت کے مطابق ہم نوع بنانے کے لئے کیا:

''قبل از تاریخ اس سرزمین پر رہائش صرف ایک ہی نسل کی ہے۔ وہ ہندو نسل ہے، جو روایات کی وجہ سے متحد ہے، مشترکہ عظمت رفتہ اور تباہی بربادی کا سلسلہ، مشترک تاریخی، سیاسی، سماجی اور دیگر تجربات، مشترک اثرات کے زیر اثر رہنا اور ایک مشترک ثقافت کا ارتقاء..... وغیرہ۔ یہ وہ خودی ہے جو کسی ملک کی ثقافت میں موجود ہے، اسے تشکیل دینے یا اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی،

بلکہ اسے خودی کے حامل افراد کی سند کی ضرورت ہوتی ہے۔ایک ایسے سلسلے میں شروع ہونے کی ضرورت جو اس اہم ہندو کردار کی اہمیت کو اجاگر کر سکے۔

پہچان اور قدر شناسی کا یہ عمل ''جگران'' یا ''جگرپ'' کے الفاظ سے جانا جاتا ہے۔یہ الفاظ پیداواری اور احیاء کے اس نظریے کو ظاہر کرتے ہیں جو امکانی قوت کی بازگیری سے منسلک ہے۔اس بیداری کے لئے فخر ومباہات ضروری ہیں کیونکہ مسلم اور انگریز حکمرانیوں کی بدولت کسی شخص کی ''ہندومت'' کے فخر میں کمی واقع ہوسکتی ہے خاص طور پر نوآبادیاتی دور میں کہ جہاں عقیدہ ازسرنو سکھایا جارہا تھا (جس کا یقینی نتیجہ روشن خیالی ہی تھا) جس نے خودی کے اس تصور کو مخفی رکھا کہ وہ اس سرزمین کے مالک ومختار ہیں۔گولوالکر اس بات کو عیاں کرتے ہیں کہ ہندوؤں کو یہ ادراک یقینی طور پر ہونا چاہئے کہ وہ اس سرزمین کے فطری سپوت ہیں (لہٰذا وہ) اس ملک کے فطری طور پر مالک ہیں۔ہندوتوا کی خودآگہی کا مرحلہ اس ملک پر اپنا قبضہ جمانے اور حکمرانی کا تصور لئے ہوئے ہے۔

جیسے کہ قیاس کیا جاسکتا ہے، ہندوتوا کی خودآگہی عقائد پھیلانے کا کوئی عمل نہیں۔اس میں ایک سیاسی عمل کارفرما ہے جس کا مقصد ثقافتی وسائل کی لام بندی ہے تاکہ ہر ہندو میں یہ آگہی پیدا کی جاسکے۔سطحی طور پر اس کا مقصد یہ ہے کہ اس ملک کے طول وعرض ہندوتوا کی علامتوں سے بھرے ہوئے ہیں وہ بصری علامتیں کہ جو روزمرہ کی اشیاء کے ساتھ ہیں اور جو روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کے ساتھ خود کو لے جاسکتی ہیں (کہ جیسے گاڑیوں پر ''om'' کا سٹکر لگا دیا جاتا ہے) میڈیا ٹیکنالوجی کہ جیسے ہندوؤں کی تنظیموں نے استعمال کیا (کیسٹیں، فلمیں)، شائع شدہ متن (نصاب کی کتب) وغیرہ، یہ سب کچھ اس لئے تاکہ ثابت کیا جاسکے کہ ہندو قوم روزمرہ کی زندگی میں سرگرم ایک جیتی جاگتی قوم ہے۔

یہاں آکر تاریخی حوالہ جات اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔وہ ہندو قوم کی روزمرہ کی زندگی میں ایک لامتناہی تواتر کی حس پیدا کر دیتے ہیں۔ہندو خودآگہی ان تبدیلیوں اور تضادات کی عادی نہ تھی۔ہندوتوا نظریے کی آرزو ہے کہ نہ صرف مستقبل میں، ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے طبقے اور اس میں موجود تنوع میں خودشناسی پیدا ہوگی بلکہ وہ اپنے ماضی میں بھی تبدیلی لے کر آئیں گے۔ماضی کے یادگاری نشانات جیسے رام جنم بھومی مندر (دیگر مندروں کے ساتھ ساتھ جنہیں

مسلمانوں کے قبضے سے ''بازیاب'' کروانا ہے۔تعمیراتی پراجیکٹ، جگہوں کے نام وغیرہ) رسمی و رواجی مواقع جیسے رام کتھاس، ''جگران'' رسومات کے مواقعے کہ جہاں قدیم مسودات کو دوبارہ روشن کیا جاتا تھا تاکہ انہیں تاریخ کی ان حوالہ جاتی کتب کے نظام سے مربوط کیا جائے کہ جس میں قدیم ہندوستان کی عظمت، یقین دہانی کے ساتھ، بیان کی گئی ہے۔ ساتھ ہی، لیکن دراصل ماضی کو حال کا رنگ دیتے ہوئے (مندروں کی تعمیر کر کے، نصاب کی کتب میں روشن خیالی کے اثرات کو ختم کر کے) حال کے زمانے میں ایک گہری فخر و مباہت ہے کیونکہ وہ اس قابل ہوتا ہے کہ ماضی کو جلا بخش سکے۔ زمانہ حال اپنے تمام تر پراجیکٹوں اور کوششوں کے ساتھ ماضی کو قابو میں رکھتا ہے اور اسے حال ہی کا حصہ بنالیتا ہے۔ ماضی کی اسی حس اور اس کی قوت کو نیپول نے 1993ء میں دیئے ہوئے ایک انٹرویو میں تفصیلاً بیان کیا ہے، اس انٹرویو میں انہوں نے بابری مسجد کی مسماری کا حوالہ دیتے ہوئے، اعلان کیا، مجھے آج یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستانی اپنی تاریخ سے آگاہ ہو رہے ہیں، ایسا ماضی میں کبھی نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ گولوالکر اس سنہری دور سے آزردگی نہیں رکھتے، کیونکہ، ان کے بقول، فراوانی میں زندگی معمول کے مطابق ہوتی ہے، جبکہ یہ صرف ''تنزلی کا دور'' ہی ہوتا ہے (جو یقیناً حال ہی ہے) جو ہمیں اپنی صلاحیتوں کو سامنے لانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ قدیم زمانہ، چاہیے سنہری ہی سہی مگر جامد ہو چکا ہے، یہ حال ہی ہے جو متحرک ہے اور عظمت کا منبع ہے۔ صرف ہندوؤں کے ماضی اور اس کے سحر سے ''اچھا احساس'' پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوتوا کا نظریہ یہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ ہندو خود آگہی کی علامتوں اور نشانیوں کو دیگر مذاہب کی ایسی علامتوں، مذہبی عقائد اور ثقافتوں کی جگہ لے لینی چاہئے کہ جو یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ اس قوم کی روزمرہ زندگی میں اپنا نقش ثبت کر دیں گی۔ اس منصوبے کی مضرت رسانی اور شدت کا اندازہ، تاج برطانیہ کی حکومت ختم ہونے کے بعد، سڑکوں اور یادگاروں کے نام تبدیل کرنے سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کام اس وقت ہوا جب کوئی بھی ایسا باسی نہیں تھا جس کا تعلق ان ختم ہو جانے والے نشانات سے ہو۔

جبکہ اس کے برعکس، ہندوتوا کے لئے یہ زندہ لوگوں کی نشانیاں ہیں جن کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی قوم کا اثاثہ ہیں لیکن انہیں مٹانے کی سعی کی جاتی ہے اور انہیں ثانوی حیثیت کا سمجھا جاتا ہے۔ دیگر مذاہب کے افراد، جن میں مسلمان، عیسائی، روشن خیال اور

سوشلسٹ وغیرہ شامل ہیں کو انہیں اختلافات کے ذریعے ہی قابو میں رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا رام جنم بھومی کا مسئلہ، بابری مسجد کی مسماری کے ذریعے، مسلمانوں کو ثانوی حیثیت کا درجہ دلوانے کی یقینی کوشش بھی شامل ہے کہ جسے وہ زندہ انسانوں تک منتقل کرنا چاہتے ہیں، وہ ان زندہ لوگوں کو بھی دیگر مذاہب کی علامتیں اور نشانیاں قرار دیں گے کہ جنہیں جلایا جا سکے، عصمت دری کی جا سکے، خنجر گھونپا جا سکے اور حکومتی فیصلوں کے ذریعے ہٹایا جا سکے (جیسے کہ حال ہی میں گجرات کے علاقے میں مہاجرین کیمپ ہٹا کر کیا گیا ہے)۔

اس منصوبے کے لئے میہسٹری (Mhystory) (اساطیر + تاریخ) ایک لازمی جزو ہے کیونکہ یہ اس کام کو تحریک دیتی ہے اور اس کا جواز پیش کرتی ہے۔ ہندوتوا میں ماضی کا بیان دو بنیادی عناصر کے گرد گھومتا ہے: قدیم ہندوستان کی عظمت اور قرون وسطیٰ و برطانوی نوآبادیاتی دور میں ہندوؤں پر ہونے والا جبر و استبداد۔ خود آگہی کے منصوبے کا دونوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ ماضی کو جلا دینے سے قدیم عظمتوں کے ساتھ ایک تواتر پیدا ہوگا۔ جبکہ ہندومت کی ظاہری اور ممکن المس نشانیوں سے گزشتہ زمانوں کی ہتک وا ہو سکتی ہے۔ زمانہ حال نہ صرف تاریخ کو جلا بخشتا ہے بلکہ یہ اپنا وزن بھی اتارتا ہے۔ بالفاظ دیگر ماضی اور حال میں ایک ہی زمانہ میں رونما ہونے والے واقعات کا رشتہ ظاہر کر کے، ہندوتوا کا نظریہ زمانہ حال کو تمثیل میں ڈھال کر ماضی کا روپ دینا چاہتا ہے۔ ہر مسلمان/ عیسائی/ روشن خیال شخص/ بائیں بازو کے نظریات رکھنے والا شخص/ ہندوتوا مخالف جبر و استبداد کے اس غیر فطری دور کی علامت اور نشانی ہے اور ان طبقات سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کی اہانت ہندوؤں کے ماضی اور اساسی رشتے کو ظاہر کرتی ہے اور اسی (سوچ) کے ذریعے وہ اس عقیدے پر ثابت قدم رہ سکتے ہیں کہ وہ ایک قوم ہیں اور باقی تمام افراد اس قوم کی کائی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ قوم مساوی شہریوں پر مشتمل نہیں بلکہ یہ قوم (اعلیٰ) ہندوؤں اور (ادنیٰ) دیگر مذاہب کے افراد پر مشتمل ہے۔ ''میہسٹری'' (Mhystory) (اساطیری + تاریخ) یک ایسی قوم کی تشکیل نو چاہتی ہے جس میں اندرونی تفریق اور نظام مراتب کی بنیادوں پر معیار بندی ہو۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ''میہسٹری'' (Mhystory) کو اساطیر اور تاریخ دونوں کے عقیدت مندوں اور کارکنوں کی جزوی اور کلی تنقید و چیلنج کا سامنا ہے ایک تاریخ دان ہونے کے

ناطے میں ان طریقوں کے بارے میں کوئی مفروضہ قائم نہیں کرسکتا جنہیں بروئے کار لاکر اساطیر کو ہندوتوا کی پیچیدگیوں سے علیحدہ کیا جا سکے، نہ ہی یہاں میں یہ بیان کرسکتا ہوں کہ ''میہسٹری'' (Mhystory) کا تاریخ سے تعلق کس طرح عمل میں لایا جائے۔ تاہم میں اس ضرورت پر زور دوں گا کہ ایک اہم تاریخی رویے کے بارے میں دوبارہ سوچا جائے۔

اس کا مطلب عصری شناخت اور تاریخ کے درمیان تعلق کی تخلیق ہے۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ خود اپنی شناخت کے لئے ماضی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ اس کا تعارف خود سے اور دیگر لوگوں سے کروایا جا سکے۔ ہمارے ملک میں موجودہ تاریخ دانوں نے قوم پرستی کی تاریخ پر انحصار کر کے، ایک ناتجربہ کار قوم کو شناخت بخش دی ہے۔ تاریخی تحقیق روشن خیال لوگوں کے ساتھ کام کرنا، کثیر الثقافتی ہونا اور سیاسی نوعیت کے مفروضوں سے ہم نسلی قوم کا نظریہ پیچیدہ صورت اختیار کرے، پھر بھی یہ قوم تاریخی، تحقیق کا حوالہ اور کسوٹی رہی ہے۔ اس وسیع تناظر میں تاریخ ہمارے ملک میں ضرورت کی ایک چیز پر مبنی رہی ہے۔ مختصراً یہ کہ یہی مفروضہ ہے کہ جس پر ہندوتوا نے کام کیا ہے اور ماضی کو حال کا ایک ممکن المس حصہ بنانے کی کوشش میں اس کو بڑا دلفریب اور انقلابی بنا دیا ہے۔ اس کی بجائے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخی روایت کی سمت بندی کی جائے اس نظر کے ساتھ کہ ماضی سراسر مختلف ہے، تاریخ دانوں کے لئے بھی اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک آزادی کے ساتھ، اور واپسی کی شرط سے مبرا ہو کر، سفر کریں اور اپنے مفروضات و مواد کی تحقیق کریں۔ یہ رویہ اس وقت قطعی اور حتمی ثابت ہوگا کہ اگر زمانہ حال کو حکمرانی اور پابندی کے شکنجے سے آزادی حاصل ہو۔ چونکہ پانسہ ہمیشہ زمانہ حال میں ہی رہا ہے لہٰذا تاریخ میں سفر کرنے کا نقطہ (تاریخ دان اور اس کا مواد) اور اس کی واپسی (اس کا مواد) کو ہم زمانہ حال میں نہیں گردان سکتے۔ حال زمانہ ماضی کی افق کے بارے میں متواتر معلومات فراہم کرتا ہے لیکن اس افق کو ویسا ہی رہنا چاہئے، ایک دوری کی کیفیت، نہ کہ ایک قریبی جگہ کا سفرنامہ۔

اگر زمانہ حال اس بات کا متقاضی ہے کہ ماضی کی سمت بندی کی جائے تو ہمارے پاس ایک مرکزائی تاریخ ہے کہ جس کے مسائل ''میہسٹری'' (Mhystory) میں بڑی مشکل سے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح تاریخی تحقیق کو ایک سفر کے طور پر لینے سے ماضی زمانہ حال میں نئے

امکانات اور ادراک کے ساتھ، رخنہ ڈال سکتا ہے اور اسے حدود کے بارے میں بھی آگاہ کر سکتا ہے بلکہ یہ مستقبل کو بھی متشکل کر سکتا ہے۔ مثلاً یہ ہمیں ہماری شناختوں کی حدود کے بارے میں بھی آگاہ کر سکتا ہے اور دیگر لوگوں (کی شناخت) کے بارے میں بھی حساس بنا سکتا ہے۔ اکثر اوقات ماضی زمانہ حال کو اپنے بارے میں ناآشنا بنا دیتا ہے۔ تاریخ میں یہ قوت ہونی چاہئے کہ وہ اپنے اختلافات کے ذریعے، زمانہ حال کو حیران کر دے۔

❁❁❁❁❁

آثاریاتی شہادت بطور قانونی سند

ایم ایس گنیش، رابندرا۔ کے۔ ہزاری، شیریں رتناگر
ترجمہ: نیئر عباس زیدی

چند سیاسی پارٹیاں جن عبادت گاہوں کو ''ہندوؤں کے دوبارہ قبضے'' کا حقدار ٹھہراتی ہیں ان میں ایودھیا کی مسمار شدہ مسجد بھی شامل ہے۔ مختلف عوامل نے چند ماہرین آثار قدیمہ کو مجبور کیا کہ وہ اس بات کا ثبوت منظر عام پر لائیں کہ اس جگہ پر میر باقی کے ہاتھوں مسجد کی تعمیر سے قبل رام مندر کا وجود تھا۔ الہٰ آباد ہائی کورٹ آج کل اس کیس کی سماعت کر رہا ہے جو دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ، اس بات کا فیصلہ بھی کرے گا کہ آیا یہ آثاریاتی دعویٰ درست ہے یا نہیں اور کیا ہندو زمانہء قدیم سے اس خاص مقام پر، اپنے دیوتا رام کی جنم بھومی کی حیثیت سے، عبادت کرتے چلے آ رہے ہیں؟ تنازعہ اس مذہبی حیثیت کا ہے جو اس مقام نے صدیوں سے حاصل کر لیا ہے۔ معاملے نے ایک سطح پر شدت اختیار کر لی کیونکہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ حقیقتاً مسجد کے نیچے کیا چیز موجود تھی۔

ان دستاویزات کو اکٹھا کرنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ ان موجودہ سیاسی کوششوں میں امتیاز پیدا کیا جائے اور سماجی سائنسوں کی حدود میں رہ کر، تاریخی روایات سے از سر نو تاریخ رقم کی جائے، اس دستاویز میں ہم یہ پوچھنے نکلے ہیں کہ جب عدالت میں کوئی تنازعہ زیر بحث ہو تو کس طرح کوئی امتیاز پیدا کیا جائے، جو لوگ خود کو بڑے دھارے کا آزاد خیال دانشور تصور کرتے ہیں، ان کے لئے تجربے کے طور پر، ہمیں عدالت کے رجحان سے متعلق بھی لکھنے کی ضرورت ہے۔

عوامی مفاد کو ملحوظ خاطر رکھ کر اگر کوئی شخص عدالت سے رجوع کرے اور کسی مخصوص عمارت کے بارے میں کہے کہ اس عمارت میں یہ یہ خصوصیات ہیں لہٰذا اس کا شمار آثار قدیمہ میں کیا جائے

تو شاید وہ عدالت اس معاملے میں اپنے عدم اختیار کا اعلان کرتے ہوئے درخواست گذار سے کہے گی کہ وہ متعلقہ حکومتی محکمے سے رجوع کرے لیکن جب متضاد مذہبی دعوؤں کے ساتھ، کسی جگہ پر تنازعہ ہو اور آپ کا مؤقف میرے مؤقف کے برعکس ہو، تو عدالت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ دونوں کا مؤقف سماعت کرے۔ (یہاں ہم یہ بتانے میں تعجیل کریں گے کہ یہ عدالت کا کام نہیں کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ رام کا جنم کس مقام پر ہوا تھا)۔

عدالت میں اس تضاد کے فیصلے کا دارومدار ثبوت پر منحصر ہے۔ کسی بھی مقدمے میں بار ثبوت اس شخص پر ہوتا ہے جو مدعی ہو یعنی وہ جس کے ثبوت کی عدم فراہمی سے کسی بھی فریق کے دلائل نہیں سنے جائیں گے۔ اس خاص مسئلے میں بار ثبوت ان لوگوں پر ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس مسجد کے نیچے ایک مندر تھا اور اسی وجہ سے وہ اس مقام پر دوبارہ مندر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

عدالت کو ہر چیز ثابت کرنے کی ضرورت نہیں مثلاً نافذ العمل قوانین، جغرافیائی حدود اور عدالت کی جاری کردہ سیلس (Seals) وغیرہ۔ لیکن دیگر معاملات میں عدالت مستند کتابوں اور حوالہ جاتی دستاویزات (اکٹھے کرنے) تک رسائی رکھتی ہے۔ یہ عدالت کسی بھی مدعی کے لئے کوئی نوٹس لینے سے انکار کر سکتی ہے تاوقتیکہ وہ اپنے حق میں ایسی کتب یا دستاویزات فراہم نہ کرے۔ ایسی صورت میں نکتہ نظر کے حامل گواہان طلب کئے جاتے ہیں۔ ابتداء میں ان کے دلائل وضاحت سے سنے جاتے ہیں تاکہ متعلقہ شعبے میں مہارت رکھنے کی وجہ سے، ان کے دلائل کا وزن کیا جا سکے۔ تمام دلائل چاہے، ماہرین کے حق میں ہوں یا مخالفت میں، وہ متعلقہ ہی ہوتے ہیں۔ پھر کوئی ماہر ان حقائق کا دانشورانہ تجزیہ سنتا ہے، لیکن معاملہ تو عدالت میں ہے، (تاریخ کے) ناپختہ کار شخص نے فیصلہ صادر کرنا ہے، وہ بھی ایسے معاملات کا جو عدالتی اور تادیبی اہمیت کے حامل ہیں۔

اگر ایک مرتبہ فیصلہ صادر کر دیا گیا اور اس فیصلے کے مندرجات ریکارڈ میں آ گئے تو حقیقی صورت حال متعلقہ دانشوروں کے ہاتھوں سے نکل جائے گی اور قانونی توثیق [1] کے ساتھ، عدالت کے ہاتھوں تاریخ ''از سر نو تحریر'' کی صورت منظر عام پر آ جائے گی۔ تاوقتیکہ کوئی عدالت عظمیٰ اس فیصلے کو رد نہ کر دے یا کسی اور مقدمے کے درج ہونے کی صورت میں اس پر نظر ثانی کا حکم نہ دے یہ ''تاریخ'' ہی شمار ہوگی۔ دانشور اس فیصلے پر صرف تبصرہ ہی کر سکیں گے۔ وہ عدالت کی صادر شدہ تاریخ پر بحث نہیں کر سکتے۔

آنے والے وقت میں ایسے متنازع نتائج نکلنے کے خدشے کے تحت ماہرین (اس مقدمے میں ماہرین آثار قدیمہ [2]) خود کو کہاں کھڑا پاتے ہیں؟ ادھر ادھر زمین کی کھدائی کر کے وہاں سے مطلوبہ اشیاء کے آثار تلاش کرنا، اجلاسوں میں جارحانہ رویہ اختیار کرنا، یا تحریروں کو بطور ثبوت پیش کرنا عدالتی طور پر کارآمد نہیں، اگر یہ ظاہر ہو گیا کہ (مثلاً کھدائی کی اجازت نہیں) یہ تمام مشکوک ہے۔ تاہم صرف تکنیکیات ہی معاملے کا محور نہیں، وہ دانشور جو خود کو اصول پرست سمجھتا ہے اسے بھی خود دریافتگی کے ایک مرحلے سے گذرنا ہوگا۔ نظری یا تقلیدی نوعیت والے معمول کے ضابطوں کی مضبوطی اور کمزوریوں سے نئی آگہی ظاہر ہوگی، کہ جنہیں ویسے ہی درست تسلیم کر لیا جاتا۔ نئے آنے والے سالہا سال سے یہ بات سیکھ رہے ہیں کہ اپنی توضیحات و تشریحات پر اٹھنے والے کڑے سوالات اور چیلنجز کا دفاع کس طرح کیا جاتا ہے۔ لیکن جو بحث دانشورانہ رسالوں، مذاکروں اور میڈیا کی حدود سے باہر نکل جائے تو پھر لوگوں کے اجتماعات کی رائے اور ذہنیت کو درست اور حتمی تسلیم نہیں کیا جاتا یا یہ بھی فرض نہیں کیا جاتا کہ ابتدائی قضیہ تمام لوگوں کے علم میں ہو گا۔ اپنے اعلیٰ تعلیمی و دانشورانہ معیار سے نہ تو وہ اپنے حامیوں سے مخاطب ہیں (''ہمارا گروہ'' یہاں خوش گپیوں کے لئے اکٹھا ہوا تھا بجائے تنقید کرنے کے)، اور نہ ہی ٹیلی ویژن سٹوڈیو میں اپنے مخالفین سے، نہ ہی یونیورسٹی کے بہت سے ''معاملے سے بے بہرہ'' طالب علموں سے۔ اس کی بجائے بحث ان لوگوں کے دائرے میں چلی گئی ہے جو معاملے کی آگہی رکھتے ہیں، تنقید کی صلاحیت رکھتے ہیں، چاہے ماہرین نہ سہی، وہ قانونی ذہن رکھنے والے کہ جن کا تعلیمی معیار، ان کا اکتسابی یا لوگوں اور معاشرے کا عطا کردہ، غیر معمولی ہو، اس کی نوعیت شہادت کی حیثیت رکھتی ہے، اس ثبوت کی حیثیت جو عدالت میں پیش کیا جائے، اندرونی منطق اور دلائل کے معیار کو ترجیح دی جاتی ہے۔

کسی تعلیمی و تدریسی کانفرنس کے برعکس ایک قانونی عدالت کسی مقدمے یا مسئلہ کو ایسے سماعت کرتی ہے کہ ماہر گواہان بھی ایک نئی اور انوکھی صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں گویا ایک طرح کی جنگ۔ جبکہ کوئی بھی یونیورسٹی سیمینار یا ورکشاپ یہ طے کرنے کے لئے منعقد نہیں کروایا جاتا کہ اس مباحثے کا فیصلہ ہوگا کہ ''کون جیتا'' اور ''کون ہارا''، عدالتی فیصلے حتمی ہوتے ہیں۔ ان فیصلوں کے خلاف اپیل کرنے کی بنیادیں بھی محدود ہی ہوتی ہیں۔ اسی طرح دلائل پیش کرنے کے

اصول بھی مختلف ہوتے ہیں۔ عدالت کو آپ کے حقوق و فرائض سے سروکار ہوتا ہے۔ تجربہ کار لیکچرار بھی کسی کلاس یا اجلاس میں بغیر تیاری کے جا سکتے ہیں اور کسی مجمع کے سامنے برجستہ بول سکتے ہیں، سامعین کے سوالات سے پہلو تہی کر سکتے ہیں، رد کر سکتے ہیں، لیکن عدالت میں کسی بھی شخص کو تمام کے تمام سوالات کے جوابات، پابندی کے ساتھ، مکمل، حلفیہ، اور بغیر ٹال مٹول کے دینے پڑتے ہیں۔ یہ ایک مفید سبق ہے کہ کسی (جارحانہ) سوال کا مقابلہ کوئی دوسرا سوال پوچھ کر کیا جائے۔ سیمیناروں کے حلقوں اور کانفرنسوں کے معمول میں یہ ایک پرانی چال سمجھی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ زبان کی درستگی و عمدگی اہمیت اختیار کر گئی ہے جو پہلے کبھی اتنی نہیں تھی۔ عدالت کے اس وقت کا ردعمل تصور کیجئے جب کوئی شخص یہ کہے کہ بازار ایک ایسی جگہ ہے ''جو سیادت و غلبے کو ہم آہنگی سے ملا دیتی ہے اور بیک وقت خواتین کو معلومات کے منبع کے طور پر نمودار کرتی ہے!'' ضابطوں اور عدالتی معاملات سے متعلق پیشہ وارانہ اصطلاحات بھی، مطالبے پر، صحیح اور مختصراً بیان کرنی پڑتی ہیں۔ اور آپ کسی غیر ہنرمند اور غیر متعلقہ شخص سے یہ کہہ کر اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ اگر وہ ان کی پیشہ وارانہ اصطلاح نہیں سمجھ پایا تو مسئلہ اس کے ساتھ ہے [3] مزید برآں، تمثیلی مماثلت اور حکایات کہ جنہیں اساتذہ بڑی مہارت سے اپنے لیکچر میں وضاحت اور موضوع کے پس منظر بتانے کے لئے بیان کرتے ہیں اس کی عدالت میں کوئی گنجائش نہیں۔ عدالت میں تو اختصار ہی اصل روح ہے نہ صرف مزاح کی بلکہ قوت فیصلہ کی۔

تاہم دیکھا گیا ہے کہ کسی تجربہ کار شخص کی گواہی کے سلسلے میں اس کا علم، اس کی ساکھ اور اس کے وکیل کی ہنرمندی کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ کوئی بھی گواہ اپنا مقدمہ اپنی ہی طرز میں پیش نہیں کرے گا۔ بلکہ اپنے وکیل کے مشورے سے اس کی ہدایت کے مطابق ہی عمل کرے گا، جو یہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہے کہ کون کون سے پہلوؤں کو نمایاں کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے اور پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے، کیس کی تشکیل میں کن کن چیزوں کا اخراج ضروری ہے۔ کسی بھی بات کو ٹھکانے لگانے کے عمل میں یقیناً وکیل کی بات اٹل حیثیت رکھتی ہے، بالکل اٹل بھی نہیں کیونکہ اس (بیان) کا ہر ہر لفظ مخالف وکیل کی سخت جانچ پڑتال سے گذرتا ہے۔ وکیل دراصل ایک ''مترجم'' ہوتا ہے جو کسی بھی موقف اور اس کی دانائی کو دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے۔ اگر کوئی ماہر آثاریات اس کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے تو اسے عدالت کے کٹہرے میں اس کی قیمت دینا پڑتی ہے۔ یہ وکیل ہی کا

کام ہے کہ وہ کسی بھی اصولی موقف کو نہ صرف تاریخ میں ختم کر دے بلکہ اس کی ''درآمد'' کو ماپ بھی لے۔

عدالت میں موثر رہنے کے لئے ماہر وکلاء گواہان کا کام، پیشہ اور تجربہ بھی مدنظر رکھتے ہیں کہ آیا انہیں کسی مسئلے پر بولنے پر عبور حاصل ہے یا نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ وہ اس پیشے سے واقف ہوں تا کہ وہ اس کی رو میں بہہ نہ جائیں یا اس کی پیشہ ورانہ اصطلاحات سے خائف نہ ہو جائیں اور اپنے دلائل میں عدم توافق کو فوراً پہچان لیں۔ مزید یہ کہ انہیں اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ اپنی گواہی کے وثوق کا اندازہ لگا سکیں اور اس موقف کے بارے میں بدلتے ہوئے خیالات اور زاویوں سے بھی شناسا ہوں۔ اپنے پیشہ وارانہ کام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، دانشور معاشرتی ماحول میں کام کرتے ہیں۔ وہ بے شمار لوگوں سے تامل برتتے ہیں جن میں ان کے ساتھی، دوست اور سیاسی وابستگی رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ کسی کتاب کے تبصرے میں کوئی بھی شخص کسی بڑے دانشور کو چیلنج کرنے سے گریز کرتا ہے یا، محض دوستی کی وجہ سے، کسی اجلاس کی میز پر کسی غلطی کی نشاندہی سے احتراز کرے۔ کوئی پروفیسر کسی طالب علم کو یہ نصیحت کر سکتا ہے کہ وہ کسی خاص مسئلے کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن اگر ڈاکٹر ''X'' نے کوئی فیچر ایسے لکھا ہے، تو وہ طالب علم اسے وقتی طور پر تسلیم کر سکتا ہے۔ تاہم یہ معاملہ اس کے بالکل مختلف ہے، ایک عدالتی گواہ کی حیثیت سے، اگر ڈاکٹر ''X'' نے کچھ کہا ہے تو یہ یقیناً درست ہے۔ اور یہ کہنا بھی مساوی حیثیت کا حامل ہے کہ ''Y'' بھی اس لئے درست ہے کیونکہ ''X'' نے ایسا کہا تھا۔ تعلیمی حلقے کے باہر کسی بھی سانحے پر بے سوچے سمجھے اور اچانک وفاداریاں، اپنے ساتھ اسی مسئلے کے لئے عدم اتفاق کے لئے ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف دلائل کا سلسلہ بھی چل نکلتا ہے۔ اس کی اساس یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے نتائج کو مفروضے کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دانشوروں کی یہ ذمے داری ہے کہ یا تو وہ خود اس مسئلے کی گہرائی تک جائیں یا اپنے اخذ کئے ہوئے نتائج اور دیگر لوگوں کے اخذ کردہ نتائج میں واضح تفریق کریں۔ اس طرح دانشورانہ طور پر کچھ بہتر نکات عدالت میں سامنے آ سکتے ہیں۔

جب کوئی دانشور اپنے کسی ہم منصب کے لئے کوئی مقالہ پڑھتا یا لکھتا ہے تو اس کے متفرقات بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ اس مقالے کی علمی حیثیت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے اس

مسئلے کو کس انداز میں تعمیر یا تشکیل کیا گیا ہے۔ لیکن عدالت میں یہ متفرقات دیگر لوگ وضع کرتے ہیں۔ دانشور کو تو اس انجانی، کبھی کبھار نا قابل ادراک، صورت حال سے فوری مطابقت کرنا پڑتی ہے۔ اس سارے عمل میں ایک قسم کی اثباتیت میں تاکید سامنے آتی ہے لہٰذا ''بنیادی منبع کی برتری'' ہی سب سے وزنی شمار ہوتی ہے آیئے دیکھتے ہیں کیسے۔

کسی بھی مواد کی تعبیر نو اور کسی شناسا مواد پر نئے تعمیر شدہ نظریات کا اطلاق قابل قبول معمول ہے۔ درحقیقت اس تناظر میں لکھی گئی تاریخ اور آثار قدیمہ کی درجنوں کتابیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن جب ہمیں دوستوں کی وفاداریاں جیتنے کی ضرورت ہو اور اگلی انٹرنیشنل کانفرنس کے منتظمین پر اثر انداز ہونا مقصود ہو تو یہ بات انتہائی مناسب ہوگی کہ ہم کسی بزرگ پروفیسر سے سوال کریں کہ اس نے کسی دیوتا سے متعلق تاریخی ذرائع سے اصل مسودات کا مطالعہ کیا۔ یا یہ کہ وہ پس منظر پیش کر سکتا ہے کہ جس میں تیرتی ہوئی کشتیوں کے لئے ایک ''سنگم'' نظم کیا ناثر رکھتی ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ اپنے ہم منصبوں سے یہ سوال کرنے سے گریز کریں گے کہ آیا انہوں نے اپنے منصوبوں کے مندرجات از خود بنائے ہیں، کوئی بھی ماہر آثار قدیمہ جو اپنے کسی ساتھی کی کھدائی کا معائنہ کرتے وقت اتنی بے تدبیری کا مظاہرہ نہیں کرے گا کہ وہ کسی خندق میں کوئی چھوٹا پتھر پھینک کر دیکھے کہ آیا اس کی کھدائی عمودی ہے یا نہیں، نہ کسی ڈھیر (کی مٹی کو) کو چھانا جا سکتا ہے! اسی طرح دانشور بھی یہ کہہ کر بچ نکلتے ہیں کہ ہمیں نتائج نکالنے سے غرض نہیں۔

اس تمام صورت حال کو عدالت کے نظام کے بالکل برعکس تصور کریں کہ جہاں ایک گواہ ایک نو دریافت شدہ کندہ کاری کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور اس کی ''شہادتی اہمیت'' کے بارے میں حتمی بیان دے۔ اگر یہ بات سامنے آجاتی ہے (حلفیہ بیانات کے دوران) اس شخص نے کبھی کتبہ شناسی یا سنسکرت کا مصدقہ علم حاصل نہیں کیا اور نہ ہی وہ کتبہ کو بیان کرنے کی تعلیمی سند رکھتا ہے تو نتیجہ یقیناً ہزیمت سے بھرپور ہی نکلے گا۔

اسی پس منظر میں ایک اور مسئلہ بھی ہے، اس جگہ یا کھدائی سے بلاواسطہ شناسائی سے متعلق بھی بار بار بحث کی جاتی تا کہ اس کی روشنی میں مستند دلائل سامنے آئیں خاص طور پر ان لوگوں سے جو وہاں موجود تھے اور انہوں نے اس مخصوص جگہ کھدائی کی تھی۔ یہ یقیناً ایک محرومی ہوگی کہ آپ

نے اس کھدائی میں خود حصہ نہ لیا ہو یا خود وہ مسجد اپنی آنکھوں سے نہ دیکھی ہو۔ کیا کوئی گواہ اس جگہ کو اپنے ذہن میں لاسکتا ہے یا اس کے خدوخال دہرا سکتا ہے؟ کیا کسی نے وہ تفصیلات ملاحظہ کیں؟ اگر نہیں تو پھر ماخذ اول کی شہادت کسی کام کی؟

یقیناً اس خاص جگہ کھدائی کرنے والے کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ اکیلا ہی اپنا موقف بیان کرنے کا مختار کل ہو۔ اگر ہم اس منطق کو خاصی دور لے کر چلتے تو ہمیں یہ احمقانہ بیان دینا پڑتا کہ پروفیسر ''X'' کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جنوبی دکن کے کلاں سنگ پر کوئی کتاب شائع کرے، کیونکہ اس نے خود اس میں سے درجن سے زیادہ پر کھدائی نہیں کی (ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے)۔ تیسرے یہ کہ ہندوستانی آثار قدیمہ کی تاریخ میں جوش و جذبے سے کیا گیا کام حجتی نوعیت کا ہے۔ اس کام میں 1960ء کی دہائی میں کاٹھیاواڑ کے مقام پر کئے گئے آثار قدیمہ کے سروے کے بنیادی، تنقیدی تحقیق پر مبنی نتائج تھے مزید یہ کہ کوسنبی (الہ آباد کے قریب واقع عہد آہن کے آثار) کی تاریخ وار تحقیق جس کی بنیاد شائع شدہ شقوں اور طبقات شناسی پر ہے، بھی شامل ہے۔ یہ دونوں تنقیدی تحقیقات ان دانشوروں نے کی ہیں جنہوں نے خود کبھی بھی مہم جوئی، کھدائی یا تشریحات از خود نہیں کیں۔

اس بات کی برتری کہ ''جو وہاں موجود تھا'' عدالت میں زیادہ عرصہ تک نہیں برقرار رہ سکے گی۔ ہم مثبت بنیادوں پر مشتمل منطق کو انتہاء تک نہیں لے جاسکتے۔ بہرحال پوری دنیا میں کام کرنے والے ماہرین آثار قدیمہ اس بات سے واقف ہیں کہ کسی بھی سائیٹ کے ڈائریکٹر عموماً اس خاص وقت موقع پر موجود نہیں تھے جب کوئی اہم کھنڈر دریافت ہوا[4] لہٰذا انہوں نے طبقات شناسی پر مبنی اپنا ہی سیاق وسباق خود نہیں ملاحظہ کیا ہوتا (آثار قدیمہ میں آخر الذکر، گھر کا فرش یا پھر گڑھا، اس اعداد وشمار کا ایک اہم جزو ہے)۔

اسی طرح اگر کوئی ماہر آثار قدیمہ کسی ایسی جگہ پر کئی روز بعد جائے کہ جہاں کوئی اتفاقی دریافت ہوئی ہو، تو یہ ایسا ہی ہے کہ ''وہ وہاں موجود نہیں تھا'' کیونکہ سیاق وسباق تو ہاتھ سے جاتا ہی رہا۔ کوئی بھی پیشہ ور فرد ایسا نہیں جو اس خاص جگہ کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر سکے، یہ محض سنی سنائی ہی ہے، اس کے بعد عدالت میں اعداد وشمار جمع کرنے اور اس کی بازیابی کے آفاقی تعمیر شدہ طریقہ کار ہیں وہ بنیادی مسائل بدقسمتی سے اعلیٰ سطح کی بحث میں نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ جن پر

سوالات کا سلسلہ بنتا ہے یہ کسی بھی ایسے شخص کے لئے جو عدالت میں گواہی دے رہا ہو، ایک خوش آئندہ قسم کی آگہی پیدا کر سکتی ہے۔

وہ مواد ایسے طریقوں سے حاصل کیا جائے جو اعداد و شمار حاصل کرنے والے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر حاصل کیا گیا ہو خاص طور پر ان بنیادی اصولوں سے انحراف جو آثار قدیمہ کے حوالے سے آفاقی سطح پر رائج ہیں وہ گواہی کے طور پر قابل قبول نہیں ہوں گے۔ مزید یہ کہ سماجی سائنسز میں ہم مسلسل یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم حتماً کسی چیز کو ثابت نہیں کر سکتے کیونکہ ہم گذشتہ صورت حال کا تجربات سے نقش ثانی نہیں بنا سکتے۔ تاہم سماجی سائنسدان اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ کسی بھی مفروضے اندرونی عدم توافق کو منظر عام پر لا کر یا اس کے اصولیاتی اور شہادتی نقص کو مدنظر رکھتے ہوئے رد کیا جا سکتا ہے یا جب کوئی نئی تحقیق کوئی نئے نتائج سامنے لائے۔ لہٰذا کوئی ایسا ہی نتیجہ سامنے آ سکتا ہے جسے آثار قدیمہ کے سنجیدہ طلباء قبول کر لیں۔

کسی عدالت میں کوئی تصدیق کرنا یقیناً جدت پسندوں کے لئے بری خبر ہوگی، ان کے لئے جو اجلاسوں کے دوران گرما گرم بحث شروع ہونے پر اپنے ناقدین سے متفق ہونے کے عادی ہیں۔ تمام تاریخ دانوں نے کسی نہ کسی وقت اپنے طلباء کو تاریخ کی بدلتی ہوئی تمثیلوں اور ابتدائی مفروضوں میں تبدیلیوں سے متعلق ضرور بتایا ہوگا، لیکن عدالت کو یہ باور کرانا مشکل ہوگا کہ ان کا اپنا موقف اور مخالف پارٹی کا موقف دونوں درست ہیں۔ جب کہ شک، گمان اور معقول قسم کا استدلال سماجی سائنسز کی منطق کے لازمی جزو ہیں، لیکن ہمیں، اینڈرے بیٹیلی کے الفاظ میں ''حقائق کے سلسلے میں ایک اصول پسندانہ، نہ کہ خواہش پرستانہ رویہ درکار ہے۔'' یہاں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ ''رامائن'' کے تنقیدی ایڈیشن کو سند کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس خاص جگہ کی کھدائی کرانے اور اس کے نتائج سنانے کے لئے یقین کلی اور اعتماد کی ضرورت ہے اور یہ کہ طبقات شناسی کا تناظر مختلف نظریات کو قبول نہیں کر سکتا۔

سیاسی طور پر متحرک تشریحات ہمیشہ لفظ پرستانہ ہوتی ہیں۔ اس پر عمل پیرا لوگ نظریات، خیالات اور فکر کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ ان کے مخالفین کے پاس بنیادی کھدائی کا تجربہ سہی، لیکن ''شمالی ہندوستان'' میں، بلکہ پوری گنگا کی پٹی میں مستند آثاریاتی شہادت موجود نہیں۔ وہ اصولیات پر مبنی سوچ نہیں رکھتے، وہ اصولیات جو آثاریاتی اعداد و شمار و

دریافت پر مبنی ہیں وہ نہ تو جغرافیائی حد بندی پر مشتمل ہیں اور نہ ہی ثقافتی جماؤ رکھتے ہیں۔

یہ بات محض لفاظی پر مبنی ہے کہ وہ خاص جگہ جہاں اس خاص حکمران کا کتبہ دریافت ہوا تھا وہ وہی ہے کہ جہاں پر اس حکمران نے تعمیر کروائی۔ لفاظی، اس لئے کہ ان وجوہات سے متعلق سوالات نہیں کئے گئے کہ اس کتبے کو وہاں نصب کیوں کیا گیا تھا یا اسے اس جگہ چھوڑا کیوں گیا۔ یہ استدلال تو ایسا ہے کہ جیسے کوئی کہے ''کتاب میز پر پڑی ہے، کتاب میری ہے، لہٰذا میز بھی میری ہے جبکہ عدالتی نظام ان ''رشتوں'' اور روابط'' کو اہم گردانتا ہے جو قرائنی شہادت کے مختلف ٹکڑوں کے درمیان ہیں۔

ثبوت کے تصور کو بھدا کرنے کے علاوہ، قواعد کو بالائے طاق رکھ کر بڑے پیمانے پر رجعت پسندانہ منصوبے بھی عمل میں لائے گئے (جیسے آریائن مسئلے میں تاریخی لسانیات اور ان مضامین کو بالائے طاق رکھا گیا جو ان کے مخصوص نظریات کو رد کرتی تھیں۔ جامعی اجلاسوں میں زیادہ اثر و رسوخ رکھنے والے مقررین کو، دیگر مقررین کی نسبت، زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن عدالتی نظام نسطحی سطح کا ہوتا ہے۔ عدالتی کارروائیاں دستور، نظم وضبط اور ایک طرح اخلاقیات کی پابند ہوتی ہیں، دونوں فریقین کو برابری کی سطح پر مواقع فراہم کرنے کی کوشش میں عدالتیں وہ ادارے ثابت ہوسکتی ہیں کہ جس میں صاحب اختیار لوگوں کی دشواریاں پیش کی جاسکیں۔ ہم یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ عدالت کے تجربات کا ایک بڑا نقصان ابہام پیدا کرنے والوں، نظر ثانی کنندگان اور سچ کو منضبط کرنے والوں کا جھکاؤ ہے تاکہ وہ غیر دانشور افراد کی عدم معلومات کو اپنے ذمے لے سکیں اور یہ یقین کرواسکیں کہ وہ اس طرح جھوٹ وفریب سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ چند بااثر اور سیاسی عمائدین کی یہ عادت دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ معاملے سے پہلوتہی اختیار کرتے ہیں اور خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ ''ناقابل تردید دعوؤں'' کی دریافت سے متعلق بلند و بانگ دعوے، محض عادتاً، بار بار دہرائے گئے۔ وہ لوگ جو تحکم پسند صورت حال میں ہیں ان کے لئے یہ ایک صدمہ ہوگا کہ ان کے حتمی بیانات پر عدالت میں جرح کی جائے۔

جہاں تک مرکزی پیشہ ور لوگوں کا تعلق ہے ہم امید کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹس طلباء کے درمیان، نظریہ ثبوت کے غلط استعمال اور نام نہاد پراسرار عقائد میں پناہ لینے کے خطرات سے متعلق، آگہی پیدا کریں گے۔ اور یہ کہ پیشہ وارانہ تاریخ اور آثار قدیمہ کی ساکھ کو بھی کوئی

نقصان نہیں پہنچائیں گے کہ نظریاتی لوگ اپنے ہی پیشے کی چالبازیوں پر ہنسیں۔ اور پھر ہم از سر نو ایک حقیقی آزاد جذبے پر زور دے سکیں۔ جس کا آغاز خود احتسابی سے ہو ایسی خود احتسابی جو ایسی چیزوں پر ہو کہ لوگ ''دوستی'' کے نقطہ نظر سے کیا دیکھتے ہیں اور جس کے دروازے تنقید کے لئے کھلے ہوں جو مکتبہ نظر پر مبنی ہو۔

اگر ایک مرتبہ کوئی نظری مباحثہ عدالت کے دائرہ اختیار میں آ جائے تو وہ متعلقہ نظریاتی اصول وقواعد کی حدود وقیود سے باہر آ جاتا ہے اور عدالتی عمل داری کے تحت فیصلے کا منتظر ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں حقائق پر مبنی شہادتی دلائل کا ایک خاص مافی الضمیر ہوتا ہے۔ ماہرین شعبہ (آثار قدیمہ) یہ سوچ سکتے ہیں کہ ان کی بات حرف آخر ہوگی، لیکن عدالت میں ان کا موقف دستاویزی ثبوت اور ماہرین کی رائے کے مراحل سے گذرے گا۔ لہٰذا حقیقتاً، عدالت کا حرف آخر ہی حرف آخر شمار ہوگا۔

حوالہ جات

1- یہ بھی یقین ممکن ہے کہ عدالت معاملے کو یوں نمٹا دے کہ ان متضاد اور متفرق دلائل سے کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکل سکتا، لہٰذا یہ مقدمہ خارج کیا جاتا ہے۔

2- یہ دلیل کہ اس مقام پر مسجد تعمیر کرنے کی غرض سے مندر کو منہدم کیا گیا تھا، اور یہ دلیل کہ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں، دونوں یقینی طور پر آثاریاتی نوعیت کی ہیں۔

3- یہ ایک بچاؤ کا حربہ ہے جسے اکثر ماہرین آثار قدیمہ تاریخ دانوں، جغرافیہ دانوں اور سماجی سائنسز کے دیگر ماہرین کی موجودگی میں استعمال کرتے ہیں۔

4- ہندوستان کے آثار قدیمہ کے سروے نے یہ بات ضروری سمجھی کہ وہ ایک شق شامل کرے، جس میں کھدائی کی اجازت شامل ہے، اس میں زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ فیلڈ ڈائریکٹر کھدائی کے دوران زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ موقع سے غیر موجود رہ سکتا ہے۔

❁❁❁❁❁

انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بنیادی عوامل

اشفاق سلیم مرزا

انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا مکمل احاطہ کرنا میرے لئے یہاں ممکن نہیں۔ اس لئے میں اُن بنیادی عوامل تک خود کو محدود رکھوں گا جن کا اس انجمن کے قائم ہونے میں بہت اہم کردار ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ کوئی بھی وقوعہ اور کسی بات کا ہونا اگر اچانک بھی سامنے آ جاتا ہے تو وہ کوئی انہونی بات نہیں ہوتی۔ بلکہ ہمارے سامنے فوری طور پر اس کے وہ پہلو مخفی ہوتے ہیں جو اُس کے شکل پذیر ہونے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین کا وقوع پذیر ہونا اُن واقعات میں سے نہیں ہے کہ جس پر کوئی حیران ہو۔ بلکہ اُس کے وجود پذیر ہونے میں بہت ہی واضح اقتصادی، سماجی اور سیاسی عوامل کارفرما ہیں جو 1930ء کی دہائی میں اور اس سے پہلے ہندوستان میں نہ صرف مقامی سطح پر بلکہ اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے خارجی حالات کے ساتھ پوری طرح جُڑے ہوئے تھے۔ تو آیئے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں اس تحریک کے آغاز میں کن عوامل نے بنیادی کردار ادا کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر جنوبی ایشیا میں اس تحریک کے آغاز میں تین عوامل نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

اولاً: نوآبادیاتی نظام اور مغربی نظریات کا متعارف ہونا

دوئم: بالشویک انقلاب کے حوالے سے فکری تبدیلی

سوئم: دنیا بھر میں آزادی کی تحریکوں کے ثمرات

نوآبادیاتی نظام کے بہت سے منفی اور مثبت پہلو ہوتے ہیں۔ گو روشن خیالی اُس کے ایجنڈے میں شامل نہیں ہوتی۔ لیکن کسی پسماندہ سماج میں ایک نوآبادیاتی ترقی یافتہ سماج کی تخم ریزی اور روابط غیر ارادی طور پر وہ کام کر جاتے ہیں۔ جو بعد ازاں نوآبادیاتی نظام کی نفی پر منتج ہوتے ہیں۔

ایسا ہی ہندوستان کے سماج کے ساتھ ہوا کہ ہندوستان میں جدید مغربی تعلیم سے آراستہ نوجوان ایک ایسے شعور سے لیس ہوئے، جو قوم پرستی کے جذبے سے معمور تھا اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف صف آرائی کر رہا تھا۔

جیسا کہ مارکس نے ہندوستان کے متعلق اپنے ایک مراسلے میں کہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں سماجی انقلاب لانے کے سلسلے میں انگلستان کے محرکات ذلیل ترین تھے اور اُس کا اِن ذلیل مفادات کو ہندوستان پر ٹھونسنے کا طریقہ بھی بہت احمقانہ تھا۔ لیکن سوال دراصل یہ نہیں ہے سوال یہ ہے کہ آیا ایشیا کی سماجی حالت میں ایک بنیادی اِنقلاب لائے بغیر اِنسانیت اپنی تقدیر کی تکمیل کر سکتی ہے۔ اگر نہیں کر سکتی تو اِنگلستان کے جرائم خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں، اُس نے بہرحال اِس اِنقلاب کو لانے میں تاریخ کے غیر شعوری آلہ کار (Unconscious tool of history) کا کام انجام دیا ہے۔

یہ عجب اِتفاق ہے کہ جب مارکس ہندوستان میں سماجی انقلاب کی بات کر رہا تھا اُسی زمانے میں غالب نے کلکتے میں جن تبدیلیوں کا سامنا کیا وہ اِس بات کی تصدیق کر رہی تھیں کہ یہاں ہندوستان میں زیرک نظر لوگ اِن بدلتی ہوئی کیفیات کو محسوس کر رہے ہیں۔ غالب نے اپنے دوست علی بخش رنجور کے نام ایک خط میں اور ایک فارسی غزل میں اِس نئی تہذیب کو کچھ اِن الفاظ میں بیان کیا تھا۔

کلکتہ ایک بارونق اور خوبصورت شہر ہے، یہاں ہر پیشے کے کاریگر موجود ہیں، آپ بازار سے تقدیر کے علاوہ ہر چیز خرید سکتے ہیں۔ کلکتے کی خاک پر بیٹھنا تخت پر بیٹھنے سے بہتر ہے اور اگر خاندانی مسائل کے بارے میں اِس قدر تشویش نہ ہوتی تو سب کچھ چھوڑ کر یہیں کا ہو رہتا۔۔۔ انگریزوں نے ایسے قوانین اور آئین کا اجراء کیا ہے۔ جو پہلے سننے میں نہ آیا تھا۔ فنون میں فنکاروں نے وہ کمال حاصل کیا کہ اپنے بزرگوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ آئین کی پاسداری اِسی قوم کا حق ہے۔ اِن سے زیادہ اِنتظام و انصرام کو کوئی نہیں جانتا۔ اُنہوں نے حکومت اور اِنصاف کے بَل بوتے پر ہندوستان میں قانون کی عمل داری کو سوگنا بڑھا دیا ہے۔ لوگ پتھر سے آگ جلاتے ہیں۔ جبکہ انگریز تنکے (دیا سلائی) سے آگ پیدا کرتے ہیں۔ اِنہوں نے پانی کو رام کر لیا ہے اور اِس میں کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں۔ اُن کے آگے پانی اور طوفان بے بس نظر آتے ہیں۔ انہوں نے الفاظ کو پر لگا دیئے ہیں۔ ایک پیغام چند لمحوں میں 200 میل دور پہنچ جاتا ہے۔ وہ ہوا (گیس) کو آگ لگا دیتے ہیں جو

کوئلوں کی طرح جلتی ہے۔ اُن کے دستور میں سینکڑوں دساتیر سموئے ہوئے ہیں۔ اے میرے دوست! کیا تمہارے دستور میں بھی ایسی ہی عمدہ باتیں ہیں۔ مردہ لوگوں کی پوجا کرنا وقت گزاری کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ تمہارا دستور محض لفاظی ہے۔

ظاہر ہے کہ مغل اشرافیہ جیسے ٹھہراؤ کے مقابلے انگریزوں نے جو نئی چیزیں متعارف کروائیں وہ نہ صرف پیداواری رشتوں کو بدلنے میں ممد و معاون ثابت ہوئیں بلکہ کچھ حد تک شہری مراکز میں نئے اداروں کو بھی قائم کرنے میں اُن کا اہم کردار رہا۔ یعنی یہ ایک دوہرا عمل تھا۔ یعنی پرانے زمانے کی اکھاڑ پچھاڑ اور نئے زمانے کی آبیاری۔ اِس بات کو مارکس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ ہندوستان میں اِنگلستان کو ایک ہی سلسلے کے دو مشن انجام دینے ہیں۔ ایک تخریبی اور دوسرا حیات بخش۔ قدیم ایشیائی سماج کو ختم کرنا اور ایشیا میں مغربی سماج کے لئے مادی بنیاد فراہم کرنا۔ میرے خیال میں یہ دونوں کام ہی ادھورے رہ گئے ہیں۔ نہ تو پرانے نظام کا مکمل طور پر خاتمہ ہو سکا۔ اور نہ ہی نیا نظام پوری طرح اُس کی جگہ لے سکا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے سیاسی اُفق پر کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جو بین الاقوامی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کے زیرِ اثر تھیں۔ بالشویک انقلاب نے جہاں دنیا بھر کی آزادی کی تحریکوں کو متاثر کیا وہاں ایک نئے نظام کی راہ بھی دکھائی۔ ایک ایسا نظام جو مساوات اور برابری کی بنیاد پر روٹی، کپڑا اور مکان کی ضمانت دیتا تھا، جو نئی اقدار سے لیس اُبھرتے ہوئے طبقے یعنی پرولتاریہ کو حکمرانی کی طرف رواں دواں کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ ایک ایسا نظام تھا جو اس سے پہلے نو آبادیات میں متعارف نہیں ہوا تھا جس کے نئے پن اور حسین مستقبل کا کچھ ایسا سحر تھا جیسے گلفام کو سبز پری مل جائے۔

ہندوستان میں اکتوبر 1917ء کے انقلاب سے پہلے بھی ایک ایسی فضا بن رہی تھی جو بالشویک انقلاب کو قبول کرنے کے لئے تیار تھی۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک میں اس سے پہلے بھی اندرونی سطح پر کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں خصوصاً کانگریس کا رویہ سیاست کی طرف اعتدال پسندانہ تھا اور جمہوری اور آئینی طریقے اپنا کر آزادی کی طرف گامزن ہونا چاہتی تھی۔ اُس کی رہنمائی اعلیٰ طبقات کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے وہ عوام کے نچلے طبقات کو اپنے ساتھ چلانے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ اُن سے نالاں نوجوان طبقہ بھی اُن کی سیاسی پالیسیوں، دھیمے پن اور میانہ روی سے اُکتا چکا تھا۔ اِس کے باوجود برطانوی حکمران

کانگریس کے بعض رویوں سے اس قدر خوش نہ تھے اس لئے تشدد کی طرف مائل کانگریس کے نوجوان عناصر نے اپنی ایک الگ پہچان کو منوانا شروع کیا اور وہ دھڑا کانگریس کی مروجہ پالیسی سے علیحدہ حکمتِ عملی اپنانے لگا۔ برطانوی حکمرانوں نے اس بات کو بھانپتے ہوئے 1897ء میں ہندوستانی پریس اور انتہا پسندوں کے خلاف سخت رویہ اپنانا شروع کیا۔ لیکن ساتھ ساتھ برطانوی حکمران کانگریس کے سرکردہ رہنماؤں کی بھی سرزنش کرنے لگے۔

جارج ہملٹن سیکرٹری آف سٹیٹ نے دادا بھائی نوروجی سے 1900ء میں کہا تھا کہ آپ خود کو برطانوی حکومت کا مددگار قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف برطانوی طرزِ حکومت کی طرف آپ کا رویہ معاندانہ بھی ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ رویہ حکومت چلانے کے لئے ضروری بھی ہے۔ اسی طرح لارڈ کرزن نے 1905ء میں گھوکھلے کو کہا تھا "یہ تو گھوکھلے کو دکھائی نہیں دیتا کہ وہاں کیا غلط ہے اگر اُسے یہ پتہ ہے تو وہ بددیانت ہے۔"

یہ صورتِ حال دیکھ کر کانگریس کے انتہا پسند عناصر نے ایسی کارروائیاں شروع کر دیں جو برطانوی حکومت کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ اس پر برطانوی حکومت نے انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں میں اختلاف پیدا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس کے آثار سودیشی اور بائیکاٹ تحریکات کے دوران واضح ہونا شروع ہو گئے۔ 7-1905ء میں بنگال کی تقسیم کے دوران یہ اختلاف مزید شدت اختیار کر گئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ Aurobindo Ghose اربندو گھوش نے، جو انتہا پسندوں کے لیڈر تھے، یہ خیال کیا کہ اب اعتدال پسندوں کے ساتھ مل کر کام نہیں کیا جا سکتا۔ اربندو گھوش فیروز شاہ مہتہ اور تِلک کی قیادت میں انتہا پسند گومگو کی حالت میں رہے۔ اُن کے سامنے کانگرس میں رہنے یا نہ رہنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ لیکن تِلک بھی کوئی ایسا قدم اٹھانے میں انتہائی محتاط تھے کہ جس سے کانگریس ٹکڑوں میں بٹ جائے۔

لیکن 1907ء میں سورت کانفرنس کے بعد حکومت نے انتہا پسندوں پر سختیاں شروع کر دیں۔ تِلک کو 6 سال کے لئے مانڈلے جیل بھیج دیا گیا اور گھوش کو ایک انقلابی سازش میں دھر لیا گیا۔ لاجپت رائے ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن بنگال کے نوجوانوں نے انقلابی تشدد کی راہ اپنائی۔ اُنہوں نے غیر ملکی کپڑوں، عدالتوں اور تعلیم کا بائیکاٹ شروع کر دیا۔ وہ راست اقدامات کے لئے بھی تیار ہو رہے تھے لیکن غیر منظم ہونے کی وجہ سے وہ فوری طور پر عمل نہ کر سکے۔ اُن کے لئے اُس وقت کسی منظم جماعت کا ہونا ضروری تھا جو اُن کی اس راہ کو کسی ڈھنگ سے چلا سکتی۔

لیکن اس دوران مارکس اور اشتراکیت کا ذکر بھی کسی نہ کسی حوالے سے ہندوستان میں متعارف ہو رہا تھا۔ نئی تحقیقات کے مطابق کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے مارکس کا حوالہ بال گنگا دھر تلک نے 1881ء میں دیا جب اُس نے دولت کے ارتکاز کو مارکس کے الفاظ میں محنت کا نتیجہ قرار دیا۔ لیکن مارکس پر پہلا مکمل مقالہ رامانند چٹھوپادھیائے کے رسالے ''ماڈرن ریویو'' میں 1912ء میں لکھا گیا۔ اُس کا عنوان ''Karl Marx A Modern Rishi'' اس کا مصنف ہردیال تھا جو کہ امریکہ میں غدر پارٹی کے بانیوں میں سے تھا۔ لیکن مارکس کی پہلی سوانح عمری رام کرشن پالی نے ملیالم میں لکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اکتوبر انقلاب کے بعد جو پہلے ہندوستانی لینن کو 23 نومبر 1918ء میں ماسکو میں ملے اُن کا نام عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری تھا۔ 25 نومبر 1918ء کو انہوں نے ماسکو میں بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم سات کروڑ مسلمانوں کی طرف سے اس انقلاب پر آپ کو مبارکباد دیتے ہیں اور یہ کہ روسی انقلاب ہمیں حریّت کی راہ دکھاتا ہے۔

اِس دوران ہندوستان میں صنعتی مزدوروں کی تعداد میں دِن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ Lord Chelms Ford نے برطانوی حکومت کے نمائندے کے طور پر لیگ آف نیشنز میں بیان دیتے ہوئے اکتوبر 1922ء میں کہا تھا کہ ہندوستان میں اس وقت دو کروڑ کے قریب اُجرت پر کام کرنے والے مزدور ہیں۔ یہ بیان بہت حد تک مبالغہ آرائی پر مبنی تھا۔ 1931ء کی شماریات کے ایک کھلے اندازے کے مطابق اُن کی اصل تعداد پچاس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ گو بعدازاں اصل تعداد 35 لاکھ بھی بتائی گئی۔ فیکٹری ایکٹ کے شماریات کے مطابق 1922ء میں کل فیکٹریوں کی تعداد 5144 تھی جن میں کل 13 لاکھ 61 ہزار 2 رجسٹرڈ شدہ مزدور کام کر رہے تھے۔ 1933ء میں فیکٹریوں کی تعداد بڑھ کر 8,831 ہوگئی جبکہ مزدوروں کی تعداد 16 لاکھ 10 ہزار 932 ہوگئی۔

مزدوروں کی اتنی بڑی قوت کو کسی راہ پر لگانے والا کوئی منظم ادارہ موجود نہ تھا تاوقتیکہ 17 اکتوبر 1920ء کو تاشقند میں سات ارکان یعنی ایم این رائے، محمد علی، محمد شفیق، ابانی مکرجی، Evelyn Trent Roy، Rosa Fitingov اور اچاریہ شامل نے مل کر کمیونسٹ پارٹی CPI کی بنیاد رکھی۔ بعدازاں 1922ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا قیام عمل میں لایا گیا اس کے قیام کے وقت لالہ لاجپت رائے نے صدارتی خطبے میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا ''ہندوستان کے محنت کشوں کو مکمل سطح پر منظم ہونے کے لئے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ اس ملک میں سب

سے بڑی ضرورت تنظیم، احتجاج کرنے اور شعور حاصل کرنے کی ہے۔ ہمیں اپنے محنت کشوں کو منظم کرنے اور طبقاتی شعور سے لیس کرنے کی ضرورت ہے۔'' اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ ''آنے والے وقتوں میں اُنہیں کچھ عرصہ کے لئے ایسے دانشوروں سے مدد اور رہنمائی درکار ہوگی جو کہ اُن کے مقصد کو لے کر آگے چلنے کے لئے تیار ہوں گے۔ بالآخر محنت کش اپنی تحریک سے ہی اپنے راہنما پیدا کر لیں گے۔'' سچ بات تو یہ ہے کہ اس سے بہت پہلے بنگال کے اخبار Bengal's Spectator نے چارٹسٹ تحریک کے بارے میں نومبر 1842ء میں لکھا تھا کہ وہ نہ صرف اُجرت بڑھانے کے لئے بات کر رہی ہے بلکہ نئے عوامی چارٹر تیار کر رہی ہے۔ 17 نومبر 1917ء کو کلکتہ کے اخبار دانک باسومتی نے لکھا تھا کہ زارِ شاہی کے زوال کے ساتھ ہی ہندوستان میں بیگانہ نوکر شاہی کی تباہی کا دروازہ کھل گیا ہے۔ اس دوران قوم پسند رہنما پن چندر پال نے کلکتہ کے کالج سکوائر میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا ''دنیا بھر میں ایک نئی طاقت اُبھر کر سامنے آئی ہے جو عوام کی طاقت ہے۔ اور وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ عوام کو آزاد کرنے کا حق دلا رہے ہیں جہاں وہ اونچے طبقات کے استحصال اور جبر کے چنگل سے آزاد ہو سکیں۔'' زیرِ تراست انقلابیوں نے بھی اس انقلاب سے بہت اثر قبول کیا۔ 1919ء میں قاضی نذرالاسلام نے ایک کہانی ''بہتر دیس'' لکھی جس میں ایک کردار سرحد پار کرنے کے بعد سوویت یونین میں داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں سرخ فوج کا ایک سپاہی بن گیا ہوں۔ سرخ فوج کو یہ یقین ہے کہ اُن کا نیک آدرش تمام دنیا کے لوگوں کے ذہنوں میں سما رہا ہے اور میں بھی اُس بڑی تنظیم کا ایک رکن ہوں۔ لالہ لاجپت رائے نے 31 جنوری 1919ء کو ہوم رول لیگ، امریکہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا ''میرے پاس سوشلزم کے مطالعے کے لئے وقت نہیں ہے اور نہ ہی مجھ میں یہ جرأت ہے کہ میں ایک بالشویک بن سکوں۔ بالشویزم صحیح ہے یا غلط یا دانشورانہ سطح پر یہ جھوٹ ہے یا سچ، پھر بھی مجھے لوگوں کی نجات کے لئے یہی ایک راستہ نظر آتا ہے۔''

اکتوبر 1920ء میں بعد ازاں تاشقند میں ایک ملٹری سکول کا قیام عمل میں لایا گیا جس میں شوکت عثمانی اور رفیق احمد بھی شامل تھے۔ جنہوں نے بعد میں یونیورسٹی آف دی ٹائلرز آف دی ایسٹ ماسکو میں داخلہ لے لیا۔ لیکن جو لوگ تاشقند سے یونیورسٹی میں گئے اُن میں بہت سے ایسے بھی تھے جنہیں ہم بخوبی جانتے ہیں۔ اور ایک دو سے تو میری ملاقات بھی ہوئی ہے۔ جیسا کہ دادا فیروز الدین منصور، فضل الٰہی قربان، فدا علی، عبدالقادر صحرائی اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ اِن میں سے

زیادہ تر کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ تاشقند میں پارٹی بننے کے بعد اشتراکیوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ بننا شروع ہو گئے خصوصاً بمبئی، کلکتہ، مدراس، کانپور اور لاہور میں یہ دیکھنے میں آئے۔

پشاور، کانپور اور میرٹھ سازش مقدموں کے دوران اشتراکی کارکنوں پر کڑا وقت تھا اور وہ ایک سخت کوش عمل سے گزر رہے تھے۔ ان سب واقعات نے جلیانوالہ باغ سمیت برطانوی سامراج کے خلاف نئے محاذ کھول دیئے۔ کارکن اور لکھاری ایک نئے جذبے کے تحت اشتراکیت کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ 1927ء سے لے کر 1929ء تک قوم پرستوں اور کمیونسٹوں نے بڑے پیمانے پر ملک گیر ہڑتالوں میں حصہ لیا۔ کیونکہ AITUC نے ٹریڈ یونین کارروائیوں کو اپنے مینوفسٹو میں سیاسی عمل کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ اُنہوں نے مئی ڈے اور لینن ڈے بھی منانا شروع کر دیئے۔ سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ نہ لینے کے فیصلے نے بائیں بازو کی تحریک کو کچھ حد تک نقصان پہنچایا لیکن بعد ازاں بائیں بازو کی جماعتوں نے دوبارہ قومی سیاست میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔

دنیا میں ہر جگہ حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ جاپان کا چین پر حملہ اور منچوریہ پر قبضہ ایشیائی ترقی پسندوں کے لئے لمحہ فکریہ تھا۔ اس طرح سپین کی خانہ جنگی میں جس میں کرسٹوفر کارڈول اور رالف فاکس فسطائیت کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے، فرض کے لئے جان دینے کی راہ دکھاتے تھے۔ جون 1935ء میں ادیبوں کی ایک تاریخ ساز بین الاقوامی کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی۔ جس میں میکسم گورکی، روماں رولاں، آندرے ژید، ایلیا اہرن برگ، بورس پیسٹرناک، پال ایلوا اور لوئی اوراگاں بھی شامل تھے۔ اس میں ہندوستان نے بھی حصہ لیا۔ ہندوستان کی مندوب صوفیہ وادیا تھیں۔ سامعین میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند بھی شامل تھے۔ (خلیق ابراہیم خلیق)

اس طرح 33-1929ء میں دنیا بھر کے معاشی بحران نے افریقہ اور ایشیا میں نوآبادیت کے خلاف تحریکات کو جنم دیا۔ مصر، انگولا، بلجیم، کانگو میں صنعتی مزدوروں نے بڑے پیمانے پر ہڑتالوں میں حصہ لیا۔ حبشہ کی اطالوی فسطائیت کے خلاف دفاعی جنگ نوآبادیاتی جدوجہد کی روشن مثال تھی۔ ہزاروں گوریلا سپاہی رضا کارانہ طور پر فسطائیوں کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے جن میں حبشہ، صومالی لینڈ اور شمالی افریقہ کے لوگ سرِ فہرست ہیں۔

اس طرح ایشیا میں کمیونسٹ تحریکوں کو بہت مدد ملی۔ انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی کا قیام

1920ء میں عمل میں آیا۔ 1921ء میں چین کی عظیم پارٹی قائم ہوئی جبکہ انڈوچائنا، ملایا اور فلپائن میں 1930ء میں اُن کی بنیاد رکھی گئی۔ 1920ء سے لے کر 1930ء تک نوآبادیت کے خلاف تحریکات کا دور تھا۔ 27-1926ء میں ملایا اور برما میں وسیع پیمانے پر ہڑتالیں ہوئیں جبکہ چین، ویت نام اور فلپائن میں کسان اپنے حقوق کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس طرح 1932ء میں تھائی لینڈ میں بورژوا انقلاب کے آثار نمایاں ہوئے۔

لیکن اس دوران ہندوستان کے نوجوان جو انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے اُنہوں نے 1930ء کی دہائی میں پہلا منظم گروپ قائم کیا۔ لیکن اس سے پہلے 22-1920ء کے دوران ہندوستانی بحری جہازوں پر کام کرنے والے مزدوروں کے کچھ ایسے گروپ تھے جو خود کو کمیونسٹ کہتے تھے۔ پہلے دانشوروں کے گروپ میں ڈاکٹر زین العابدین احمد، ڈاکٹر اشرف، شوکت عمر، سجاد ظہیر، محمود الظفر ، نہار ریندو دتا، موجمدار، نرمل سین، پرموداس گپتا، کامریڈ شاہانی، گوپال اور لیاقت علی خان کے کزن امتیاز علی بھی شامل ہو گئے۔ رالف فاکس نے ان کی تربیت شروع کر دی اور 1932ء میں ڈاکٹر زین العابدین، سجاد ظہیر اور ہاجرہ بیگم کو برطانوی کمیونسٹ پارٹی کا رکن بنا دیا گیا۔ جنرل حبیب اللہ کے بھائی عشرت حبیب اللہ اور احمد آباد کے ہتھی سنگھ بھی اُن میں شامل تھے۔ کیمبرج میں ڈاکٹر دین محمد تاثیر نے ایک نیا حلقہ بنا لیا تھا۔ ان لوگوں نے 1935ء میں ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر دین محمد تاثیر، ملک راج آنند اور سجاد ظہیر نے کل ہند ترقی پسند مصنفین کا منشور تیار کیا اور بنیاد رکھی۔ دسمبر 1935ء میں سجاد ظہیر نے واپس آ کر ڈاکٹر محمد علی اور دوسرے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر انجمن کو منظم کرنا شروع کیا۔

ایسا ہی ادھورا اور خال خال کام ادبی سطح پر بھی شروع ہو چکا تھا۔ غالب نے مغربی تہذیب کے مشاہدہ سے نئے پیداواری رشتوں کو جس انداز سے خوش آمدید کہا بعدازاں وہ جس سماجی انقلاب کا خواہاں تھا۔ اُس کی بازگشت ہمیں نئے حوالوں سے حالی، سرسید احمد خاں اور معذرت خواہانہ انداز میں اقبال کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ یہ سب مل کر ایک نئے فکر کی تمہید باندھ رہے تھے۔ جس نے بعدازاں مغربی نظامِ تعلیم سے اکتساب حاصل کرنے والے طالبِ علموں کی ایک کھیپ تیار کی جو نہ صرف مغرب میں آنے والے نئے انقلاب سے آشنا تھے۔ بلکہ ترقی پسند نظریات سے بھی وابستہ تھے۔ اُن میں سے بعض تو براہِ راست اشتراکی تنظیموں کے اندر نہ صرف کام کر چکے تھے۔ بلکہ باقاعدہ تعلیمات حاصل کر چکے تھے۔ لیکن ادبی دنیا میں اس کی گھن گرج اُس

وقت سنائی دی۔ جب نظامی پریس لکھنو نے 1932ء میں افسانوں کا ایک مجموعہ ''انگارے'' شائع کیا۔ اِس میں کُل دس افسانے تھے۔ جس میں سجاد ظہیر کے پانچ پروفیسر احمد علی اور ڈاکٹر رشید جہاں کے دو دو اور صاحب زادہ محمود الظفر کا ایک افسانہ شامل تھا۔ اِس کتاب کا چھپنا ادبی تاریخ کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ اِس میں پہلی دفعہ کچھ ایسے ادبی رویئے سامنے آئے جو روایتی ڈگر سے ہٹ کر تھے۔ وہ اُن اخلاقی اقدار کے دائرہ میں نہیں آتے تھے جو ایک پسماندہ سماج نے روایت کے نام پر اپنا رکھی تھی۔ اس دوران اختر حسین رائے پوری نے بھی ترقی پسند تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ رسالہ اردو میں جولائی 1935ء میں اُن کا مقالہ ''ادب اور زندگی'' شائع ہوا۔ ان میں جو مضامین شائع ہوتے رہے وہ بعد ازاں تنقیدی مجموعوں، ادب اور انقلاب اور روشن مینار کی زینت بنے۔

اَنگارے کے شائع ہونے پر دو باتیں سامنے آئیں۔ ہندوستان کی ادب میں اِن جذبات کا بھی اظہار ہو سکتا ہے۔ جن پر ابھی قدغن لگا ہُوا تھا۔ مزید برآں یہ کہ اَخلاقیات مذہب سے علیحدہ بھی کوئی ضابطہء حیات ہے۔ جو سماج سے جنم لیتا ہے۔ خصوصاً مسلم اخلاقین کے ہاں مذہب کا رِشتہ ٹوٹتا ہُوا نظر آیا۔

اگر ہم انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے منشور کی طرف نظر دوڑائیں تو اُس میں دو دھارے ساتھ ساتھ بہتے نظر آتے ہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اُن کے دو بنیادی Objectives تھے۔ اُن کا منشور واضح طور پر کہتا ہے کہ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والے تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں۔ پھر غفلت پرستی کی حمایت، رجعت پسندی اور ماضی پرستی کی روک تھام کے ساتھ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ اور وطن کو بہتر زندگی کی راہ دکھلانے کا بھی اشارہ کیا ہے۔ یعنی ایک تو آسودگی، پسماندگی، رجعت پسندی کا عیاں کرنا اور دوسرے بہتر سماج کی تصویر دکھانا تھا۔

یہ ایک الگ بحث ہے کہ بہتر سماج کی راہ پر لگانے کے نتائج کیا نکلے لیکن یہ تو ہوا کہ ترقی پسند تحریک کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ادب میں صدیوں کا جمود ٹوٹا اور سیاق و سباق سے ہٹی ہوئی اخلاقیات بھی ایک حد تک ادب کے حوالے سے پسِ پشت ڈال دی گئی۔

❁❁❁❁❁

تحقیق کے نئے زاویئے

مسکراہٹ کی تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

انسان مسکراتا ہے، ہنستا ہے، اور قہقہے بھی لگاتا ہے۔ اس سے اس کے اندرونی جذبات کا اظہار ہوتا ہے، لیکن جذبات کا اظہار تاریخ میں مختلف اوقات اور زمانوں میں علیحدہ علیحدہ رہا ہے۔ کبھی جذبات کے اظہار کو معیوب سمجھا جاتا ہے اور کبھی اس کو اچھی علامت کے طور پر لیا جاتا ہے۔ یہی صورت مسکرانے کی ہے۔ کبھی یہ خوشی و مسرت کا اظہار ہوتی ہے تو کبھی اس سے انسان کے اندرونی رنج و غم کا اظہار ہوتا ہے۔ کبھی مسکراہٹ بناوٹی اور مصنوعی ہوتی ہے، جیسے سیاستدانوں کی، جو عوام کے مجمع میں مسکرا کر ان کے سامنے اپنی شخصیت کو عوامی بنا کر پیش کرتے ہیں، اور کبھی مسکراہٹ کاروباری ہوتی ہے کہ جب دکاندار مسکرا کر گاہکوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔ یہی صورت حال اس وقت ہوتی ہے کہ جب کسی کا انٹرویو لیا جاتا ہے تو اس وقت دونوں جانب سے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ جب فوٹو کھنچوایا جاتا ہے تو خاص طور سے فوٹو گرافر ہدایت دیتا ہے کہ مسکرایئے کیونکہ اس کا خیال ہوتا ہے کہ مسکراہٹ سے شخصیت میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔

لیکن جب مسکراہٹ کی تاریخ لکھی جائے تو اس میں مورخوں کو مشکلات پیش آتی ہیں۔ انہیں شعر و شاعری و ادب سے مسکراہٹوں کے بارے میں تاثرات اکٹھے کرنا ہوتے ہیں۔ پھر ماضی کے بارے میں ان کی معلومات تصویروں اور مجسموں سے ملتی ہیں کہ جن میں ماہرین فن نے اپنے شہکاروں کی مسکراہٹوں کو ابدی بنا دیا ہے۔ اس موضوع پر انگس ٹرومبل (Angus Trumble) کی کتاب ''مسکراہٹ کی مختصر تاریخ'' (A Brief History of the Smile) قابل ذکر ہے۔ وہ مسکراہٹ کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ جب بھی کوئی فرد

مسکراتا ہے تو اس کے ذریعہ نہ صرف اس کے جذبات کی عکاسی چہرے سے ہوتی ہے بلکہ اسے اپنے جسم کو بھی کنٹرول کرنا ہوتا ہے۔ اس عادت اور طور طریق کو شائستگی سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اب ایک اہم بات یہ ہے کہ کیا کسی فرد کو ہر ایک سے ملتے وقت مسکرانا چاہئے یا مسکراہٹ کا تعلق بھی طبقاتی رویوں سے ہے؟ 19 صدی میں ادب آداب کے بارے میں یورپ میں جو کتابیں چھپی ہیں ان میں خصوصیت سے ملازمین کے لئے ہدایات ہیں۔ ان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مالک اور ملازموں کے درمیان ایک فاصلہ ضرور رہنا چاہئے۔ سوال یہ کہ کیا ان سے مسکرا کر بات کرنی چاہئے؟ اس سلسلہ میں کچھ کا خیال تھا کہ ایک شائستہ فرد کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ ان سے مسکرا کر بات نہ کرے تو کم از کم ان کے ساتھ اچھی زبان میں بات کرے، مثلاً ''آپ کا شکریہ''۔ ''مہربانی کہ آپ نے یہ کام کیا'' وغیرہ۔

جہاں تک ملازم عورتوں کا تعلق ہے تو ان سے مسکرا کر بات نہیں کرنی چاہئے۔ ملازم عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ مالکن کی تعریف یا اس کی خوشامد نہ کریں کیونکہ اس کی وجہ سے ان کے اور مالکن کے درمیان جو رشتہ ہے وہ کمزور ہو جاتا ہے۔

مسکراہٹ سے لوگوں کے رویوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اگر پہلی ملاقات پر کوئی مسکرا کر نہ ملے اور چہرے پر سنجیدگی طاری رکھے تو اس صورت میں تاثر یہ ملتا ہے کہ یہ شخص سماجی معاملات میں سرد ہے اور اس میں گرمجوشی نہیں ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص بہت شرمیلا ہوتا ہے اور وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر مسکرانا پسند نہیں کرتا۔

ہنسنے کے بارے میں جو عام روایات ہیں وہ یہ کہ کسی شخص کی کمزوری پر نہیں ہنسنا چاہئے، بے ہودہ مذاق پر بھی خاموش رہنا چاہئے۔ کسی کی موت کے موقع پر، یا عبادت گاہ میں ہنسنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہنسی یا مسکراہٹ کی انسان کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1660 میں انگلستان میں عورتیں ایسا مالک چنتی تھیں جس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔

مسکراہٹ کے بہترین نمونے ہمیں یونان کے مجسموں میں ملتے ہیں، جن میں عورتیں اور مرد مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ مسکراہٹ کبھی غم گین ہے اور کبھی شرارتی۔ اس مسکراہٹ کی وجہ سے مونالیزا کی تصویر مشہور ہو گئی۔

اگنس ٹرومبل اس کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ مسکراہٹ چاہے وہ اچانک ہو یا بناوٹی، شہوت سے بھرپور ہو یا شستہ؟ یہ دماغ میں کسی کیمیائی ردعمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ مسکراہٹ کے ذریعہ ہم خاموشی سے کوئی نہ کوئی پیغام دیتے ہیں۔

مسکرانے یا قہقہہ لگانے کا تعلق طبقات سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً عام لوگ قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں اور اپنے جذبات کا برملا اظہار کرتے ہیں جب کہ تعلیم یافتہ، مہذب اور طبقہ اعلیٰ کے لوگ زور سے نہیں ہنستے وہ محض مسکرا دیتے ہیں۔ بقول مصنف انگریز ہر چیز پر ہنستے ہیں، سوائے ایک چیز کے، جب انہیں مالی نقصان ہو۔

انگریزی ادب کے مشہور ادیب سیموئل جانسن (Samuel Johnson) نے اپنی مشہور انگریزی ڈکشنری (1755) کو لارڈ چیسٹر فیلڈ (Chesterfield) کے نام انتساب کیا۔ مگر اس نے بطور شکریہ کوئی ایک لفظ جانسن سے نہیں کہا، اس لئے شکایتاً جانسن نے کہا کہ ''وہ مسکرایا تک نہیں۔'' اس پر چیسٹر فیلڈ کا کہنا تھا کہ ''ہنسنا جذبات کی گراوٹ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے نہ صرف چہرہ بگڑ جاتا ہے بلکہ ہنسنے سے ایسی آوازیں پیدا ہوتی ہیں کہ جنہیں برداشت نہیں کیا جا سکتا ہے۔'' وہ مسکراہٹ اور قہقہہ لگانے یا زور سے ہنسنے میں فرق کرتا ہے اور زور سے ہنسنا اس کے نزدیک تہذیب کے خلاف ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں نفسیات دانوں نے قہقہہ لگانے یا زور زور سے ہنسنے کو جذبات کے اظہار اور اندر کی گھٹن دور کرنے کے لئے ضروری قرار دیدیا ہے۔

اس لئے موجودہ زمانے میں ایسے بہت سے کلب یا جماعتیں ہیں کہ جہاں لوگ ایک جگہ جمع ہو کر زور زور سے ہنستے ہیں اور اس سے ان کی طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔

مصنف اس پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ جب بہت سے مجسموں کا مطالعہ کیا گیا تو ان میں خصوصیت سے اولیاء اور بزرگوں کے مجسموں میں چہرے پر بڑی شاندار مسکراہٹیں نظر آئیں۔ جیسے گوتم بدھ کے مجسموں میں دانش مندی اور عقل مندی کی مسکراہٹ نظر آتی ہے جو روحانیت سے بھرپور ہے یہ روایت عیسائیوں میں بھی ہے، ان کے ہاں مجسموں میں اولیاء اور فرشتے مسکراتے نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس حکمراں لوگوں کے سامنے نہیں ہنستے تھے بلکہ مسکراہٹ یا ہنسنے سے پرہیز کرتے تھے۔

جس طرح عبادت گاہوں میں زور سے ہنسنا معیوب سمجھا جاتا ہے، اسی طرح سے

بادشاہوں کے دربار میں ہنسنا بے ادبی تھا۔ بادشاہ کے چہرے پر بھی سنجیدگی رہتی تھی۔ کیونکہ ہنسنے کا مطلب تھا کہ وہ درباریوں کے ساتھ بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہا ہے جو اس کے نزدیک اس کی شخصیت کے اثر ورسوخ کو کم کر دے گا۔

ہمارے معاشرے میں بھی مسکرانے کو کئی طریقوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی عورت کسی سے مسکرا کر بات کرے تو یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ اس میں شرم وحیا نہیں ہے۔ اگر لڑکی کسی لڑکے سے مسکرا کر مل لے تو اسے فوراً محبت میں گرفتار ہونے کا الزام دیدیا جاتا ہے۔

اسی طرح اعلیٰ افسر اپنے ماتحتوں کے ساتھ مسکرا کر نہیں ملتے ہیں۔ بلکہ ان کے چہرے پر خشونت اور رعونت ہوتی ہے۔ اسے وہ اپنے اعلیٰ مرتبے کی نشانی سمجھتے ہیں۔ لیکن جب وہ لوگ ملتے ہیں کہ جن میں برابری ہو تو اس صورت میں کھل کر ہنستے اور قہقہے لگاتے ہیں۔

مسکراہٹ اور ہنسنے کے بارے میں ہمارے ہاں جو رجحانات رہے ہیں اس کی جھلکیاں ہمارے ادب میں بھی موجود ہیں۔

❁❁❁❁❁

تہذیب کے نام پر

ڈاکٹر مبارک علی

ایک عرصہ سے تاریخ میں تہذیب کے نام پر جنگیں ہو رہی ہیں، دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا رواج پرانا ہے۔ یعنی مہذب اور غیر مہذب۔ اس بنیاد پر مہذب اقوام اپنی سامراجیت کو اخلاقی جواز دیتے ہوئے دوسرے ملکوں پر حملے کر کے ان پر قبضہ کرتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنی تہذیب، روایات اور اقدار کو دوسروں پر مسلط کر دیں۔

انگریزی میں تہذیب کے لئے سوی لائزیشن (Civilization) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ لفظ بہت پرانا نہیں ہے، بلکہ کافی نیا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں سب سے پہلے فرانس میں اس لفظ کو روشناس کرایا گیا۔ 1756 میں فرانس کے ایک سیاستداں میرابو (Mirabeau) نے اس کو استعمال کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اس مفہوم کو پولس (Polis) یعنی شہر یا پولائٹ (Polite) یا پولس (Police) استعمال ہوتے تھے۔ فرانس کے مورخ بروڈل نے اس لفظ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ فرانس کے بعد کس طرح ہالینڈ، جرمنی، اور انگریزی بولنے والے ملکوں میں اس لفظ کو آہستہ آہستہ مقبولیت ہوئی۔

اردو میں اس کے لئے تہذیب کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جس کی جڑ عربی کا لفظ ذکھبت ہے، یعنی 'سونا'۔ اگرچہ دیکھا جائے تو اس کا صحیح ترجمہ تمدن ہونا چاہئے جو کہ مدینہ یا شہر سے نکلا ہے، کیونکہ تہذیب یا سوی لائزیشن کے بارے میں ہے کہ یہ شہر میں ابھرتی ہے، اس لئے تمدن اس کا صحیح متبادل لفظ ہے۔ مگر اب تہذیب کا لفظ اس قدر مقبولیت حاصل کر چکا ہے کہ اسے اس مفہوم میں بیان کرتا ہے۔

تہذیب کے موضوع پر بہت سے مفکرین نے لکھا ہے۔ ان میں فرائڈ کی کتاب Civilization and its discontent قابل ذکر ہے۔ اسی مناسبت سے بروس ماذش (Bruce Mazish) نے اپنی کتاب Civilization and its Contents لکھی۔ اس میں اس نے تہذیب کے مفہوم، اس کے ارتقاء اور اس کے اثرات پر بحث کی ہے۔

تہذیب کے ارتقاء کے سلسلہ میں دانشوروں نے سب سے پہلے اس پر بحث کی کہ انسانی معاشرے میں تبدیلیاں کیوں آتی ہیں؟ کیا اس تبدیلی کے پیچھے عقل و دانش مندی اور دلیل ہوتی ہے یا فطری طاقتیں اس کو تبدیل کرتی ہیں؟ کیا انسان معاشرے کو اپنی مرضی کے مطابق بدل سکتا ہے؟ ان سوالات کا جواب دینے کی غرض سے جب مختلف علوم سے سہارا لیا گیا تو اس نے سماجی علوم کو پیدا کیا۔ ان علوم کی مدد سے اب ماہرین معاشرے کے رجحانات، رویئے اور تبدیلیوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ سوشل سائنس یا سماجی علوم کی اصطلاح کو سب سے پہلے 1789 میں ایبے سی یس (Abb'e Sieyes) نے استعمال کیا تھا یہ وقت فرانسیسی انقلاب کا تھا جب کہ پیرس کے عوام انقلاب میں مصروف تھے۔ اس وقت میں پبلک اوپی نین (Public Opinion) وغیرہ کی اصطلاحات استعمال ہونا شروع ہوئیں۔ اسی ماحول میں سوی لائزیژن کا لفظ ابھرا۔

جب بھی کوئی قوم خود کو مہذب کہتی ہے تو سب سے پہلے وہ اپنا مقابلہ کسی دوسری قوم سے کرتی ہے، مثلاً یونانیوں نے اپنا مقابلہ جب ہمسایوں سے کیا تو انہوں نے خود کو مہذب اور ہمسایوں کو باربیرین یا غیر مہذب پایا۔ اسی طرح جب یورپیوں نے امریکہ دریافت کیا تو انہوں نے خود کو امریکی مقامی باشندوں کے مقابلے میں مہذب پایا اور پہلے انہیں وحشی (Savage) کہا۔ بعد میں انہیں شریف وحشی یا (Noble Savage) کہا۔

یورپ نے کن بنیادوں پر خود کو مہذب کہا۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرانسیسی دانشور گزو (Gizot) نے تین عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ سب سے اول رومی تہذیب کے ادارے جن میں میونسپل ادارے، سیلف گورنمنٹ اور ریاست کی حکمرانی ہے۔ دوسرا اہم عنصر سیاست کا ہے جس میں مادی زندگی اور روحانی زندگی کو علیحدہ علیحدہ کر کے رکھا ہے۔ تیسرا عنصر فیوڈل ازم ہے، جس کے ساتھ جرمن میں پیدا ہونے والی آزادی اور انفرادیت ہے۔ ان تین عناصر نے مغربی تہذیب کو ایک علیحدہ شناخت دی۔

گزو کے نزدیک مذہب تہذیب کو بنانے اور آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے بعد سائنس اور دوسرے علوم آتے ہیں۔ لہٰذا یورپی تہذیب کی تشکیل میں عیسائیت کا اہم کردار ہے۔

اس کے برعکس گوبی نو، جو کہ ایک نسل پرست دانشور ہے۔ اس نے تہذیب کی تشکیل میں مذہب کے عمل سے انکار کیا۔ اس کے نزدیک عیسائیت محض نجات کے لئے ہے۔ دنیاوی معاملات کے لئے ایک نئے ضابطہ اخلاق کی ضرورت ہے کہ جس کی بنیاد سیکولرازم پر ہو۔ اس کے نزدیک صرف خالص نسل تہذیب پیدا کرتی ہے۔

جب نسل میں ملاوٹ آ جائے تو اس کے ساتھ ہی تہذیب کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا برتر نسل اور خالص نسل کا کام حکومت کرنا ہے، جو قومیں نسلی طور پر کم تر ہیں، انہیں غلامی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس نسلی نظریہ نے یورپی امپیریل ازم کو ایک اخلاقی جواز دیا کہ چونکہ وہ تہذیبی اور نسلی طور پر برتر ہیں اس لئے دنیا پر حکومت کرنا ان کا حق ہے۔ دوسری قوموں کو محکوم بنانے اور انہیں اپنے ماتحت لانے کے لئے انہیں کسی ضابطہ اخلاق کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

ڈارون نے انسانی ارتقاء کے سلسلہ میں ''جہد ملبقا'' (Survival of the Fittest) کا نظریہ دیا کہ فطرت میں وہی نوع باقی رہی کہ جس میں توانائی، صلاحیت اور لیاقت تھی۔ اس سے ہربرٹ اسپنسر نے سوشل ڈارون ازم کا نظریہ تشکیل دیا کہ دنیا کی اقوام میں وہی باقی رہ سکتی ہیں کہ جو طاقت ور اور توانا ہوں۔ اس نظریہ کے تحت سفید نسل کو برتر قرار دیا اور اس برتری نے ان کی سامراجیت کو جائز کر دیا۔

تہذیب کی ترقی اور پھیلاؤ کے پس منظر میں فرائڈ انسان کی غیر یقینی کیفیت اور عدم تحفظ کو قرار دیتا ہے کہ جس پر قابو پانے کے لئے وہ ماحول سے متصادم رہتا ہے اور اسے اپنے حق میں کنٹرول کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا تباہی اور تعمیر کی قوتیں، دونوں مل کر تہذیب کی تشکیل کرتی ہیں۔

نوربرٹ الیاس نے اپنی کتاب ''تہذیبی عمل'' (Civilization Process) میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے کہ تہذیب کی سب سے بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے جذبات پر قابو پائے۔ اپنی عادات و اطوار کو بدلے، کھانے پینے، بولنے چالنے میں اپنی گفتگو اور جسم پر کنٹرول رکھے۔ اس نے گفتگو اور جسمانی حرکات پر کنٹرول کی ایک وجہ درباری کلچر کو بتایا ہے کہ جہاں

بادشاہ کی موجودگی میں درباریوں کو ہر طرح سے خود پر قابو پانا ہوتا تھا۔ یہ ادب آداب اول امراء میں آئے اس کے بعد وہاں سے عام لوگوں میں ان کا رواج ہوا۔

تہذیب کی ترقی میں دوسری اہم وجہ وہ طاقت ور ریاست کی تشکیل کو دیتا ہے۔ اس نے امراء یا فیوڈل لارڈز کی طاقت کو توڑا اور بورژوا یا متوسط طبقہ کو آگے بڑھنے کا موقع دیا جس کی وجہ سے تہذیب امراء کے دائرے سے نکل کر متوسط طبقے میں پھیلی۔

تاریخ میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تہذیب کے نام پر تہذیب کو مسخ کیا جاتا ہے جب نازی ازم، فاشزم اور کولونیل ازم میں اپنے تسلط اور غلبہ کی خاطر تہذیبی اقدار کو اپنے مفادات کے تحت تعمیر کیا اور دوسری اقوام کو کم تر قرار دے کر ان کی تہذیب و تمدن کو ختم کیا۔ موجودہ دور میں یہی امریکی امپیریل ازم کر رہا ہے جو تہذیب کے نام پر جنگیں کرتا ہے، دوسرے ملکوں میں مداخلت کرتا ہے، اور ان کی تہذیب و اقدار کو تباہ و برباد کر کے شکست خوردہ اقوام کو غیر متمدن بنا دیتا ہے۔ اس کی مثال عراق میں اس کا قبضہ ہے کہ جہاں قبضہ کے بعد ان کے تاریخی آثاروں کو مٹایا گیا، کتب خانوں کو جلایا گیا، اور جب ملک میں غیر یقینی و عدم تحفظ ہوا تو لوگوں کے رویے بدل گئے، اپنی بقاء کی خاطر وہ جرائم اور دہشت گردی میں ملوث ہو گئے۔

تہذیب کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جن اقوام نے ماضی میں شاندار تہذیب پیدا کی، اور پھر وہ زوال پذیر ہو گئیں تو ایسی اقوام کے لئے ان کا شاندار ماضی ان کے لئے ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا سحر اور جادو ہوتا ہے کہ جس سے نکلنا ان کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جو تہذیب ترقی کرتی ہیں، ان کے لئے ماضی کی شان و شوکت، زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہے۔

شاندار ماضی کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے زوال کے زمانے میں بھی یہ اقوام دوسری قوموں کو اپنے سے کم تر سمجھتی ہیں اور خود کو اپنے عروج کے پیمانے سے ناپتی ہیں۔ اس ذہن کی وجہ سے ان کے لئے نئی روایات اور اقدار کو قبول کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ دوسری تہذیبوں سے سیکھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہیں۔

اب ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تہذیب نے دنیا کو نقصان پہنچایا یا فائدہ؟ اس کا

جواب ہاں اور نہیں دونوں میں ہے۔ چونکہ تہذیبی ترقی پوری دنیا، اور ہر معاشرے میں یکساں نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے ہر قوم اور معاشرہ اپنے نظریہ کے مطابق تہذیب کے معیار اور پیمانے مقرر کرتا ہے۔ اس لئے کون مہذب ہے اور کون نہیں؟ اس کا جواب دینا بھی مشکل ہے۔

لیکن جو قومیں ٹکنالوجی میں ترقی یافتہ ہوتی ہیں۔ وہ اس کی مدد سے دوسری اقوام پر برتری حاصل کر لیتی ہیں۔ ٹکنالوجی تہذیب کا ایک حصہ ہوتی ہے پوری تہذیب نہیں۔ اس لئے ضروری نہیں کہ ٹکنالوجی میں ترقی یافتہ قومیں ذہنی طور پر بھی ترقی یافتہ ہوں۔ یا ذہنی طور پر پختہ قومیں ٹکنالوجی میں ماہر ہوں۔ اس لئے تہذیب کا کوئی معیار مقرر کرنا مشکل ہے۔ اور دنیا کو مہذب و غیر مہذب حصوں میں بانٹنا بھی ناانصافی ہے۔

❁❁❁❁❁

کوئلہ کی تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ صرف انسانوں ہی کی نہیں ہوتی ہے، یہ چیزوں کی بھی ہوتی ہے، کیونکہ جو چیزیں انسان کی زندگی میں آتی ہیں، ان میں سے کچھ اس کی بنائی ہوئی ہیں، کچھ فطرت کی جانب سے اسے ملی ہیں، مگر ان کی موجودگی اور استعمال نے اس کی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے ہیں، ان سے اس کی عادات واطوار، رسم ورواج، طور طریق اور ادب آداب بدل گئے ہیں۔ اس لئے مورخ چیزوں کی تاریخ کے ذریعہ تہذیب وتمدن میں جو ترقی ہوئی ہے اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔

جن چیزوں نے انسان کی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے، ان میں وہ اشیاء خاص طور سے قابل ذکر ہیں کہ جو توانائی یا انرجی کو پیدا کرنے کا باعث ہیں، کیونکہ توانائی یا انرجی فرد اور سماج کے جمود کو توڑتی ہے، اس میں حرکت پیدا کرتی ہے اور اس حرکت سے تہذیب وتمدن آگے کی جانب جاتا ہے۔

اس پس منظر میں کوئلہ اور اس کے اثرات پر بھی کچھ مورخوں نے توجہ دی ہے۔ کیونکہ کوئلہ توانائی یا انرجی کا ایک بہت اہم ذریعہ رہا ہے۔ اس پس منظر میں باربرا فاریز (Barbara Farees) نے ''کوئلہ: انسانی تاریخ'' (Coal: A Human History) کے عنوان سے کتاب لکھی جس میں خاص طور سے اس نے کوئلہ اور اس کے سماجی اثرات پر، انگلستان کی تاریخ کے پس منظر میں روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کی ابتداء میں مصنفہ ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتی ہے کہ جب 1306 میں انگلستان کے لارڈز اور امراء لندن آئے، جہاں وہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں شریک ہونے آئے تھے، تو اس

مرتبہ انہیں شہر میں ایک عجیب سی بو کا احساس ہوا۔ یہ اس کوئلہ کی دھویں کی بو تھی جو لوہار اور مستری اپنی بھٹیوں میں استعمال کرتے تھے۔ اس پر انہوں نے احتجاج کرتے ہوئے ایڈورڈ اول سے مطالبہ کیا کہ اس کے استعمال کو ممنوع قرار دیدیا جائے۔ اس پر بادشاہ کی جانب سے کوئلہ کے استعمال پر پابندی لگادی گئی۔ لیکن جہاں ایک طرف شاہی پابندی تھی وہاں دوسری طرف لوگوں کی روزی اور وقت کی ضرورت تھی، اس لئے خفیہ طور پر اس قانون کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ لہٰذا جب خلاف ورزی ہوتو اس کی سزا ہوتی ہے۔ بطور سزا لوہاروں کی بھٹیوں کو توڑا گیا، اور انہیں سخت سزائیں دی گئیں مگر وقت کی ضرورت نے بالآخر قانون کو شکست دیدی۔ کیونکہ جب آبادی بڑھی، لکڑی کی کمی ہوئی، تو مجبوراً کوئلہ کا استعمال کرنا پڑا۔

1800 کی دہائی میں رالف والڈو ایمرسن نے کوئلہ اور تہذیب کے بارے میں کتاب لکھتے ہوئے، اس جانب اشارہ کیا ہے کہ اس کا توانائی کی وجہ سے دنیا کی تہذیب میں انقلابی تبدیلی آئی۔ اس نے نہ صرف روشنی دی بلکہ تہذیب کو ایک نئی طاقت وقوت دی ہے اور اسے دولت سے مالا مال کیا۔ اگر کوئلہ نہیں ہوتا تو لوگ اندھیرے و تاریکی میں رہتے ہوئے، غربت و مفلسی کی حالت میں رہتے ہوئے غیر مہذب ہو جاتے۔

اس کے بعد مصنفہ نے مختصراً انگلستان کے حوالے سے کوئلہ کی تاریخ کو بیان کیا ہے۔ جب رومیوں نے انگلستان پر حملہ کیا تو انہیں یہاں کالا پتھر ملا، جس کا نام انہوں نے گے گیٹ (Gagate) رکھا۔ بعد میں یہی جیٹ (Jet) بن گیا۔

اگر چہ انگلستان میں کوئلہ بڑی مقدار میں تھا، مگر امراء کو اس کے جلنے سے جو بو پیدا ہوتی تھی وہ پسند نہیں تھی۔ 1257 میں ملکہ ایلینا نوٹن گم گئی، تو وہاں کوئلہ کی بو سے اس قدر گھبرائی کہ اس نے فوراً شہر چھوڑ دیا۔

انگلستان کی تاریخ میں اس عرصہ میں تبدیلیاں آئیں، 1347 میں جہاز کے ذریعہ یورپ میں پلیگ آیا جس نے ہزاروں لوگوں کو مار دیا۔ بلیک ڈیتھ یا کالی موت میں 25 ملیون کے قریب لوگ یورپ میں آ گئے۔ 1500 بیماریوں اور وباؤں کی وجہ سے یورپ اور خاص طور سے انگلستان کی آبادی گھٹ گئی۔

1527 میں ہنری ہشتم کا جب شادی کے سلسلہ میں پوپ سے جھگڑا ہوا، تو وہ چرچ سے علیحدہ ہو گیا اور انگلستان میں اس کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ اس میں اس کے پاس کوئلہ کی کانیں بھی آئیں جو پہلے چرچ کے پاس تھیں۔ اس نے تاجروں کو یہ موقع دیا کہ وہ یہ کانیں خرید کر انہیں استعمال کریں۔ لیکن اب تک امراء کوئلہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خاص طور سے امراء کی عورتیں۔ وہ ان گھروں میں نہیں آتی تھیں کہ جہاں کوئلہ جلتا ہو۔ نہ ہی وہ کوئلہ پر کھانا پکاتی تھیں۔

لیکن 1600 کی دہائیوں میں حالات نے لوگوں اور خاص طور سے امراء کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ کوئلہ کا استعمال کریں۔ کیونکہ آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے ایندھن کی ضرورت بھی بڑھی۔ لکڑی کی کمی اس لئے ہوئی کہ جنگلوں سے درختوں کو کاٹ کاٹ کر ان کو ختم کرنا شروع کر دیا۔

جب کوئلہ کا استعمال چولہے اور آتشدان میں ہوا، تو دھویں کے نکاس کے لئے چمنی کی ایجاد ہوئی۔ ابتداء میں چمنی صرف امراء کے گھروں میں ہوتی تھی۔ اس میں جب بہت زیادہ کالونچ جمع ہو جاتی تھی تو اس کی صفائی کے لئے ''چمنی بوائے'' ہوتے تھے جو اس کے اندر گھس کر اس کی صفائی کرتے تھے۔

16 صدی میں کوئلہ کے استعمال سے لندن شہر کا ماحول متاثر ہوا۔ اس کے دھویں کے اثرات سے درخت اور سبزہ جل گیا۔ لوگوں میں پھیپھڑوں کی بیماریاں پھیل گئیں، خاص طور سے بچے اس خراب ماحول میں اپنی صحت خراب کر بیٹھے۔

لیکن حالات کا دباؤ اس قدر تھا کہ ان خرابیوں کے باوجود 1660 کی دہائی میں اس کا استعمال کم ہونے کے بجائے اور پھیلتا چلا گیا۔ اب اسے بطور ایندھن استعمال کیا جانے لگا اور اس پر کھانا پکایا جانے لگا۔

1660 کی دہائی میں نیو کاسل میں کوئلے کی کانوں میں کام کرنے کے لئے باہر سے مزدوروں کو بلایا گیا۔ یہ کان کن یا مزدور انتہائی غربت کی حالت میں کچے مکانوں میں رہتے تھے۔ ان نئے آنے والوں کو گاؤں اور دیہات کے کسانوں نے قبول نہیں کیا اور ان کے بارے میں بڑے تعصب کا مظاہرہ کیا۔ انہیں کمین ترین، چور، بدمعاش، نشے باز، اور ناپسندیدہ اشخاص کہا گیا۔ اس نے سماج میں مزدوروں اور کسانوں کے درمیان ایک طبقاتی فرق کو پیدا کیا۔ مزدور، تنخواہ پر کام کرتے تھے، ان کے کوئی حقوق نہیں تھے، ان کی آبادیاں غلیظ اور گندی تھیں۔ ان کی

کوئی روایات نہیں تھی۔ ان کے مقابلے میں کسان کا زمین سے رشتہ تھا۔ اس کی زندگی میں ٹھہراؤ تھا، زمیندار اس کا محافظ اور سرپرست تھا، اس لئے وہ خود کو ان مزدوروں سے برتر سمجھتا تھا۔

اسکاٹ لینڈ میں جو کان کن کام کرتے تھے۔ ان کی پوری زندگی کانوں میں گزر جاتی تھی۔ ان کے لئے دن رات کا کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ سورج نکلنے سے پہلے کان میں جاتے اور سورج غروب ہونے پر واپس آتے۔ ان کی عورتیں اور بچے بھی ان کے ساتھ کانوں میں کام کرتے تھے۔ اسکاٹ لینڈ میں خاص طور سے ''بانڈیڈ لیبر'' (Bonded Labour) کا رواج تھا۔ یہ کان کن کو قرضہ دے کر، یا تحفہ دے کر اسے زندگی بھر کے لئے مجبور کرتے تھے کہ وہ مالک کے لئے کام کرے۔ کوئلہ میں کام کرنے والوں کی حالت زار کا مطالعہ 19 صدی میں وان گوگ (Van Gog) اور ایمیلا زولا نے کیا۔ وان گوگ نے مصوری کے ذریعہ اور زولا نے اپنے ناول ''جرمینل'' میں ان کی زندگی اور ماحول کو بیان کیا ہے۔

اس وقت کوئلہ کی کانوں میں حفاظت کے انتظامات نہیں تھے اس لئے آئے دن حادثات ہوتے رہتے تھے۔ مالکین اخبارات پر دباؤ ڈالتے تھے کہ ان حادثات کی خبریں نہ چھاپیں۔ اس لئے ایک عرصہ تک اخبارات میں کانوں میں ہونے والے حادثات اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی اموات کے بارے میں کچھ نہیں چھپتا تھا۔

جب جیمس واٹ اور بولٹن (Boulton) نے کوئلہ کے ذریعہ بھاپ اور اس کی توانائی کو دریافت کیا تو اس نے صنعت میں تبدیلی کی۔ بولٹن اور جورج سوم کی ایک ملاقات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ ''میں اس شے کو ایجاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جس کی خواہش بادشاہوں کو ہوتی ہے۔'' تو بادشاہ نے حیرانی سے پوچھا وہ کیا چیز ہے؟ اس پر اس نے جواب دیا ''پاور، یور مجسٹی۔''

انگلستان کے صنعتی انقلاب میں کوئلہ، بھاپ، اور ان کی توانائی نے اہم کردار ادا کیا۔ مانچسٹر کپڑے کی صنعت کا مرکز بن گیا۔ صنعت نے سرمایہ داری کو مضبوط کیا۔ سرمایہ داری نے طبقاتی نظام کو پیدا کیا۔ سرمایہ داری کا نظام جن بنیادوں پر ابھرا، ان میں مزدوروں کی محنت، ان کی مفلسی، ان کی زندگی کی اذیتیں و محرومیاں سب شامل تھیں۔ اس لئے یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ صنعتی انقلاب کے اس ابتدائی دور میں مزدوروں کی کچی آبادیاں تھیں، گندگی و غلاظت تھی، بیماریاں تھیں، عدم

تحفظ اور غیر یقینی کیفیات تھیں۔ ان حالات میں سرمایہ داری ابھری اور اس کا عروج ہوا۔

1700 کی دہائی میں کوئلہ سے گیس پیدا کر کے روشنی حاصل کی گئی۔ 1805 میں گیس کی روشنی کو فیکٹریوں میں استعمال کیا جانے لگا، جس کی وجہ سے رات میں بھی کام ہونے لگا۔ مشینوں کی ایجاد کی وجہ سے محنت کا کام کم ہو گیا تو اب بچوں کو ملازم رکھا جانے لگا، کیونکہ یہ سستے مزدور تھے یہ بچے چھوٹی عمر سے فیکٹریوں میں کام کرتے تھے۔ کام کے وقات 12 سے 13 گھنٹے ہوا کرتے تھے۔ اس سے خاندان کی زندگی پر اثر پڑا۔ اب عورتیں، بچے اور مرد صبح سے شام تک فیکٹریوں میں کام کرتے تھے۔ اس نے خاندانی تعلقات اور رشتوں کو کمزور کر دیا۔ ایک ایسی نئی ورکنگ کلاس پیدا ہوئی کہ جس کے پاس کوئی روایات نہیں تھیں، اور نہ ہی کوئی بنیاد تھی کہ جس پر وہ اپنے مفادات تشکیل دے سکتے۔ 1800 سے 1824 تک ٹریڈ یونین غیر قانونی تھی۔ 1867 میں جب ورکنگ کلاس کو ووٹ کا حق ملا تو انہوں نے اپنی یونین بنائی۔ اس وقت مزدوروں کی جو حالت تھی اس کا نقشہ اینگلز نے اپنی کتاب ''انگلستان میں مزدوروں کی حالت'' میں لکھا ہے۔ یہ کتاب 1848 میں شائع ہوئی تھی۔ اینگلز نے کے علاوہ دوسرے مصنفوں نے بھی مزدوروں کی حالت پر لکھا ہے کہ زراعتی دور میں جو کسان صحت مند نظر آتا تھا، اب اس کی جگہ کمزور، لاغر اور دبلا پتلا مزدور نظر آتا ہے کہ جسے فیکٹریوں کا ماحول کھا جاتا ہے۔ 1851 میں جب ملکہ وکٹوریہ نے مانچسٹر کا دورہ کیا تو کوشش کی گئی کہ اس کے دورے میں کوئی خراب مناظر نہ آئیں، مگر اس کے باوجود ملکہ نے ''مرجھائے ہوئے چہرے اور غیر صحت مند آبادی کو دیکھا۔''

مصنفہ نے اس کے بعد کوئلہ کے ان پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا ہے کہ جس نے انگلستان کو ایک طاقتور ملک بنایا۔ مثلاً انگلستان کی ترقی اور سیاسی تسلط وغلبہ میں اس کی بحری قوت کو دخل تھا۔ اگرچہ بحری قوت کی بنیاد ہنری ہشتم نے ڈالی تھی، مگر اس کی ترقی ملکہ الزبتھ اول کے آتے آتے ہوئی جب مرچنٹ نیوی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور کوئلہ کی تجارت نے اسے فوجی طور پر مضبوط کر دیا۔

ریلوے کی ایجاد نے مزید کوئلہ کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلایا۔

امریکہ کی دریافت پر یورپیوں کو یہاں گھنے جنگل ملے۔ بعد میں یہاں کوئلے کے وسیع

ذ خائر بھی ملے جنہوں نے ریلوے اور دوسری صنعتوں کو ترقی دی۔ 1900 میں ان ذخائر کی وجہ سے امریکہ، برطانیہ اور جرمنی سے صنعتی طور پر آگے بڑھ گیا۔

لیکن ایک وقت آیا کہ کوئلہ اپنی اہمیت کھو بیٹھا، اب توانائی اور انرجی کے دوسرے ذرائع دریافت ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی کوئلہ پس منظر میں چلا گیا۔ اگر چہ اب بھی اس کی اہمیت ہے، مگر دوسرے ذرائع کے مقابلہ میں اب وہ کافی پیچھے چلا گیا ہے۔ لیکن اس کی اپنی ایک تاریخ ہے جس نے سماج کو تبدیل کیا اور نئی روایات وقدروں کی بنیاد ڈالی۔

کافی کی تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

ہم اپنی زندگی میں بہت سی چیزوں کا استعمال کرتے ہیں مگر ان کی تاریخ سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا ہے۔ اگر ہم ان کی ابتداء، پھیلاؤ اور استعمال کی تاریخ سے واقف ہو جائیں تو یہی چیزیں ایک اور رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ اب دنیا میں کافی پینے کا رواج بہت بڑھ گیا ہے، لیکن اکثریت کو اس کا علم نہیں کہ اس کی شروعات کہاں سے ہوئی اور کن کن طریقوں اور ذریعوں سے یہ مختلف ملکوں میں پھیلی۔

کہا جاتا ہے کہ کافی کا استعمال 1500 سے 300 ہزار سال پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ ایتھوپیا کا ایک خانہ بدوش قبیلہ اروموس اسے استعمال کرتا تھا۔ ان کا علاقہ کیفو کے نام سے پہچانا جاتا تھا، جس سے بعد میں کافی کا لفظ نکلا۔ کچھ اسکالرز کے مطابق یہ لفظ قہوہ سے نکلا ہے، ایتھوپیا میں اس کے لئے ''بونو'' یا بینز (Beans) کا لفظ بولا جاتا تھا۔ اروموس قبیلہ کے لوگ اسے پیتے نہیں تھے بلکہ اسے پیس کر اس میں چربی ملا کر اس کی گولی بناتے تھے اور پھر اسے کھاتے تھے۔

کافی کی تاریخ کو اسٹیوارٹ لی ایلن (Steewart Lee Allen) نے ''شیطانی پیالی'' (The Devils Cup) میں ناول نگاری کے انداز میں بیان کیا ہے۔ مصنف نے ان تمام علاقوں اور ملکوں کی سیاحت کی کہ جہاں کافی مختلف طریقوں سے پی جاتی تھی، ان ذائقوں کو چکھا، اور ان راستوں کی نشان دہی کی کہ جن سے کافی دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلی۔

اروموس قبیلے کے لوگ جو کافی کا استعمال کرتے تھے۔ یہ ان کے کلچر کا حصہ بن گئی تھی اس لئے ان کے ہاں اس کے بارے میں بہت سی کہاوتیں تھیں۔ مثلاً ''کافی کے دانے مارکیٹ میں

مت بھولو''۔ ''کافی کا راز کسی کو مت بتاؤ'' وغیرہ۔

کافی کس طرح سے روشناس ہوئی، اس سلسلہ میں ایتھوپیا میں ایک کہانی مشہور ہے کہ:
ایک ایتھوپیا کے چرواہے نے ایک دن دیکھا کہ اس کی بکری رقص کر رہی ہے۔ اس رقص کی وجہ یہ تھی کہ اس نے پہاڑی پر اُگی ایک جھاڑی سے کچھ بیر کھالئے تھے۔ چرواہے لڑکے نے بھی ان بیروں کو کھالیا، اور کھاتے ہی اس نے بھی رقص شروع کر دیا۔ ایک بزرگ اتفاق سے ادھر سے گذر رہے تھے جب انہوں نے لڑکے اور بکری کو محو رقص دیکھا تو یہ سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ وہ اس طرح سے ناچ رہا ہے؟ لڑکے کے بتانے پر وہ بزرگ جھاڑی سے چند دانے توڑ کر لے گیا۔ جب اس نے انہیں کھایا تو اس کے بعد رات کو سو نہیں سکا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ رات بھر عبادت کرنے اور اپنے مریدوں کو وعظ دینے کا عادی تھا مگر اسے اکثر نیند کے جھونکے تنگ کرتے تھے۔ لہٰذا اس نے فوراً اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ وہ ان دانوں کو چبائیں۔ اس سے ان سب کی نیند غائب ہوگئی اور وہ رات بھر عبادت میں مصروف رہے۔

ایک اور کہانی کے مطابق عرب ملکوں میں خاص طور سے یمن میں کافی کی ایک مقبولیت اور استعمال کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ 1400 میں ایک چینی ملاح چینگ ہو نے عرب میں چائے کو روشناس کرایا۔ لیکن جب چین کے دوسرے ملکوں سے تعلقات ختم ہو گئے وہ علیحدگی میں چلا گیا تو اس کمی کو عربوں نے کافی کے ذریعہ پورا کیا۔

ایتھوپیا کہ جہاں سے کافی کی ابتداء ہوئی، وہاں اس کی خوبیوں کی وجہ سے اس سے بہت سی رسومات منسلک ہوگئیں تھیں۔ کافی کے برتن کو مقدس خیال کیا جاتا تھا۔ اور کہا جاتا تھا کہ

کافی ہمیں سکون دیتی ہے
کافی ہمارے بچوں کو بالغ کرتی ہے
اس سے ہماری دولت میں اضافہ ہوتا ہے
یہ ہمیں تباہی اور برائی سے بچاتی ہے
یہ ہمیں بارش اور گھاس دیتی ہے

اس کے بعد کافی کا تاریخی سفر شروع ہوتا ہے۔ یہ ایتھوپیا سے یمن کی بندرگاہ ''موکا'' جاتی

ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سب سے پہلے ایک صوفی بزرگ شاذلی نے اسے پیس کر اس کا قہوہ بنایا۔ اس کے بعد اس سلسلہ کے صوفیوں نے 1200 سے 1500 کے درمیان میں اسے عرب میں روشناس کرایا۔ چونکہ صوفی سلسلہ کے یہ لوگ برابر سفر کرتے تھے اس لئے جہاں جاتے تھے وہاں کافی بھی پہنچا دیتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ اسپین میں بھی مقبول ہوگئی۔ 1400 میں جب ترکوں نے یمن فتح کیا تو وہ کافی کو اپنے ساتھ گھروں میں لے آئے۔

ابتداء میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ کافی پینے سے نشہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے بہت سے صوفی سلسلہ کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی شبہ کی بنا پر مصر کے مملوک بادشاہوں نے اس پر پابندی لگا دی تھی۔ لیکن ان پابندیوں کے باوجود اس کی مقبولیت بڑھتی گئی اور 1525 میں یہ مکہ میں اور 1539 میں قاہرہ میں نظر آنے لگی۔ اگرچہ 1600 میں ایک بار پھر ترکوں نے اس پر پابندی لگائی، لیکن اب یہ پابندی کو توڑتے ہوئے عام لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک صوفی شیخ کافی کے دانے مکہ سے میسور لائے اور یہاں اس کی کاشت کی۔ 1616 میں ایک ولندیزی جہاز کے کپتان نے میسور سے اس کے بیجوں کو لے جا کر انڈونیشیا میں اس کی 1660 میں کاشت شروع کی۔

ترکی میں کافی لانے والے صوفی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا رومی کے مرید درویش کافی پی کر رقص کیا کرتے تھے۔ 1640 کی دہائی میں جب ترکوں نے یورپ پر حملے کئے تو یہ اپنے ساتھ کافی بھی لے گئے اور اہل یورپ کو اس سے روشناس کرایا۔ ویانا کے محاصرے کے بعد کافی آسٹریا میں پی جانے لگی اور وہاں کافی ہاؤس کھل گیا۔ آسٹریا سے کافی وینس، لندن، اور پیرس گئی۔ 1650 میں ایک یہودی نے پہلا آکسفورڈ کیفے کھولا، 1652 میں کافی ہاوس کھلنے شروع ہوئے اور 1700 میں انگلستان میں ان کی تعداد دو ہزار ہوگئی تھی۔ بہت جلد ان کافی ہاؤسز میں سیاست، ادب، آرٹ اور سائنس پر بحث ومباحثے ہونے لگے۔ اس دور میں اہم شخصیات کے پسندیدہ کافی ہاؤسز تھے۔ مثلاً نیوٹن، گریشن کافی ہاؤس (Grecian Coffee House) میں بیٹھتا تھا، سوفٹ اور پوپ ولز کافی ہاؤس میں پابندی سے آتے تھے۔

کافی ہاؤسز میں بحث ومباحثہ کے نتیجہ میں اخبارات نکلنا شروع ہوگئے۔ اب اخبارات میں

آرٹ، ادب اور سائنس کے علیحدہ علیحدہ حصے ہونے لگے۔ کافی ہاؤس سے جو خبر جاتی تھی اسے ڈیسک نمائندہ (Correspondence desk) کی جانب سے چھاپا جانے لگا۔

پیرس میں پہلا کافی ہاؤس 1672 میں کھلا۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس میں کافی کی ابتداء اس وقت ہوئی کہ جب لوئی XIV کے دربار میں ترکی کا سفیر سلیمان آغا کافی اپنے ساتھ لایا اور اس سے مہمانوں کی تواضع کی۔ لیکن یورپ میں کافی ابتداء میں امراء تک محدود تھی کیونکہ یہ بہت مہنگی تھی۔ 1600 لوئی XV اپنی بیٹی کے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے 15 ہزار ڈالر کی رقم اس پر خرچ کرتا تھا لیکن جب کافی دنیا کے اور ملکوں میں پہنچی اور اس کی کاشت شروع ہوئی تو یہ آہستہ آہستہ لوگوں تک پہنچ گئی اور سستی بھی ہوگئی۔

دنیا میں کافی ہاؤسز بہت جلد ادیبوں، شاعروں، اور فن کاروں کا مرکز بن گئے کہ جن کی وجہ سے علمی و ادبی بحث و مباحثے شروع ہوئے اور لوگوں تک نئے خیالات پہنچے۔

برصغیر ہندوستان میں یہ کافی ہاؤسز کولونیل دور میں آئے اور بہت جلد یہ دانشوروں کا مرکز بن گئے۔ انہوں نے سماج کی سیاسی، تہذیبی، اور فکری ترقی میں جو حصہ لیا ہے، اس پر ابھی تحقیق کی ضرورت ہے۔

❁❁❁❁❁

نقطہء نظر

اکبر: بدلتے ہوئے حالات میں

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ میں ماضی کے واقعات اور شخصیتوں کو زمانہ حال کی روشنی میں ایک نئے انداز سے دیکھنے، اور تجزیہ کرنے کی روایت رہی ہے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ واقعات اور شخصیتیں جو تاریخ میں گم ہو جاتی ہیں، یا جنہیں وقت فراموش کر دیتا ہے، وہ زمانہ حال کے سیاسی، معاشی اور سماجی ضروریات کے تحت تاریخی گمنامی سے واپس آ جاتی ہیں، تاکہ ان کی مدد سے حال کے مسائل کا تجزیہ کیا جائے یا مخصوص طبقاتی مفادات کا تاریخی جواز فراہم کیا جائے۔ جب یہ مقاصد پورے ہو جاتے ہیں تو یہ واقعات اور شخصیتیں ایک بار پھر تاریخ کے صفحات پر گم ہو جاتی ہیں۔

اس سلسلہ میں وہ واقعات اور شخصیتیں اہم ہو جاتی ہیں کہ جنہوں نے اپنے عہد میں قدیم و جدید روایات کے درمیان کش مکش اور تصادم میں اہم کردار ادا کیا ہوتا ہے، کیونکہ اسی کش مکش کے نتیجہ میں سماج بدلتا ہے اور ٹھٹھرا ہوا ماحول نئی توانائی حاصل کرتا ہے۔ یہ کش مکش آنے والے زمانوں میں قدامت پرست اور جدیدیت کے حامیوں کو تاریخی دلائل فراہم کرتی ہے۔

اس تناظر میں جب اکبر کی شخصیت کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی ذات اور خیالات، اس کے اپنے عہد میں بھی متنازعہ رہے تھے۔ کیونکہ اس نے مغل سلطنت کے بنیادی ڈھانچے کو تبدیل کر کے ریاست کے اداروں کو وسیع بنیادوں پر تشکیل دیا اور وہ اقدامات کئے کہ جن کی وجہ سے سماج کی روایات پر ضرب پڑی۔ ایک ایسی تاریخی شخصیت جو نئی فکر اور سوچ دیتی ہے، وہ ہمیشہ ہی تنقید کا نشانہ بنتی ہے۔ لیکن یہی شخصیتیں وقت کو آگے کی جانب لے جاتی ہیں اور

جمود کو توڑتی ہیں۔

اس وجہ سے اکبر اپنی زندگی میں، اور وفات کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں بحث ومباحثہ کا موضوع رہا ہے ایک زمانہ تک اکبر کو مغل سلطنت کا حقیقی بانی اور معمار کہا جاتا رہا تھا کہ جس نے مغل سلطنت کو نہ صرف وسعت دی بلکہ اس کو استحکام بھی دیا۔ 19 صدی کے آخر میں جب مورّخ اور مسلم اشرافیہ خصوصیت سے ہندوستان میں مغل زوال کے اسباب پر بحث کر رہی تھی تو اس کی ابتداء شخصیتوں کے حوالے سے ہوئی: ایک عمومی تاثر جو اس عہد کی تاریخوں میں ملتا ہے، ان میں مغل زوال کا ذمہ دار اورنگ زیب کو ٹھہرایا گیا کہ جس کی مذہبی پالیسیوں نے ہندوؤں کو ناراض کر دیا اور اس کی انتہا پسندی کے نتیجہ میں مغل سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوگئی۔ لیکن 19 صدی کے اواخر میں جب اردو، ہندی کے حوالہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات بڑھنا شروع ہوئے، تو اس مرحلہ پر مسلم کمیونٹی کے ایک گروہ کی جانب سے یہ نقطہ نظر آیا کہ مغل زوال کا اصل سبب اکبر تھا کہ جس نے ریاست میں ہندوؤں کو شامل کر کے اور مشترک کلچر کی بنیاد رکھ کر اسلام کی شناخت کو کمزور کر دیا۔ اس موضوع پر اخبارات میں مضامین شائع ہونے لگے اور علی گڑھ کالج میں یہ موضوع ایک مباحثہ کے لئے چنا گیا۔

اس نقطہ نظر نے مسلم اشرافیہ اور ہندوستان کی دوسری اقوام کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا۔ مسلم اشرافیہ میں علماء اور قدامت پسند شامل تھے۔ جب دوسری جانب ہندو، انگریز، اور لبرل سوچ کے مسلمان شامل تھے، جو اکبر کے بجائے اورنگ زیب کی شخصیت کو زوال کا سبب بتاتے تھے۔

اکبر کے حامیوں کی دلیل تھی کہ راجپوت شہزادیوں سے شادی اور ہندو رسم ورواج کو اختیار کر کے، اکبر نے مغل ریاست کو ہندوستانی شکل دیدی اور مشترک کلچر کی وجہ سے ہندو اس ریاست کا ایک اہم حصہ بن گئے، جن کی مدد سے اس نے سلطنت کو وسعت دی اور ہندوستان میں ایک ایسے سماج کی بنیاد ڈالی کہ جو مذہبی نفرت اور تعصب سے بالاتر تھا۔ اس لئے اکبر زوال کا باعث نہیں بلکہ مغل سلطنت کو استحکام دینے والا ہے۔

اکبر کے بارے میں ایک دوسرا نقطہ نظر بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ابھرا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب برصغیر میں ہندو، مسلم فرقہ واریت کی ابتداء ہو چکی تھی۔ اس مرحلہ پر سیاسی طور پر دو نقطہائے نظر ابھرے: ایک یہ کہ ہندوستان میں مشترک کلچر رہا ہے لہٰذا اس کی بنیاد پر متحدہ قومیت

کی بنیاد ہونی چاہئے تا کہ کولونیل ازم کے خلاف موثر جدوجہد ہو سکے۔ دوسرے نقطہ نظر کے تحت ہندو اور مسلمان دو علیحدہ کمیونٹیز تھیں جو ایک دوسرے سے جدا تھیں۔ اس مرحلہ پر دو شخصیتوں کے ذریعہ مشترک کلچر اور علیحدگی کا تاریخی جواز پیش کیا گیا۔ اکبر مشترک کلچر کی علامت تھا، تو شیخ احمد سرہندی (1564-1624) علیحدگی کے حامی اور مبلغ تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں علماء کے تاریخی کردار کو ابھارا ہے۔ ان ہی میں سے ایک شیخ احمد سرہندی ہیں۔ ان کی شخصیت کو ابھارنے اور ان کے کارناموں کو شاندار بنانے کے لئے ضروری تھا کہ اکبر اور اس کے عہد کو برائیوں، خرابیوں، اور بدعتوں سے منسوب کیا جائے۔ خاص طور سے یہ ثابت کیا جائے کہ اس کے عہد میں اسلام انتہائی کسمپرسی کے عالم میں تھا اور اس کے مخالف دین اسلام کو تہس نہس کرنے پر آمادہ تھے۔ مولانا آزاد اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ

> عہد اکبری کی بدعات تخت و تاج حکومت کے زور سے ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اور علماء سوء و مشائخ دنیا پرست خود ان کے احداث و اشاعت کے نقیب تھے۔ کون تھا جو اس وقت امن و عافیت کے مدرسوں اور سلطانی و فرماں روائی کی خانقاہوں سے نکلتا اور دعوت و عزیمت کی امتحان گاہوں میں قدم رکھتا؟..... توفیق الٰہی نے حضرت ممدوح (احمد سرہندی) کے وجود گرامی ہی کے لئے یہ مرتبہ خاص دیا تھا۔ یعنی مقام عزیمت و دعوت کا خلعت صرف انہی کے جسم پر چست آیا۔ (1)

آگے چل کر مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ '' کیسے کیسے اکابر موجود تھے۔ لیکن مفاسد وقت کی اصطلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا صرف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا۔''(2)

ابوالکلام آزاد اگر چہ کانگرس کے اہم راہنما رہے۔ مگر انہوں نے اکبر اور شیخ احمد سرہندی کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی کبھی تردید نہیں کی۔ انہوں نے تاریخ کو محض مذہب کے تنگ نقطہ نظر سے دیکھا اسی لئے وہ اکبر کے عہد میں ہونے والی ذہنی ترقی، اور کلچرل رنگا رنگی کو نظر انداز کر گئے۔ چونکہ وہ مورخ نہیں تھے، مولوی تھے، اس لئے تاریخ کی وسعت کو انہوں نے

مذہب کے تکنائے میں رکھ کر اس کا تجزیہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کو سمجھنے کے لئے غلط راہیں متعین ہو گئیں۔

جب خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے بعد فرقہ واریت پوری طرح ابھری، تو علماء کے حلقوں میں خصوصیت سے اکبر اور شیخ احمد سرہندی کی شخصیتوں کو بطور مقابل ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔ اب اکبر کی شخصیت کو جس رنگ اور انداز میں پیش کیا گیا اس میں وہ دین اسلام کا دشمن، مخالف، اور گمراہ شخص تھا، اس کے برعکس احمد سرہندی کی ذات میں وہ تمام خوبیاں اور اوصاف تھے کہ جن کی وجہ سے انہوں نے اکبر کی مذہبی پالیسی کا مقابلہ کرتے ہوئے اسلام کو اس بحران سے نکالا۔

1938 میں مولانا مناظر حسن گیلانی نے ''الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ'' مضمون لکھا۔ اس کا تعارف کراتے ہوئے مولانا منظور نعمانی نے لکھا کہ: ''انڈیا ایکٹ 1935 کے تحت جنرل الیکشن ہونے کے بعد تمام صوبوں میں نیم آزاد حکومتیں قائم ہو چکی تھیں جن میں سے سات صوبوں میں کانگرس کی حکومت تھی جس کے طرزِ عمل سے پہلی دفعہ یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو کن مسائل کا سامنا ہوگا۔''(3) لہٰذا وہ قارئین کو مشورہ دیتے ہیں کہ مناظر احسن گیلانی کے مضمون کو اس تناظر میں پڑھنا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح اکبر کے زمانہ میں اسلام خطرے میں تھا، ایسے ہی خطرات سے وہ آگے چل کر دوچار ہونے والا تھا، لہٰذا ان کے نزدیک علماء ہی اسلام کو ان خطرات سے بچا سکتے تھے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے اس مضمون کی بنیاد ملا عبدالقادر بدانی کی کتاب ''منتخب التواریخ'' اور شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات پر رکھی ہے، اور سب ہیڈنگ میں اسے ''الٰہی مذہب یا ہندوستان کا فتنہء اکبری'' لکھا ہے۔ انہوں نے بدایونی کے بیان پر اکبر کے خلاف ایک طویل فہرست ترتیب دی ہے کہ جس کو پڑھنے کے بعد اکبر لادین، ملحد، گمراہ نظر آتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر سماجی اصلاحات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ جیسے اس نے زنا، سود، اور شراب کو حلال کر کے تمام سماج کو کھلی چھٹی دیدی تھی۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ اس کے بغیر شیخ احمد سرہندی کے کارنامے پوری طرح سے ابھر کر سامنے نہیں آتے۔ شیخ احمد سرہندی کے ایک خط کے ذریعہ اس صورت حال کو ثابت کیا گیا ہے:

ایک قرن میں اسلام کی نوبت اس درجہ کو پہنچی کہ اہل کفر صرف اس پر راضی نہیں ہیں کہ محض کفر کے احکام کا علانیہ اسلامی ہند میں اجراء ہو جائے وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکل مٹا دیئے جائیں اور اسلام و مسلمانوں کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ یہ بات یہاں تک پہنچائی گئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان اسلام کے کسی شعار کا اظہار کرتا ہے تو اسے قتل کے انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ (4)

اس مضمون کا مقصد یہ تھا کہ 1920 اور 1930 کی دہائیوں میں سیاست میں جو تبدیلیاں آ رہیں تھیں، اسے علماء کا طبقہ اپنے حق میں نہیں سمجھ رہا تھا۔ ان حالات میں ان کی دلیل یہ تھی کہ اکبر کی بجائے کہ جو مشترک کلچر کا حامی تھا، شیخ احمد سرہندی کی ضرورت ہے جو علیحدگی کے ذریعہ اسلامی شناخت کو ہندوستان میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نقطہ نظر کے تحت مولانا آزاد کی طرح وہ علماء کو مسلم کمیونٹی کی سربراہی کا حقدار سمجھتے تھے۔

اکبر کی سیاسی حیثیت اس وقت مزید متنازعہ ہوئی کہ جب 1942ء میں کانگرس پارٹی کی جانب سے اس کی 400 سالہ سالگرہ منائی گئی۔ جواہر لال نہرو نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوؤں نے اکبر کو اپنا سمجھ کر تسلیم کر لیا تھا اور وہ اس کے مداح ہو گئے تھے۔ مگر اسے کچھ مسلمان حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جب اس کی 400 سالہ سالگرہ منائی گئی تو اس میں تقریباً تمام طبقات کے لوگ مسلمانوں سمیت شامل ہوئے، لیکن مسلم لیگ بحیثیت سیاسی جماعت کے اس سے دور رہی۔ کیونکہ اکبر ہندوستان کے اتحاد کی علامت تھا۔ (5)

1947 میں جب ملک تقسیم ہوا، تو پاکستان میں اکبر کی شخصیت کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا گیا۔ اشتیاق حسین قریشی نے اپنی کتاب ''برصغیر میں ملتِ اسلامیہ'' میں لکھا کہ اکبر نے ہندوستان میں جب سیاست کو نئے انداز میں ترتیب دیا، تو اس کی وجہ سے یہ تبدیلی آئی کہ اب تک ریاست پر مسلمانوں کا تسلط تھا، اس کے بعد مغل سلطنت مسلمانوں کی نہیں رہی اور وہ مسلمانوں کی حمایت سے محروم ہو گئی۔ مسلمان اب اس پر بھروسہ نہیں کرتے تھے جیسے وہ سلاطین دہلی کے عہد میں اس سے جڑے ہوئے تھے۔ اب مسلمان بھی دوسروں کی طرح ایک جماعت ہو گئے جو ریاست

کے عہدوں اور سلطنت کی حفاظت کرنے والوں میں سے تھے۔ اکبر نے اس طرح ہندوستان میں اسلام کو کمزور کر دیا۔ اشتیاق حسین قریشی مزید لکھتے ہیں کہ اکبر نے جب ہندوؤں کو سلطنت کے امور میں شریک کر لیا، تو ان کی وہ تلوار جو ایک وقت سلطنت کی حمایت میں اٹھتی تھی، بعد میں ان کے خلاف اٹھی۔ (6)

شیخ عبدالرشید نے ''پاکستان کی مختصر تاریخ'' میں اکبر کے بارے میں لکھا کہ اگر مسلمان اکبر کی پالیسی کے مطابق متضاد عقائد اور مذہبی رجحانات کو اختیار کر لیتے تو اس صورت میں نہ صرف ان کی شناخت ختم ہو جاتی بلکہ بحیثیت قوم ان کا وجود ختم ہو جاتا۔ (7)

پاکستان کی تاریخ نویسی میں اکبر کو اس لئے تنقید کا نشانہ بنایا گیا کیونکہ وہ متحدہ ہندوستانی قومیت، ملٹی کلچر، اور مختلف مذاہب میں اشتراک کی علامت تھا۔ اس کے برعکس پاکستان میں مذہبی انتہا پسندوں اور قدامت پرستوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ پاکستان کو خالص اسلامی ملک ہونا چاہئے کہ جہاں قومیت کی بنیاد مذہب پر ہو۔ لہٰذا اکبر کے مقابلہ میں شیخ احمد سرہندی کو ''دوقومی نظریہ'' کا بانی قرار دیا گیا کہ جنہوں نے اس بات کے لئے بھرپور جدوجہد کی کہ ہندو اور مسلمانوں میں کسی قسم کا کلچرل اشتراک نہ ہو۔ دونوں مذاہب اور دونوں کمیونٹیز کو بالکل علیحدہ علیحدہ رکھا جائے۔ اس تناظر میں اکبر کی بجائے شیخ احمد سرہندی کی شخصیت پاکستان کی سیاست میں اہم بن کر ابھری۔ اور پاکستان کی نصاب کی کتابوں میں اس نقطہ نظر کو پیش کیا گیا۔ (8)

اگرچہ جدید تحقیق میں اکبر کے بارے میں جو غلط فہمیاں تھیں، ان کا ازالہ کیا جا چکا ہے مگر پاکستان میں اب تک اس کی شخصیت کو متنازعہ سمجھا جاتا ہے۔ اب تک یہ خیال عام ہے کہ اکبر نے دین الٰہی کے نام سے ایک نیا مذہب جاری کیا تھا۔ ابوالفضل جو اکبر کے دربار کا اہم مورخ تھا اس نے کہیں بھی دین الٰہی کی اصطلاح کو استعمال نہیں کیا ہے بلکہ ''آئین'' میں اسے ''آئین راھنمونی'' کہا ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ: جب ہر فرد اپنے لئے ایک دین منتخب کرتا ہے تو وہ دوسروں سے جدا ہو جاتا ہے اور ہر گروہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ حق پر ہے اور دوسرے گمراہ۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کسی دین اور مذہب میں کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے،

بلکہ یہ ایک دلآویز حسن ہے۔ ہر شخص اپنے عقائد میں پکا نظر آتا ہے مگر جب وہ اس یک رنگی سے واقف ہو جاتا ہے تو اس وقت اس پر تقلید کا پردہ کھلتا ہے۔ لیکن چونکہ دوسرے لوگ ذہنی طور پر پختہ نہیں ہوتے ہیں اس لئے وہ اس امر کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس پر عمل کرتا ہے تو اسے کافر اور ملحد کہا جاتا ہے۔ (9)

بعد کے مورخوں نے ''دین الٰہی'' کی اصطلاح کو استعمال کر کے یہ تاثر دیا کہ اکبر نے شاید پیغمبری کا دعویٰ کر دیا تھا اور ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی تھی۔ اب تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ''رھنمونی'' سے اس کی مراد ایک سلسلہ قائم کرنا تھا کہ جس کا گرو وہ تھا اور اس کو ماننے والے اس کے چیلے تھے۔ یہ سلسلہ محدود رہا، اور اس کے کوئی بہت زیادہ اثرات نہیں ہوئے۔

اکبر نے اپنے عہد کو ''صلح کل'' کی پالیسی سے متاثر کیا۔ صلح کل اور اس کے مذہبی خیالات میں کوئی بہت زیادہ تعلق نہیں تھا۔ جب اس نے 1562 میں راجپوت شہزادی سے شادی کی، اس وقت، وہ ایک مذہبی نوجوان تھا۔ لیکن اس نے اپنے مذہبی عقائد کے باوجود شہزادی کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ 1563 میں اس نے متھرا ہندو یاتریوں پر جو ٹیکس تھا اس کا خاتمہ کر دیا۔ 1564 میں جزیہ کے نفاذ کو ختم کر دیا۔ اس کی ان اصطلاحات نے ہندوؤں میں اس احساس کو پیدا کیا کہ وہ مسلمانوں کے برابر ہیں اور مغل سلطنت ان کی حامی اور محافظ ہے۔ اکبر نے صلح کل کی جس پالیسی کی تشکیل کی اس کی بنیاد، اس کے نظریہ بادشاہت پر تھی کہ جس میں بادشاہ خدا کی تمام مخلوق سے محبت کرتا ہے اور فرقہ وارانہ تعصبات سے بلند ہو کر سب کے ساتھ برابر کا سلوک کرتا ہے۔ اکبر خود کو تمام رعایا کا بادشاہ سمجھتا تھا چاہے ان کا مذہب وعقیدہ کچھ ہی ہو۔

اکبر نے خود خط شاہ عباس والی ایران کو بھیجا، اس میں صلح کل کی وضاحت کرتے ہوئے ابوالفضل نے لکھا کہ:

> خدا کی عام رحمت کو سارے ادیان و مذاہب میں شامل جانتے ہوئے پوری کوشش سے اپنے کو صلح کل کی سدا بہار باغ میں لا کر ہمیشہ اپنے اقبال مند مطالعہ کا نصب العین رکھنا چاہئے کہ خدائے قادر مختلف مذاہب اور متنوع حالات والی مخلوقات پر اپنے فیض کا دروازہ کھول کر ان کی پرورش

کرتا ہے۔ لہٰذا سلاطین جو زمین پر خدا کے سائے ہیں ان کے ذمہ لازم ہے کہ اس طریقہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ کیونکہ خدائے جہاں آفریں نے اس بلند مرتبہ گروہ کو ظاہری زندگی کے انتظام اور عام مخلوق کی پاسبانی کے لئے پیدا کیا ہے تا کہ یہ مخلوق کے مختلف طبقوں کی عزت کی حفاظت کریں۔ (10)

صلح کل کی پالیسی کے تحت اکبر نے ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے دیئے۔ ان کی مقدس کتابوں کے ترجمے کرائے، ان کے تہواروں کو منانا شروع کیا، گائے کی قربانی بند کی، دربار کی رسومات و آداب میں ہندوستانی روایات کو اختیار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل سلطنت صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہی، اس میں ہر مذہب وعقیدے کے لوگ شامل ہوئے اور اس طرح اس کو ایک توانائی دی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آخری مغل بادشاہ تک، مغل ریاست نے ہر دباؤ اور صدمہ کو برداشت کیا۔ جب یہ زوال پذیر ہو رہی تھی، اس وقت بھی ہندوستان کے عوام میں اس کا وقار تھا۔ سکھوں، مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں اور انگریزوں، ان سب کے لئے مغل بادشاہ ہندوستان کی حکمرانی کی علامت تھا۔ 1857 میں باغیوں نے بھی مغل بادشاہ کے گرد جمع ہو کر جنگ آزادی لڑی۔ یہ اکبر کی ڈالی ہوئی روایات تھیں کہ جن پر مغل ریاست آخری وقت تک قائم رہی۔

اب سوال یہ ہے کہ اکبر نے جو ماڈل دیا، کیا موجودہ حالات میں اس سے کچھ سیکھا جا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں جو اہم باتیں ہیں وہ یہ ہیں کہ اکبر نے اپنے زمانے میں علماء کے اثر ورسوخ کو ختم کیا، کیونکہ ان کی مذہبی انتہا پسندی اور تنگ نظری سماج میں اختلافات اور تعصبات کا باعث تھی۔ اس کے برعکس اس نے مذہبی آزادی پر زور دیا، مثلاً 94-1593 میں کی گئی اصلاحات میں کہا گیا کہ اگر کوئی ہندو کسی وجہ سے مسلمان ہو گیا ہو اور وہ واپس اپنے مذہب جانا چاہتا ہو تو اسے اس کی اجازت ہے۔ کوئی کسی کے مذہب میں دخل نہ دے۔ اگر کوئی اپنے طور پر مذہب بدلنا چاہتا ہے تو اسے اس کی اجازت ہے۔ ہر مذہب کے ماننے والوں کو اجازت ہوگی کہ اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرائیں۔

صلح کل کی پالیسی نے مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگوں کو آپس میں ملا دیا جس نے ایک

مشترک کلچر کو پیدا کیا۔ مذہب کے نام پر کسی کا استحصال نہیں کیا گیا۔ مذہبی بحث ومباحثہ کی آزادی تھی۔ اکبر کا عبادت خانہ (1578) کا تجربہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ جہاں اس نے تقریباً ہر مذہب کے علماء کو بلا کر ان کے مذہب وعقیدے کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں۔

ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ کیا پاکستان کے موجودہ حالات میں ہمیں صلح کل کی ضرورت ہے، یا دوسروں سے علیحدہ ہو کر اپنے دائرہ میں محدود ہو کر، اسی میں گردش کرتے رہنا چاہتے ہیں؟

حوالہ جات

1- ابوالکلام آزاد: تذکرہ۔ مکتبہ عالیہ لاہور، 1999، ص 67-266

2- ایضاً: ص 264

3- مولانا منظور نعمانی: تذکرہ مجدد الف ثانی۔ دارالاشاعت کراچی 1978، ص 24

4- مناظر احسن گیلانی: مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ: تذکرہ مجدد الف ثانی، ص 76-77

5- جواہر لال نہرو:

The Discovery of India Reprinted, OUP Delhi 1994, P.349

6- آئی۔ ایچ۔ قریشی:

The Muslim Community of the Indian Sub-Continent. The Hague 1962, PP. 167-68.

7- شیخ اے رشید:

A Short History of Pakistan. Karachi 1967, P. 493

8- مبارک علی:

Akbar in Pakistani textbooks in: *History on Trial,* Fiction House Lahore 1999, PP. 76-82.

9- ابوالفضل: آئین اکبری۔ (اردو ترجمہ مولوی محمد فدا علی) جلد اول، لاہور (سنہ ندارد) ص 305-307

10- دبستان مذاہب (اردو ترجمہ) ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور 2002، ص 48-347

❁❁❁❁❁

تاریخ کے بنیادی مأخذ

تذکرۃُ الواقعات

مصنف: جوہر آفتابچی
ترجمہ: سید معین الحق

گیارہویں فصل

بادشاہ کا امرکوٹ کی جانب روانہ ہونا اور راستہ میں جنگ ہونا

جب مالدیو کے متعلق یہ خبر معلوم ہوئی کہ وہ درپے آزار ہے تو بادشاہ امرکوٹ کی جانب روانہ ہوئے اور حکم نافذ کیا کہ روشن بیگ کوکہ اور شمس الدین محمد لشکر سے باہر جائیں اور راہبر بلا کر لائیں تا کہ وہ امرکوٹ کے راستہ کی رہبری کر سکیں۔ چنانچہ وہ دونوں روانہ ہو گئے اور دو شتر سوار لے کر خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکم ہوا کہ ان کے اونٹ طویلہ میں باندھ دیئے جائیں اور ان کی تلواروں کو قبضہ میں لے کر ان کو نظر میں رکھیں۔ قاضی مہدی علی نے ان کو نصیحت کی اور سمجھایا کہ تم رہبری کرو، تم کو انعام واکرام ملے گا۔ لیکن وہ دہقانی تھے، کہنے لگے کہ ہم راستہ کیا جانیں، اس کے بعد خنجر نکال کر ترموں [1] بیگ کے مارا۔ اس نے اپنی زندگی کی امانت موت کے خزانچی کے سپرد کردی۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

اس کے بعد طویلہ میں جا کر اس نے اونٹ اور بادشاہ کے خاصے کے خچروں کو خنجر سے مارا۔ اس وقت سرکار میں کل دو گھوڑے اور ایک خچر تھا۔ اس واقعہ پر آدمی جمع ہو گئے اور ان دونوں دیہاتیوں کو مار ڈالا۔ لوگ حیرانی اور پریشانی میں رہے یہاں تک کہ منتشر ہونے کا ارادہ کیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ہمیں چھوڑ کر کہاں جاؤ گے۔ تمہارے پاس کوئی دوسری جگہ نہیں ہے۔ خواجہ کبیر اور خواجہ عبیر اور مہتر رمضان جن پر کامل اعتماد تھا، مالدیو کے پاس چلے گئے۔ آخر کار یہ قرار پایا کہ قبلہ کی سمت روانہ ہوں اور امراء آگے آگے چلیں، ان کے پیچھے بادشاہ، صبح ہونے تک اسی ترتیب سے چلتے رہے۔ (اس وقت) سواروں کی تین فوجیں عقب سے آتی ہوئی نظر پڑیں، ہر فوج میں پانچ سو کے قریب آدمی ہوں گے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ امراء کہاں گئے۔ عرض کیا کہ راستہ بھول گئے ہیں۔ دریافت کیا کہ یہ جماعت جو پیچھے سے آرہی ہے دشمنوں کی ہے یا دوستوں کی، پھر حکم دیا

کہ جو اسباب گھوڑوں پر ہے، اس کو اونٹوں پر لادا جائے اور وہ آدمی جو پیدل چل رہے ہیں گھوڑوں پر سوار ہو جائیں اس وقت کل سولہ سوار تھے۔ (2) بادشاہ نے شیخ علی بیگ سے دریافت کیا کہ کیا کرنا چاہئے۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت امام حسین کی لڑائی کا سا وقت ہے۔ کوشش کرنی چاہئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ شہید ہو جائیں گے۔ شیخ علی بیگ نے پھر عرض کیا کہ حضرت میرے حق نمک کو معاف فرمائیں اور حق خدمت میں اپنا معاف کرتا ہوں۔ چند سوار بندے کے ہمراہ عنایت ہوں تا کہ میں جا کر خبر لاؤں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ بادشاہ نے سات سواران کے ہمراہ کر دیئے۔ (3) اور حق نمک معاف کر کے اس کی سلامتی کی دعا کی۔ اور رخصت کر دیا۔ شیخ علی بیگ نے اپنے مصاحبوں سے کہا کہ ہم تعداد میں تھوڑے ہیں اور وہ بہت زیادہ۔ ہم الگ الگ چلیں اور جب قریب پہنچیں تو تیر برسانے لگیں۔ فتح مندی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جو کچھ بھی نتیجہ ہو۔ اس جماعت نے ایسا ہی کیا۔ اور جب قریب پہنچے تو تیر اندازی شروع کر دی، خدا کے حکم سے فتح حاصل ہوئی۔ ان باغیوں میں سے دو سو تیروں سے زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑے۔ ان کا گرنا تھا کہ تمام لشکر کو شکست ہوئی اور بری طرح مغلوب ہوئے۔ اس کے بعد شیخ علی بیگ نے بہبود چوب دار سے کہا کہ بادشاہ کو جا کر مبارک باد دو اور اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کرو۔ بہبود مذکور نے بدنصیب (شکست خوردہ) سپاہیوں کے سر کاٹ کر اپنے زین کے فتراک میں باندھ لئے اور بادشاہ کے پاس چل دیا۔ جوں ہی بادشاہ کی نظر اس پر پڑی، پوچھا یہ کون سوار آتا ہے۔ آدمیوں نے انداز سے بتایا کہ بہبود چوبدار معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ نے اس کی آمد کو نیک فال سمجھا اور فرمایا کہ انشاء اللہ بہبود ہی ہوگا۔ (4) اسی اثنا میں بہبود پہنچ گیا اور دشمنوں کے سر بادشاہ کے سامنے پیش کر کے مبارکباد عرض کی۔ بادشاہ نے فرمایا کہ شیخ علی بیگ کو بلاؤ۔ بہبود واپس جا کر شیخ علی بیگ کو بلا کر لے آیا۔ بادشاہ نے اس سے دریافت کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت بادشاہ (5) ہماری کشتیوں کو ملاحظہ فرما کر آگے بڑھیں اور ہم سب سپاہی پیچھے سے آتے ہیں چنانچہ یہ لوگ اسی طرح روانہ ہوئے۔

واقعہ اُن امراء کا جو راستہ میں بھٹک کر جدا ہو گئے تھے

یہ لوگ گائیں بھینسیں جیسلمیر سے لوٹ مار کر کے لائے اور ایک حوض کے کنارے اُترے اور عیش و عشرت میں مشغول تھے کہ بادشاہ وہاں پہنچ گئے۔ تمام امراء نے دوڑ کر بادشاہ کی قدم بوسی

کا شرف حاصل کیا۔ بادشاہ نے وہیں نزول فرمایا اور جو واقعہ ہوا تھا ان لوگوں نے بادشاہ سے بیان کیا۔ تمام امراء نے معافی چاہی اور افسوس کیا کہ ایسے وقت پر ہم خدمت کرنے سے محروم رہے۔ ہاتھ اُٹھا کر دعا کی کہ خدایا رسول اللہ اور ان کی اولاد کے طفیل میں حضور کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رہے۔ القصہ دو قاصد جیسلمیر سے آئے اور کہا کہ راجہ مالدیو نے حضور کو بلایا ہے اور کہا ہے کہ ہمارے ملک میں گائے ذبح نہیں کی جاتی اور آپ نے یہاں آ کر گائے ذبح کی، یہ اچھا کام نہیں کیا۔ ہم آپ کے راستہ پر موجود ہیں، آپ (ہم سے بچ کر) کہاں جا سکتے ہیں۔ بادشاہ نے امراء سے دریافت کیا کہ ان قاصدوں کو کیا جواب دینا چاہئے۔ امراء نے عرض کیا کہ نرمی سے کام نہیں چلتا بلکہ تلوار سے چلتا ہے حکم دیجئے کہ ان قاصدوں کو گرفتار کر لیں اور یہاں سے کوچ کر کے روانہ ہو جائیں۔ جیسلمیر میں پہنچے تھے کہ گنواروں نے آ کر جنگ شروع کر دی ایک نیزہ پیر محمد اختہ کے لگا اور ناف کے پار ہو گیا۔ شیخ علی بیگ پیر محمد کے پاس دوڑ کر آیا، اس گنوار کو قتل کر کے پیر محمد کو چھڑا لیا، ایک دوسری تلوار روشنک بیگ توشک بیگی کے سیدھے ہاتھ میں لگی اور اس کا ہاتھ بیکار ہو گیا۔ اس کے پاس ترش بیگ دوڑ کر آیا اور اسے بچا لے گیا۔ دوسری تلوار جو گنوار نے ماری ترشن بیگ کے ہاتھ میں لگی اور اس کی بیچ کی دو اُنگلیاں کٹ گئیں۔ ظہر کے وقت جنگ شروع ہوئی تھی اور عصر کے قریب گنوار لوگ اپنے قلعہ کے اندر آ گئے جیسلمیر سے پانچ کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں تھا۔ بادشاہ وہیں تشریف لے گئے اور خیمہ نصب کئے۔ اس گاؤں میں غلہ اور پانی کافی موجود تھا۔ مگر آدمی کم تھے۔ راجہ جیسلمیر نے اپنے بیٹے کو جس کا نام مالدیو تھا اس کام کے لئے مقرر کیا کہ پہلے سے وہاں پہنچ کر جہاں جہاں کنواں ہو اس کو ریت سے پُر کر دے تا کہ بادشاہ کی فوج پانی نہ ملنے سے عاجز ہو جائے، اس نے ایسا ہی کیا اور تمام کنوؤں کو ریت سے بھر دیا۔ بادشاہ نے وہاں سے کوچ کیا اور دوپہر کے وقت ایک کنویں کے کنارے پر پہنچے، لیکن جس کنویں میں بھی ڈول ڈالتے تھے پانی نہیں نکلتا تھا۔ تب معلوم ہوا کہ تمام کنویں ریت سے پُر کر دیئے گئے ہیں۔ وہاں سے روانہ ہو کر ظہر اور عصر کے درمیان دوسرے کنویں پر پہنچے اور ٹھہر گئے اور فرمانے لگے کیا اس کنویں میں بھی پانی نہیں۔ رات ہو چکی تھی اس لئے مجبوراً قیام کیا اور ساری رات نہایت ہوشیاری سے چاروں طرف اونٹوں کا محاصرہ[6] کئے رہے اور اونٹوں کے اس حلقہ سے باہر بادشاہ خود گشت کرتے رہے، یہ خبر شیخ علی بیگ کو پہنچی وہ حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ حضور آرام

فرمائیں، یہ غلام اونٹوں کے حلقہ کی خبر گیری کرے گا۔ اس پر بادشاہ اپنے خیمہ میں تشریف لائے اور سو گئے۔ شیر خاں نے ایک افغان کو اس غرض سے بھیجا کہ موقع پا کر بادشاہ کو قتل کر دے۔ اس نے بادشاہ کی تلوار جو بادشاہ کے پہلو میں رکھی ہوئی تھی چپکے سے نکال لی اور میان سے نصف ہی کھینچی تھی کہ لوگوں نے اس کو دیکھ لیا، اس نے تلوار رکھ دی اور باہر آ گیا۔ چوں کہ بادشاہ بیدار ہو چکے تھے، تلوار کو میان سے نکلا ہوا دیکھ کر بہت تعجب کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ سیدل خان عرف سنبل (7) خدمت گار پلنگ کے پاس سو رہا تھا۔ اس سے پوچھا کہ یہ تلوار میان سے تو نے نکالی ہے، اس نے کہا کہ بندے کی کیا مجال۔ بہر حال معاملہ یوں ہی رفت گزشت ہو گیا اور وہاں سے چل کر ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں چار کنویں تھے، تین کنوؤں میں پانی تھا اور ایک سوکھا تھا۔ تینوں کنوؤں میں سے ایک بادشاہ کے لئے ایک تردی بیگ کے لئے اور منعم بیگ کے لئے اور تیسرا خالد بیگ پسر میر خلیفہ، ندیم بیگ کو کہ، روشن بیگ کو کہ، میر مظفر ترکمان، علی بیگ اور ترشن بیگ کو دیا گیا۔ ڈول کسی کے پاس نہیں تھا۔ ڈول کے بجائے دیگ کو باندھ کر کنویں میں ڈالتے تھے اور اس میں اونٹ کو باندھ کر ہانکتے تھے اور جب دیگ اوپر کھینچ کر ہاتھ آ جاتی تھی تو نقارے بجاتے تھے۔ اس کے بعد خبر ہوتی تھی اور کنویں میں رسی پھر ڈالی جاتی تھی اس طرح بہ ہزار دقت پانی حاصل ہوتا تھا۔ پانی کی خاطر آپس میں جھگڑا بھی ہو جاتا تھا اور (پھر بھی) پانی فراخی سے نہیں ملتا تھا۔ ملازمین کی ایک جماعت بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ تردی بیگ اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ پانی رکھتا ہے اور جب ہم اس کنویں کے پاس جا کر اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کے لئے پانی طلب کرتے ہیں تو وہ پانی دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ حضور اس کو (تردی بیگ) کو تاکید کر دیں، ورنہ ہماری اس سے لڑائی ہو جائے گی۔ اور انجام کار ہم مارے جائیں گے۔ یا پانی حاصل کر کے رہیں گے۔ بادشاہ نے سوچا کہ اس میں بڑی خرابی ہو گی، پس بادشاہ بہ نفس نفیس گھوڑے پر سوار ہوئے اور کنویں پر تشریف لے گئے اور ترکی زبان میں فرمایا کہ غلاموں کے خیالات تمہاری طرف سے اچھے نہیں، تھوڑی دیر کے لئے اپنے آدمیوں کو پانی بھرنے سے روک دو۔ چنانچہ تردی بیگ نے اپنے آدمیوں کو پانی بھرنے سے روک دیا۔ شاگرد پیشہ لوگوں نے پانی بھرا۔ بعض آدمیوں کو پانی ملا اور بعض کو نہیں ملا۔ مختصر یہ کہ وہاں بھی پانی کی سخت تکلیف رہی۔ اس کے بعد راجہ جیسلمیر کا بیٹا سنبھل (8) باندھ کر سامنے سے نمودار ہوا اور حاضری کی غرض سے اپنے ایک آدمی کو بادشاہ کی

خدمت میں روانہ کیا اور کہلوا دیا کہ رائے مالدیو نے آپ کو بلایا تھا۔ آپ نے اس کی حکومت میں گائے ذبح نہیں کی اس لئے آپ سے کوئی زیادتی نہیں ہوئی اس بد بخت نے غداری کی اور یہ اس کی نالائقی اور بدنصیبی تھی۔ بہتر ہوا کہ آپ ایسی ناپاک جگہ سے نکل آئے۔ چوں کہ آپ اس طرف متوجہ ہوئے تھے، مناسب تھا کہ بندہ کو مطلع فرما دیتے، میں خدمت بجا لاتا، جیسا کہ زمینداروں کا قاعدہ ہے تشریف لائے اور ہماری ولایت میں گائے ذبح کی، ہندو اس چیز کو معیوب خیال کرتے ہیں، اگر اس مقام پر قیام فرمائیں تو بیل اور ڈول منگواؤں اور پانی سے حوض کو بھروا دوں۔ آپ کے آدمی اور چرواہے سیراب ہو کر پانی پی لیں، خادم کے وہ آدمی جن کو آپ نے قید کر لیا ہے، بے گناہ اور بے قصور ہیں ان کی رہائی کا حکم فرمایا جائے۔ تردی بیگ نے آ کر عرض کیا کہ ان ایلچیوں کو رہا کر دیا جائے۔ چنانچہ ان کو رہا کر کے رخصت کر دیا۔ بادشاہ نے خیال کیا کہ یہ اچھے آدمی ہیں اور فرمایا کہ اگلی منزل پر صرف ایک کنواں ہے، پانی کی قلت کی وجہ سے وہاں لوگ تکلیف اُٹھائیں گے۔ اس لئے تین جگہ تقسیم ہو کر ہم چلیں تا کہ کنویں کا پانی سب کو مل جائے۔ چنانچہ بادشاہ، تردی بیگ، تمر بیگ، خالد بیگ اور روشن بیگ کو کہ کے ہمراہ روانہ ہوئے، اس کے بعد منعم بیگ، ندیم کوکلتاش اور کچھ اور لوگ روانہ ہوئے، اور آخر میں شیخ علی بیگ مع چند دوسرے لوگوں کے روانہ ہوئے۔ باوجود اس طریقہ سے چلنے کے بھی بہت سے لوگ پیاس کی شدت سے ہلاک ہو گئے۔ وہاں سے دس کوس پر امرکوٹ قصبہ تھا۔ روشن بیگ نے آ کر اپنا گھوڑا حضرت بیگم سے لے لیا، جب یہ خبر بادشاہ کو پہنچی تو بادشاہ نے اپنا گھوڑا حضرت بیگم کو عنایت کیا اور خود پا پیادہ روانہ ہوئے۔ اس کے بعد حکم دیا کہ آفتاب خانہ (9) سے اونٹ نکالا جائے، تا کہ ہم اس پر سوار ہوں، اونٹ لایا گیا بادشاہ اس پر سوار ہوئے، ایک کوس گئے ہوں گے کہ خالد بیگ کو معلوم ہوا اور اس نے اپنا گھوڑا بادشاہ کو پیش کیا، بادشاہ اس گھوڑے پر سوار ہوئے، اور سات سواروں کے ہمراہ امرکوٹ کے قلعہ کے اندر داخل ہوئے (10) رانا نے اپنے تینوں بھائیوں کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجا، وہ حاضر ہوئے اور رکاب بوسی کے بعد اُنہوں نے عرض کیا کہ آج اچھی گھڑی نہ تھی۔ علی الصباح آپ کے استقبال کے لئے (رانا خود) تشریف لائیں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ کا لشکر جو پیچھے رہ گیا تھا پہنچ گیا۔ دوسرے دن رانا نے حاضر ہو کر شرف رکاب بوسی حاصل کیا۔ اور عرض کیا کہ حضرت کی تشریف آوری مبارک ہو، یہ خادم دو ہزار سوار سودہ قوم کے اور پانچ ہزار قوم

شحنہ (11) کے جو ہمارے جدی برادر ہیں، کل سات ہزار سوار تیار ہیں، اور دل و جان سے کوشش کر کے ٹھٹھہ اور بھکر کا تمام ملک بادشاہ کے قبضہ میں لے آئیں گے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ہمارے پاس خزانہ نہیں ہے کہ تیراندازوں کو دیا جائے۔ ہاں امراء کے پاس روپیہ ہے، ہم ان سے لے لیں گے، شاہ محمد خراسانی نے عرض کیا کہ مجھے وہ جگہ معلوم ہے جہاں امراء کا روپیہ رکھا ہوا ہے۔ بادشاہ نے اپنے کپڑے دھلنے کے لئے دیئے تھے، اور غسل کے کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے تھے۔ ایک جانور اُڑتا ہوا خیمہ کے اندر آ گیا، بادشاہ نے خود کھڑے ہو کر دروازہ بند کیا اور اس کو پکڑ لیا۔ قینچی منگوا کر اس کے پر کاٹے اور مصور سے فرمایا کہ اس کی نشست کی تصویر کاغذ پر کھینچی جائے اس کے بعد جانور کو جنگل میں چھوڑ دیا جائے۔ پھر حکم دیا کہ امرا طلب کئے جائیں۔ جب تمام امراء آ گئے تو فرمایا کہ وہ روپیہ دیں نوکر جائیں اور شاہ محمد خراسانی کے ہمراہ جہاں کہیں بھی روپیہ ملے لے آئیں۔ دیگ اور طبق کے سوا جو کچھ اسباب امراء کے خیموں میں ملے لے آئیں۔ آدمیوں نے دوڑ کر امراء کے اونٹوں کے ہودے، تھیلے اور بیگ کاٹ ڈالے، روپیہ اور قیمتی کپڑے نکال لائے اور (کل سامان) حضور کے سامنے پیش کر دیا۔ ایک ضعیفہ نے اس حال میں اپنا صندوقچہ حسین قورچی کو بطور امانت سپرد کیا کہ امن و امان ہونے تک امانتہً اس کو اپنے پاس رکھے۔ حسین مذکور اس صندوقچہ کو باہر لے جا رہا تھا کہ حافظ محمد سلطان عرف رخنہ نے اس کو گرفتار کر لیا اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جب صندوقچہ کھولا گیا تو سونے کی تین اینٹیں اور سونے کی جڑاؤ چند اشیاء اور بیالیس طلائی اشرفیاں (12) برآمد ہوئیں۔ کافور کو حکم ہوا کہ حسین کے کانوں کی گدیاں کاٹ کر چھوڑ دیا جائے۔ کافور نے پورا کان کاٹ ڈالا، بادشاہ کو اس پر بڑا غصہ آیا کہ پورا کان کیوں کاٹا، رومال منگوایا اور اس کے کان کو اپنے ہاتھ سے باندھا اور بہت دل جوئی کی اور کافور کو ملازمت سے برطرف کر دیا، اور امراء کا جو کچھ مال ہاتھ آیا تھا، اس میں سے نصف مالکوں کو واپس کر دیا اور باقی نصف نوکروں کو عنایت فرمایا، کپڑوں میں سے دو حصہ مالکوں کو واپس کئے گئے اور ایک حصہ خاصہ کے لئے رکھا گیا۔

اس کے بعد رائے رانا سے دریافت کیا کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ اس نے عرض کیا کہ ٹھٹھہ جانا چاہئے اور جون (13) کے مقام پر قیام کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس گرد و نواح کے آدمی خدمت والا میں حاضر ہوں گے نیک ساعت دیکھ کر بادشاہ نے کوچ کا ارادہ کیا (14) اور اپنے

اہل وعیال کو قلعہ امرکوٹ میں چھوڑا، اور سفر کو روانہ ہوئے، بارہ کوس پر ایک حوض تھا، معہ لشکر کے وہاں قیام فرمایا۔

حوالہ جات

1- تذکرۃ الواقعات کے نسخوں میں ترسوں بیگ کو ترسم بنگ لکھا ہے۔ ترسوں بیگ بابا جلائر کا لڑکا تھا۔ (اکبرنامہ دفتر اول صفحہ 181)

2- احمد دین صاحب نے اپنے ترجمہ میں اَسّی سوار لکھے ہیں۔

3- ارسکن نے بیس سوار لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ مشہور مورخ نظام الدین احمد کا باپ بھی شیخ علی بیگ کے ساتھ تھا۔ (جلد دوم صفحہ 245)

4- اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بہتری ہی ہوگی۔

5- اس جگہ عبارت میں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ دہلی اور علی گڑھ کے نسخوں کے الفاظ اس طرح ہیں: ''کہ حضرت بادشاہ کشتی ہائے ایں بندگان را دیدہ پیش بردند و بندگان سپاہی حضرت دیدہ از عقب می آیم'' اسٹورٹ کا ترجمہ یہ ہے: ''اگر حضور والا آگے تشریف لے چلیں تو میں اپنے سات سو سواروں کے پیچھے سے حفاظت کرتا ہوا چلوں گا۔'' چوں کہ اسٹورٹ کا ترجمہ قابل اعتبار نہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے پیش نظر نسخہ کی عبارت کیا ہوگی (صفحہ 40)

6- ہم نے لفظی ترجمہ کیا ہے۔ حاصل ترجمہ یہ ہے کہ لشکر کے چاروں طرف اونٹوں کو حفاظت کے لئے کھڑا کیا تھا۔

7- گلبدن بیگم نے بھی ایک سنبل کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ ہزار سواروں کا افسر تھا۔ چوں کہ جوہر صاف لکھتا ہے کہ سنبل خدمتگار تھا، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سردار سنبل نہیں بلکہ معمولی ملازم ہے جس کا ذکر دوسری تاریخوں میں نہیں۔ (گلبدن بیگم۔ ہمایوں نامہ صفحہ 66)

8- سنبھل۔ اصل نسخوں میں اسی طرح لکھا ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ کاتبوں نے کس لفظ کو بدلا

ہے۔ اسٹورٹ صاحب اپنے ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ ''اس وقت جودھپور کے راجہ کا لڑکا اپنے ہاتھ میں ایک سفید جھنڈا لے کر ہمارے سامنے آیا'' ارسکن نے بھی یہی لکھا ہے کہ راجہ جیسلمیر کا لڑکا سفید جھنڈا لے کر آیا۔ (جلد دوم صفحہ 248)

9- جوہر کا مقصد لفظ ''آفتاب خانہ'' سے فوج کا وہ حصہ (دستہ) جس کی سپرد پانی لے جانے کا کام ہوگا، اسٹورٹ اور ارسکن نے ''محکمہ آفتابہ'' لکھا ہے۔ (ارسکن جلد دوم صفحہ 249 اسٹورٹ صفحہ 42)

10- گلبدن بیگم لکھتی ہیں۔ ''بہ عمرکوٹ رسیدند کہ جائے خوب ست وتالاب بسیار دارد۔ رعنا پیشو از حضرت آمد ودرون قلعہ بردمنزلی خوب دادومردم امراء را بیرون قلعہ جاداد'' (صفحہ 58)۔ ابوالفضل نے اس کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے۔ ''دہم جمادی الاول بعد از عسرت معیشت وتنگی آب دان حصن حصین کہ مطلع نرجلال ومخزن گوہر اقبال ست، شرف نزولی ارزانی داشتند، حاکم قلعہ رانا پرساد نام داشت قدوم عالی را پیرایہ افتخار دولت خود دانستہ خدمات پسندیدہ بہ تقدیم رسانید'' ارسکن نے بھی رانا کا نام پرساد لکھا ہے لیکن تاریخ معصومی میں پیرسال ہے (تاریخ معصومی صفحہ 177 اکبرنامہ۔ دفتر اول صفحہ 182)۔

11- فارسی نسخوں میں ان قوموں کے نام سودھ اور شحنہ لکھے ہیں۔ سودہ تو مشہور راجپوت قبیلہ جس کا راجا امرکوٹ میں حکومت کرتا تھا۔ شحنہ۔ گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ اور تذکرۃ الواقعات کے اس نسخہ میں جو ارسکن کے پیش نظر تھا سمنچہ لکھا ہے۔ چنانچہ انگریز مورخین نے اپنی کتابوں میں بھی سمنچہ ہی رکھا ہے۔ سندھ گزیٹر میں ہندو اقوام کی جو فہرست دی ہوئی ہے اس میں یہ نام شامل نہیں لیکن راجپوت قبیلوں میں سحتہ یا سہتہ نام کا ایک قبیلہ موجود ہے۔ (گلبدن بیگم ہمایوں نامہ صفحہ 59۔ سندھ گزیٹر جلد دوم صفحہ 187۔ ارسکن جلد دوم ص250)۔

12- اصل نسخوں میں طلائی اشرفیاں لکھا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کاتبوں نے طلائی کو علائی بنا دیا ہے۔ اسٹورٹ نے بھی گولڈ مہر ترجمہ کیا ہے۔

13- جون۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ یہ مقام دریائے سندھ کے کنارے پر واقع تھا اور اپنی شادابی اور پیداوار کے لحاظ سے اس ملک کے مشہور مقامات میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ (اکبرنامہ دفتر

اول صفحہ 185۔ جیرٹ ترجمہ آئین اکبری جلد دوم صفحہ 340)۔

14- جوہر نے اس کا ذکر نہیں کیا لیکن دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ کا باپ شاہ حسین مرزا کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا اور راجہ کی خواہش تھی کہ اُس سے انتقام لے، اسی وجہ سے اس نے راجہ کو مشورہ دیا ہے کہ ٹھٹھہ و بھکر کا علاقہ فتح کر کے واپس لینا چاہئے۔ (طبقات اکبری صفحہ 207۔ گلبدن بیگم ہمایوں نامہ صفحہ 58)۔

بارہویں فصل

شاہزادہ عالمیان محمد اکبر خلد اللہ ملکہ کا امرکوٹ میں پیدا ہونا

حوض کے کنارے پر مقیم تھے کہ صبح کی نماز کے وقت ایک قاصد امرکوٹ کے قلعہ سے آیا اور بادشاہ کے دربار میں مبارک باد پیش کرتے ہوئے عرض پرداز ہوا کہ حق تعالیٰ نے ایک نیا مہمان یعنی فرزند دلبند حضور کے کاشانہء دولت کو مرحمت فرمایا ہے۔

پشت دو تائے فلک راست شد از خرمی
تا چو تو فرزند زاد مادر ایام را

اس خبر کے سننے سے بادشاہ بہت مسرور ہوئے۔ شہزادہ خلد اللہ ملکہ کی پیدائش سنیچر کے دن چودہویں شعبان کو ہوئی تھی (1) چودہویں رات کے چاند کو بدر کہتے ہیں۔ محمد اکبر غازی بدرالدین والدنیا دونوں عالم کے چمکانے والے درگاہ شاہی میں تشریف فرما ہوئے۔ جلال الدین اور بدرالدین ایک ہی نام ہے اور شب قدر کی سی روشنی کسی شب میں نہیں ہوتی۔ پس اس چودہویں رات کی روشنی کا اثر ظاہر ہے جس نے دونوں جہان کو روشن کر دیا۔

الغرض جب بادشاہ نماز سے فارغ ہوئے تو امراء سلام کرنے حاضر ہوئے اس کے بعد بادشاہ نے اس بندہ خاکسار جوہر آفتابچی سے فرمایا کہ ہم نے تم کو ایک امانت سپرد کی تھی۔ عرض کیا، بے شک۔ پوچھا وہ کیا تھی؟ عرض کیا کہ دوسو شاہرخی اشرفیاں، ایک نقرئی دستانہ اور ایک مشک کا نافہ۔ اشرفیاں اور دستانے حضور کے ارشاد کے بموجب ان کے مالکوں کو واپس کر دیئے گئے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ وہ اشرفیاں اور دستانے ہم نے تم کو عنایت کی تھیں تم نے واپس کیوں دیدیں۔

فقیر نے عرض کیا کہ حضور کے حکم سے۔ حکم ہوا نافہ لاؤ، فقیر نے خدمت میں پیش کیا، پھر بادشاہ نے فرمایا کہ چینی کی ایک پلیٹ لاؤ، وہ لائی گئی، بادشاہ نے مشک کے نافہ کو کھولا اور امراء کو بلا کر مشک تقسیم کیا اور فرمایا کہ یہ اس فرزند دلبند کی خوشی میں ہے جو حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ہم کو عنایت فرمایا ہے۔ تمام آدمیوں نے دعا کی اور مبارک باد پیش کی اور اس دن اسی منزل پر قیام فرمایا اور رسمی خوشیاں منانے میں مصروف رہے۔ پس اے عزیز! اسی خوشبو سے دنیا کے چاروں رکن معطر ہیں۔ شام کی نماز کے وقت وہاں سے روانہ ہوئے، پانچویں منزل پر اترے ہی تھے کہ بادشاہ نے دریافت فرمایا کہ جانی بیگ قزاق جو امرکوٹ کا حاکم تھا کہاں ہے؟ مخبر نے عرض کی جون کے مقام پر مقیم ہے۔ وہاں سے پانچ سو سوار سمیچہ (2) اور پانچ سو سوار سوڈھا اور ایک سو مغل شیخ علی بیگ کے ساتھ ایک جماعت ہو کر روانہ ہوئے۔ دیکھا کہ جانی بیگ ایک جماعت کے ساتھ پانی کے کنارے کھڑا ہے۔

اس کے پہنچتے ہی وہ جماعت فرار ہوئی اور جانی بیگ کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے چند آدمی مارے گئے لیکن جانی بیگ اپنی جان بچا کر نکل گیا۔ مگر اس کے سپاہی کام آئے۔ اس کا ایک مغل جس کے چہرے پر بہت گہرا زخم لگا تھا مرزا قلی چولی کے ہاتھ آیا، وہ اس کو پکڑ کر بادشاہ کی خدمت میں لایا اور ترکی زبان میں عرض کیا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے حضور کو نالائق کہا تھا۔ فرمایا کہ اپنی سزا کو پہنچا۔ اسے اسی حالت میں چھوڑ دو (3) اور حکم دیا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوئے ہیں ان سب کو قتل کر دیا جائے۔

وہاں سے کوچ کر کے مقام جون پہنچے۔ مقام جون پر فتح حاصل کر کے ایک سرسبز و شاداب باغ میں قیام کیا اور وہ تمام زمیندار جو بادشاہ کی مدد کے لئے آئے ہوئے تھے اس باغ کے چاروں طرف جمع ہوئے۔ حکم ہوا کہ باغ کے چاروں طرف خندق کھودی جائے، ایک شخص کو متعین کیا کہ شہزادے اور اہل وعیال کو کچھ دن بعد مقام جون پہنچا دے۔ بتاریخ 20 رمضان امرکوٹ سے چل کر جون پہنچے اور اپنے ولی نعمت کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف قدم بوسی حاصل کیا۔ شہزادہ کی پیدائش کے پینتیس دن کے بعد ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی۔ (4)

اب پھر اصل واقعات کی جانب متوجہ ہوتا ہوں۔ قلعہ سوہان کے محاصرہ کے وقت ایک بندوقچی قلعہ کے اندر سے صحیح نشانہ لگا رہا تھا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ایک دن ایسا ہوگا کہ یہ بندوقچی اور

وہ چور جس نے نصف تلوار میان سے باہر نکالی تھی اور بچ کر فرار ہو گیا تھا، ہمارے ہاتھ آ جائیں گے۔ بادشاہ کے دل میں یہ دو ارمان تھے، خدا کے حکم سے یہ دونوں شخص جون کے ایک محلّہ میں ایک شراب فروش کے گھر پر بیٹھے بڑے فخر سے اپنے کارنامے بیان کر رہے تھے اور گذشتہ واقعات کو فخر سے دہرا رہے تھے۔ اتفاقاً یہ باتیں بادشاہ کے آدمیوں نے سن لیں اور ان کو پکڑ کر درگاہ عالی میں لے آئے۔ بادشاہ نے گذشتہ واقعات دریافت کئے اور تفنگچی کے قتل کا حکم صادر فرمایا اور دوسرے کو انعام واکرام بخشا اور گردونواح کے آدمیوں کو حکم دیا کہ حاضر خدمت ہوں۔ چناں چہ سوڈھا، سمیچہ، کچ اور جام کے رانا جو اس سے پیشتر بھڑک کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے حاضر خدمت ہوئے۔ تقریباً پندرہ سولہ ہزار سوار جمع ہو گئے۔ شاہ حسین مرزا کیمپ سے چار کوس کے فاصلہ پر دریا کے کنارے مقیم تھا، ایک دن افطار کے وقت ماہ رمضان میں حضرت کے دست مبارک میں پانی تھا کہ اطلاع ملی کہ ترشن بیگ فرار ہو گیا۔ اس خبر سے خسرو ہند کو قدرے تکلیف پہنچی۔ فرمایا خدایا! جوان مرجائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور قضا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر لگا۔ جب ترشن بیگ فرار ہو کر شاہ حسین مرزا کے پاس گیا تو اس نے ایک غلام اس کو عطا کیا تھا۔ اس غلام سے ایک قصور ہو گیا تھا۔ جس پر ترشن بیگ نے اس کی ناک کاٹ لی۔ تین دن ہوئے تھے کہ اس غلام نے ترشن بیگ کا سر کاٹ لیا(5) بہرحال نصیرالدین محمد ہمایوں بادشاہ غازی نوراللہ مضجعہ صاحب کرامات ضرور تھے، اور بادشاہ کی کرامت چالیس اولیا کے برابر ہوتی ہے۔ بادشاہوں سے کرامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ "ولقد کرمنا بنی آدم"، (6) خصوصاً جو خدا کا خلیفہ ہو۔ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ خلافت کہاں سے عطا ہوتی ہے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

شاہ حسین مرزا نے رانائے مذکور کو ایک خلعت ایک اچھا خنجر اور کچھ شاہی تحفے بھیجے، اور لکھا کہ ہماری خیرخواہی کرو۔ رانا نے وہ خلعت بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ حکم ہوا مناسب ہوگا کہ یہ خلعت کتے کو پہنا دی جائے۔ رانا نے ایسا ہی کیا۔ اور خلعت کتے کو پہنا دیا۔ اور خنجر اس کی کمر میں باندھا۔ یہ خبر شاہ حسین مرزا کو پہنچی۔ بہت شرمندہ ہوا۔ اس کے بعد خواجہ غازی (7) اور رانا میں کچھ نامناسب اور سخت وسست گفتگو ہو گئی۔ رانا نے برافروختہ ہو کر کہا مغلوں کی خدمت کرنا بے سود ہے اور وہاں سے کوچ کر کے روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی سارے زمیندار منتشر ہو گئے۔ بادشاہ نے بہت دلاسا دیا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔

دوسرے دن منعم بیگ فرار ہو کر شاہ حسین مرزا کے پاس آ گیا اور اس سے کہا کہ بادشاہ نے میدان میں اپنے خیمے نصب کئے ہیں اور کوئی پناہ گاہ بھی اس وقت نہیں ہے۔ یہ خبر بادشاہ کو پہنچی۔ حکم دیا کہ قلعہ [8] کو درست کریں اور ہر چہار طرف خندق کھودیں۔ اپنے دست مبارک میں عصا لے کر قلعہ کو جگہ جگہ سے مختلف لوگوں میں تقسیم کرنے لگے اور فرمایا کہ نہایت تیزی کے ساتھ ٹھیک کر لیں۔ تین دن میں قلعہ تیار ہو گیا۔ جب شاہ حسین مرزا نے آ کر قلعہ تیار دیکھا۔ تو منعم بیگ سے کہا کہ جو کچھ تو نے کہا تھا واقعہ اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ جانبین میں جنگ چھڑ گئی اور محمود گردباز شہید ہو گیا۔ پھر خبر ملی کہ گجرات سے بیرم بیگ آ رہا ہے۔ بادشاہ نے تمام امراء کو اس کے استقبال کے لئے روانہ کر دیا۔ وہ حاضر ہوا۔ اور قدم بوسی کی۔ بادشاہ اس سے بہت خوش ہوئے۔ خدا کا شکر کیا کہ ہمارے دکھ درد کا شریک آ گیا۔ [9] رات کافی ہو چکی تھی کہ شاہ حسین غلام بچہ نے قلعہ کے نزدیک آ کر نفیری بجائی۔ آواز کے سنتے ہی بیرم بیگ روشن بیگ اور دیگر امراء قلعہ سے نکل آئے اور اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے بادشاہ نے بیرم بیگ کو قلعہ کے اندر آ جانے کے لئے حکم صادر کیا اور کہا کہ روشن بیگ و دیگر امراء تعاقب کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب وہ شاہ حسین کے لشکر کے قریب پہنچا تو اس کے (شاہ حسین) سردار بابر قلی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ روشن بیگ نے نیزہ مار کر اس کو نیچے گرا دیا۔ اتنے میں کسی نے روشن بیگ کے گھوڑے کی ٹانگ [10] پر تلوار ماری۔ گھوڑا لشکر میں آ کر زمین پر گر پڑا۔ کیونکہ توپچاق گھوڑے کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے سوار کو منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

اس کے بعد شیخ علی بیگ کو حکم دیا کہ چاچکا [11] کے مقام پر جا کر رسد وغیرہ کے پہنچانے کا انتظام کریں۔ شیخ علی بیگ نے فوراً وہاں پہنچ کر رسد بھجوائی۔ اس خبر کے سنتے ہی شاہ حسین مرزا نے سلطان محمود بھکری کو بادشاہ کے لشکر میں رسد رسانی کے ذرائع بند کرنے کے لئے متعین کیا اس پر بادشاہ نے فوراً الم تمر سلطان [12] کو شیخ علی بیگ کی امداد کے لئے روانہ کیا۔ جب الم تمر سلطان شیخ علی بیگ کے پاس پہنچا تو اس کو (شیخ علی بیگ کو) اس کا پہنچنا ناگوار ہوا کیونکہ اس نے سوچا کہ جب ہم تنہا تھے تو قزاقی کر کے بھی نقصان پہنچا سکتے تھے لیکن اب اس کا موقع نہیں دونوں برابر ہو گئے، اب مجبوراً دونوں کو بالمقابل جنگ کرنا ہو گی۔

چناں چہ آپس میں لوٹ پلٹ ہونے لگی۔ اس اثنا میں بادشاہ نے فرمایا کہ تین چار مرتبہ شاہ حسین مرزا جنگ کے ارادہ سے آیا ہے۔ اگر اب صبح کو پھر آیا تو ہم بھی باہر نکل کر جنگ کریں گے اور اس کا تعاقب کریں گے۔ اسی حالت میں دعا مانگی اور وہ گھوڑے جو نااہل لوگوں کے پاس تھے، لائق آدمیوں کے سپرد کئے گئے اور یہ طے پایا کہ کل جنگ ہوگی۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ افطار کے بعد ایک پہر رات گزری تھی کہ ایک شخص دریا کی جانب سے آیا اور کہا کہ ایک آدمی دریا کے اس کنارے پر کھڑا کشتی مانگ رہا ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دریافت کرو کون آدمی ہے۔ جو اس وقت کشتی مانگ رہا ہے۔ لوگوں نے اس سے دریافت کیا تو کون ہے کہ کشتی طلب کرتا ہے؟ اس نے کہا میں اسن تمر (13) سلطان۔ یہ خبر بادشاہ کے پہنچائی گئی۔ فرمایا خدا خیر کرے! الغرض کشتی اس کے پاس لے گئے۔ اس نے حاضر خدمت ہو کر علی بیگ کے شہید ہو جانے اور اپنے شکست کھانے کا پورا قصہ بتایا۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ صبح کو جنگ کریں گے کہ یہ واقعہ پیش آیا۔ اس شب کو بادشاہ اس درجہ فکرمند رہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

شاہ حسین مرزا ہتھیار اور اسباب تیار کر کے جنگ کے لئے سوار ہو جانا چاہتا تھا کہ محمد حسین بے نواز (14) بھاگ کر اس کے پاس پہنچا اور عرض کرنے لگا کہ تمر سلطان کے لشکر نے شکست کھائی ہے اور شیخ علی بیگ مارا گیا۔ آج بادشاہ کے کیمپ میں یہ طے ہوا کہ قلعہ سے باہر آ کر جنگ کی جائے تو کہاں جاتا ہے۔ صورت حال بہت نازک ہے۔ ممکن ہے تمہاری وجہ سے ان کو اس پریشانی سے نجات مل جائے چند روز تک دونوں طرف سے آمد و رفت بند رہی۔ کچھ دن بعد شاہ مرزا نے اپنا کام درست ہوتا ہوا دیکھا تو بابر قلی کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ (15) وہ قند پارے اور کچھ میوے لے کر بادشاہ کی رکاب بوسی سے مشرف ہوا اور شاہ حسین مرزا کے قصور کی معافی چاہی اور کہا کہ وہ خود ندامت کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا۔

اس پر بادشاہ نے دریافت فرمایا کہ تو بڑا ہے یا روشن بیگ۔ دونوں نے اپنی عمر کے سال گنے حساب کرنے سے روشن بیگ کی عمر کم نکلی۔ پھر دریافت کیا کہ تم دونوں کے درمیان جنگ کیوں کر ہوئی۔ عرض کیا کہ روشن بیگ نے نیزہ مار کر بندہ کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا لیکن مار نہ سکا اور روشن بیگ کے گھوڑے کے ایک دوسرے شخص نے تلوار ماری۔ پھر فرمایا کہ شمشیر کا فیصلہ بہترین خصائل میں سے ہے۔ فوراً روشن بیگ سے ملو۔ بابر قلی نے روشن بیگ کو دریافت کیا اور آپس میں

ایک دوسرے سے معافی مانگ لی۔ بادشاہ نے بابر قلی کو رخصت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اب ہم اس جگہ سے کوچ کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1- اکبر کی پیدائش کی تاریخ کے متعلق ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ ابوالفضل، نظام الدین اور فرشتہ نے یکشنبہ پنجم رجب سنہ 949ھ بتائی ہے لیکن جوہر نے چودہ شعبان اور ہفتہ کا دن لکھا ہے۔ اس پر بعض مورخین نے قیاس آرائیاں کی ہیں مثلاً ڈاکٹر اسمتھ اپنی مشہور کتاب اکبر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں یہ دستور ہے کہ پیدائش کی صحیح تاریخ کو چھپا کر کوئی دوسرا دن بتلا دیتے ہیں چناں چہ اکبر کی تاریخ پیدائش میں بھی یہی عمل کیا گیا۔ صحیح تاریخ 14 شعبان کو چھپایا گیا اور سرکاری تاریخ 5 رجب مقرر کی گئی۔ اسمتھ کی یہ رائے اس لئے قابل تسلیم نہیں کہ گلبدن بیگم نے تاریخ پیدائش خود اکبر کی والدہ حمیدہ بانو بیگم سے دریافت کر کے لکھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جوہر کا بیان ایک خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تاریخ لکھنے میں غلطی کر گیا ہو۔ ابوالفضل، نظام الدین، فرشتہ اور معصوم کے علاوہ جہانگیر اپنی توزک میں صاف الفاظ میں لکھتا ہے کہ میں نے حکم دیدیا تھا کہ ہفتہ میں دو دن جانور ذبح نہ کئے جائیں'' یکے پنجشنبہ کہ روز جلوس من ست و دیگر یکشنبہ کہ روز تولد پدر من ست'' (اکبر نامہ دفتر اول ص 183۔ فرشتہ جلد دوم ص 411۔ طبقات اکبری ص 207۔ توزک جہانگیری ص 4۔ تاریخ سندھ ص 177) گلبدن بیگم نے (4 رجب اور اتوار کا دن لکھا ہے ص 59)۔ بایزید کی تاریخ ہمایوں و اکبر میں ''شب دوشنبہ ششم نہصد وچہل و شش'' ہے۔ یہ یقینی غلط ہے۔

2- اس نام پر پہلے نوٹ دیا جا چکا ہے۔ پیش نظر نسخوں میں اس جگہ سمیچہ ہے۔

3- اس واقعہ سے ہمایوں کی بردباری اور تحمل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

4- جوہر کے ان الفاظ سے اس کے پہلے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی 20 رمضان کو جب

اکبر مع اپنی والدہ کے جون کے مقام پر پہنچا تو وہ صرف ایک ماہ اور پانچ دن کا تھا، لیکن گلبدن بیگم کی عبارت یہ ہے ''درآں وقت جلال الدین اکبر بادشاہ شش ماہ بودند کہ در جون آوردند'' (ص59)۔

5- اس واقعہ کی تصدیق گلبدن بیگم کے بیان سے ہوتی ہے۔ (صفحہ 60)

6- قرآن شریف سورۂ بنی اسرائیل۔

7- خواجہ غازی کے اثر کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اُس کی بیوی نے اکبر کو دودھ پلایا تھا۔ وہ مالیات کا ماہر تھا اور اسی بنا پر ہمایوں بادشاہ نے اس کو اپنا دیوان مقرر کیا تھا۔ بیورج کا خیال ہے کہ خواجہ غازی کی بیوی مہم انگا تھی۔ (انگریزی ترجمہ اکبر نامہ۔ جلد اول صفحہ 130و134)

8- اس جگہ قلعہ سے مراد بس یہی ہے کہ خندق چہار طرف کھود کر لشکر گاہ کا فوری طور پر تحفظ کر لیا گیا تھا۔

9- بیرم خان، قنوج کی لڑائی کے بعد بھاگ کر سنبھل کے ایک زمیندار راجہ مترسین کے پاس پناہ گزیں ہوگیا تھا۔ لیکن راجہ نے شیر شاہ کے خوف سے اس کو شاہی آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ شیر شاہ نے بیرم خان کو عزت سے رکھا۔ لیکن بیرم خان موقع پا کر بھاگ نکلا اور اپنے ایک دوست ابوالقاسم کے ساتھ جو ہمایوں کے زمانۂ حکومت میں گوالیار کا حاکم تھا، گجرات پہنچ گیا۔ شیر شاہ کے ایک سفیر نے کچھ آدمی بیرم خان کو گرفتار کرنے کے لئے بھیجے لیکن ابوالقاسم، بیرم خان کی جان بچانے کے لئے خود کو بیرم خان کہہ کر گرفتار ہوگیا۔ اس طرح بیرم خان گجرات پہنچا اور وہاں سے کاٹھیاوار کے راستہ سے سندھ آیا اور جون کے مقام پر ہمایوں کے پاس آ گیا۔ اکبر نامہ میں یہ واقعہ موجود ہے۔

10- ہمارے پیش نظر نسخوں میں ''ساغری اسپ'' ہے۔ اسٹورٹ کے نسخہ میں شاید ساق ہوگا۔ ہم نے اسی بنا پر ترجمہ میں ''ٹانگ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ عربی میں ساق پنڈلی اور موزہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اسی معنی میں فارسی میں مستعمل ہے۔

11- چاچکا۔ تاریخ معصومی میں اس مقام کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔ ''ولایت چاچکان در معموری و آبادانی و کثرت زراعت و بسیاری غلہ ممتاز است'' صفحہ (168) لیکن تاریخ معصومی کے

لحاظ سے شیخ علی کو بتورہ کے قلعہ سے غلہ لانے کے لئے بھیجا گیا تھا (صفحہ 178)۔ ارسکن نے قلعہ کا نام نہیں لکھا ہے۔ غالباً جوہر کا مطلب چاچکا کے قریب وجوار سے ہے۔

12- الم تمر۔ تاریخ معصومی میں یہ نام اسن تیمور لکھا ہے۔ ارسکن نے ایشان تیمور لکھا ہے۔ (ارسکن جلد دوم صفحہ 260) (تاریخ معصومی صفحہ 189)۔

13- اسن تمر۔ ارسکن نے ایشن تیمور لکھا ہے۔

14- محمد حسین بے نواز۔ فارسی نسخوں میں ونیز اسٹورٹ کے ترجمہ میں اسی طرح لکھا ہے۔

15- جاسوس کا مطلب یہ تھا کہ ہمایوں اس قدر پریشان کہ اس کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ممکن ہے کہ لڑائی سے اس کی پریشانی دور ہو جائے۔ ارسکن کا خیال ہے کہ شاہ حسین کو خوف تھا کہ مغل سپاہ یاس کی حالت میں زیادہ کوشش کریں گے اور اس صورت میں یہ ہی مناسب ہوگا کہ لڑائی ملتوی کی جائے۔

تیرہویں فصل

شاہ حسین مرزا کا پیش کش اور بادشاہ کا قندھار کی جانب کوچ کرنا

جب بابر قلی شاہ حسین مرزا کی خدمت میں واپس آیا تو اس نے عرض کیا کہ بادشاہ کوچ کرنے والے ہیں۔ان کے سفر کے لئے کچھ سامان ہونا چاہئے۔القصہ یہ قرارداد آپس میں ہوئی کہ دو ہزار بورے (1) اور تین سو اونٹ غلہ سے لدے ہوئے رونائی (2) کے گاؤں میں پہنچادیں تا کہ وہ وہاں سے اپنا سامان وغیرہ درست کر کے جاسکیں۔بادشاہ نے اسباب کشتیوں میں رکھوایا اور رونائی کے موضع میں مقیم ہوئے غلہ اور اونٹ پہلے ہی سے وہاں پہنچ چکے تھے۔بادشاہ نے اس مقام پر غلہ اور اونٹ ہر ایک کے اسباب کے موافق تقسیم کر دیئے اور سیوھان کی جانب روانہ ہو گئے۔(3)

ناصر خسرو مرزا کو جو بادشاہ ہو جاتے اور شاہ حسین مرزا کی لڑکی کے ساتھ شادی کے وعدہ کی وجہ سے (جس کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا ہے) مفرور ہو گیا تھا۔نہایت ذلت اور رسوائی کے ساتھ (شاہ حسین نے) نکال دیا اور حکم دیدیا کہ مرزا یادگار ناصر کے ہر آدمی سے ایک شاہ رخی اور ہر اونٹ سے سات شاہ رخیاں اور ہر گھوڑے سے پانچ شاہ رخیاں وصول کر لیں۔الغرض مرزا یادگار ناصر بادشاہ سے جدا ہوا۔شاہ حسین مرزا نے ایسی بادشاہت اور دختر اسے دی کہ ہزار رسوائی اور ذلت کے ساتھ اس کو دریا کے پار نکلوا دیا گیا۔بہر حال اپنے ولی نعمت سے جدا ہو کر اس حالت کو پہنچا۔(4)

بادشاہ سیوھان سے کوچ کر کے دو راتوں میں فتح پور کنداوار پہنچ گئے اور دو رات سفر کرنے کے بعد وہ چشموں کے درمیان منزل کی جس میں سے ایک تلخ اور دوسرا شیریں تھا۔وہاں دریافت

کیا کہ ان میں سے کون سا چشمہ شیریں ہے۔ مخبر نے عرض کیا سات کوس پیچھے رہ گیا۔ بادشاہ نے اعتراض کیا کہ شیریں چشمہ پر کیوں قیام نہیں کیا۔ یہ اشارہ شاہ حسین مرزا کا تھا کہ اس راستہ اور اس چشمہ پر نہیں لے گئے۔ بلکہ لشکر کو تلخ چشمہ پر چھوڑ دیا۔ (بادشاہ) خود ایک قلیل جماعت کے ساتھ وہاں سے واپس ہوئے۔ ایک پہر رات گزری تھی کہ شیریں چشمہ پر نزول فرمایا۔ یہاں وضو کر کے نماز ادا کی اور میٹھا پانی پیا۔ آدمی وہاں سے پانی لے کر لشکر میں واپس آئے اور اس روز اسی جگہ مقیم رہے۔

عصر کے وقت وہاں سے کوچ کیا۔ منزل قریب ہی تھی کہ آفتاب خانہ کا اونٹ تھک کر بیٹھ گیا۔ بندہ خاکسار جوہر آفتاب چی نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اونٹ تھک جانے کے سبب آگے نہیں چل سکتا۔ آدمیوں کو حکم دیا کہ اس اونٹ پر سے سامان اتار کر منزل تک لے آئیں جو قریب ہی تھی۔ کسی شخص نے اس بات کی پروانہ کی۔ یہ اونٹ پیچھے تھا کہ لٹیرے آن پہنچے اور دست درازی اور تیر اندازی شروع کر دی۔ ایک تیر جوہر آفتاب چی کے آ کر لگا اور ایک تیر روئین توپ چی کے لگا۔ بندہ جوہر نے فریاد کی کہ لٹیروں نے آن گھیرا ہے اور خیموں کے علاوہ بوروں میں جو کچھ اسباب تھا لوٹ کر لئے جا رہے ہیں۔ اس جماعت نے بھی فریاد کی۔ بادشاہ نے جب یہ شور سنا تو فرمایا کہ یہ شور کیسا ہے۔ تردی بیگ نے عرض کیا کہ یہ ان آدمیوں کی آواز ہے جو کھیلتے ہوئے آ رہے ہیں۔ بادشاہ نے پھر فرمایا کہ وہ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا ہے۔ یہ کیسا کھیل ہے؟ اس پر خواجہ معظم گھوڑا دوڑا کر آئے اور دیکھا کہ ڈاکو تمام مال و اسباب چھین کر بھاگ گئے ہیں۔ اونٹ اور خیمے کو منزل پر لائے۔ وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک جنگل میں قیام کیا۔ جہاں کی زمین میں یہ اثر تھا کہ موسم گرما میں لو چلتی جس سے انسانی اعضاء سست ہو جاتے اور کام کرنے کے قابل نہ رہتے۔ (طبیعت پر) ہیجان طاری ہو جاتا اور موسم سرما میں ایسی ٹھنڈ پڑتی کہ اگر شوربا[5] دیگ سے نکال کر طباق میں رکھیں تو برف کی طرح جم جائے۔ غرض کہ کھانا اور کپڑا نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اس منزل پر ایسی مصیبت اور پریشانی اٹھائی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ بادشاہ کے پاس ایک پوستین تھی اس کے ابرے کو علیحدہ کر کے مہتر واصل کو طلب کیا اور فرمایا کہ اس پوستین کا بالائی حصہ بیرم بیگ کو پہنا دیں۔ کیوں کہ وہ سردی کھا گیا ہو گا اور ابرا مہتر انیس[6] کو جو اب مہتر خاں ہو گیا تھا عنایت فرمایا۔ وہاں سے روانہ ہو کر شال مستان[7] کے

مقام پر جو قندھار کا پرگنہ ہے پہنچ گئے۔ بادشاہ سلامت باغ میں قیام پذیر تھے کہ ایک آدمی نے سامنے آ کر سلام کیا اور کہا کہ مرزا عسکری کے متعلق بھی کچھ خبر ہے۔ فرمایا کہ تجھے کچھ خبر ہو تو بیان کر۔ عرض کیا کہ آدمیوں کو ہٹا دیجئے۔ وہ ایک طرف کر دیئے گئے، لیکن بندہ خاکسار جو ہر موجود رہا۔ اس نے کہا کہ اس کو بھی ہٹا دیجئے۔ فرمایا کہ لڑکا ہے، کوئی مضائقہ نہیں۔ اس نے عرض کیا کہ کل دن کے دوپہر سے پہلے پہلے مرزا عسکری آئے گا۔ وہ چاہتا ہے کہ حضور کے دشمنوں کی مدد کرے (بادشاہ) نے فرمایا کہ تجھے یہ خبر کہاں سے ملی۔ اس نے عرض کیا کہ میرا بیٹا مرزا مذکور کے ہمراہ آیا ہے۔ وہ کوتلی بیکھہہ میں ایک پہاڑی درے میں گزرے تھے (8) یہ تنہا تھا، جلد آ گیا۔ اس خبر کے سنتے ہی بادشاہ منزل پر واپس آئے۔ جو کچھ موجود تھا، اس سے روزہ افطار کیا، سحر کے وقت آش تیار کیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہندوستان کے آدمی عجیب وفادار ہوتے ہیں (9) پھر غلاموں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ خاطر جمع رکھو۔ انشاء اللہ تعالیٰ مقصد دوستوں کے مدعا کے مطابق پورا ہو گا۔ وہ بادشاہ کی سلامتی کے لئے دست بدعا ہوئے۔ بادشاہ نے فجر کی نماز ادا کی اور اس کے بعد آرام کے ساتھ سو گئے۔ اور لوگ بھی اِدھر اُدھر اپنے کاموں میں مشغول ہوئے۔ دوپہر کا وقت تھا کہ جنگل کی طرف سے ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور دریافت کرنے لگا کہ بادشاہ کیا کر رہے ہیں وہ بہت تیزی کے ساتھ آیا۔ آدمیوں نے کہا کہ اپنے گھوڑے کو اسی جگہ چھوڑ دو اور آگے چلے جاؤ اس نے نہ چھوڑا اور لگام اپنے ہاتھ پر لپیٹ کر خیمہ کے اندر آیا۔ بادشاہ سو رہے تھے۔ اس نے بیدار کر دیا۔ اور عرض کرنے لگا کچھ خبر بھی ہے؟ فرمایا نہیں۔ اس نے عرض کیا کہ مرزا عسکری آپ کی مخالفت کے لئے آ رہا ہے۔ اس سے دریافت کیا۔ تیرا نام کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ چوبی بہادر (10) قوم روز بیگ اور قاسم حسین سلطاں کا فرستادہ ہوں، بادشاہ نے فرمایا ٹھیک ہے، بیرم بیگ بلوایا گیا۔ اس سے مشورہ کیا۔ اس نے عرض کیا کہ اس جگہ سے روانہ ہو جانا چاہئے۔ بادشاہ نے فرمایا جنگ کرنا چاہئے۔ بیرم بیگ نے کہا کہ ہماری جماعت بہت قلیل ہے اور وہ ایک کثیر تعداد میں آئیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اس جگہ سے نکل جائیں۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ہمارے پاس دو قرابینیں (11) ہیں اور اکثر ملازم بندوقچی ہیں۔ اُن بدنصیبوں پر ہم آتش باری کریں گے۔ جو خدا چاہے گا وہی ہو گا۔ چوں کہ مرزا کا لشکر زیادہ تھا اور ان کے آدمی قلیل تھے۔ اس لئے روانگی ہی طے پائی (12) بادشاہ نے تردی بیگ سے گھوڑا طلب کیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ بہرحال حضرت

بیگم کو گھوڑے پر سوار کر کے لشکر سے باہر لے آئے اور روانہ ہو گئے۔ کل بیالیس نفر تھے۔ چالیس مرد اور دو عورتیں۔ ایک حضرت مریم مکانی بیگم صاحبہ اور دوسری حسن علی ایشک (13) آقا کی بیوی جو ایک بلوچ کی لڑکی تھی۔ تمام نوکر وغیرہ جو موجود تھے شاہزادے کی خدمت میں چھوڑ دیئے گئے۔ اس وقت شاہزادہ کی عمر ڈیڑھ سال کی تھی۔ خواجہ سکندر مرزا عسکری کے یہاں صدر تھے۔ وہ بادشاہ کے لشکر میں آئے۔ جب ان کو دیکھا تو کہا کہ مرزا کے آنے کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ کی خدمت سے شرف ہو جائیں۔ اس طرح جنگل میں کیوں چلے گئے۔ ایک گھڑی گذر گئی۔ مرزا عسکری بادشاہ کے کیمپ میں پہنچے۔ باوجود اس کے کہ شاہزادے کو مرزا کے سامنے لایا گیا اور مرزا نے اسے گود میں لیا۔ جو کچھ اسباب بادشاہ کے ساتھ تھا اس نے سب اپنے سامنے منگوایا۔ ایک صندوق بھی تھا جس میں عجیب وضع اور رنگ رنگ کے پتھر رکھے ہوئے تھے، چوں کہ وہ بھاری معلوم ہوتا تھا۔ اس کو لالچ پیدا ہوا۔ اور خیال کیا کہ سونا ہے۔ لیکن جب صندوق کھولا گیا تو پتھر نکلے۔ وہ بہت رنجیدہ ہوا۔ مختصر یہ کہ شہزادہ کو قندھار لے گئے (14) خاکسار جوہر آفتاب چی بھی شہزادے کے ہمراہ قندھار گیا۔ قندھار پہنچ کر جوہر آفتاب چی وہاں سے فرار ہو گیا۔ اور (15) ھری میں بادشاہ کی پا بوسی کا شرف حاصل کیا۔ بادشاہ نے اپنی مبارک زبان سے ارشاد فرمایا۔ جس وقت ہم لشکر سے علیحدہ ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ چالیس ہندستانی سوار اور دو عورتیں تھیں۔ ایک مریم مکانی بیگم۔ اور دوسری بلوچ کے خاندان کی۔ راتوں رات چلے جاتے تھے کہ ایک کتے کی آواز کان میں پہنچی۔ فرمایا اس جگہ آبادی ضرور ہے۔ اسی اثنا میں بلوچی آ گئے اور راستہ روک لیا۔ بادشاہ نے ارشاد فرمایا کہ ہم خود ان سے بات چیت کریں گے بلوچیوں نے دریافت کیا۔ تم کون لوگ ہو۔ بادشاہ نے فرمایا۔ ہم ہمایوں بادشاہ ہیں۔ بلوچیوں نے آپس میں گفتگو شروع کی کہ ملک خطی (16) اس طرف ہے، اور بادشاہ ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ ان کو ٹھہرائیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور والا اوپر تشریف لے آئیں۔ کسی کو بھیج دینا چاہئے تا کہ ملک خطی کو خبر کر دے۔ بادشاہ نے اس بلوچی عورت سے جو ہمراہ تھی دریافت کیا کہ یہ بلوچی کیا کہہ رہے ہیں۔ مسماۃ مذکور نے کہا کہ وہ آپس میں یہ کہہ رہے تھے کہ ملک خطی اس طرف ہے۔ اور بادشاہ ہمارے پاس پہنچ گئے ہیں۔ جس وقت تک ملک خطی آئے بادشاہ کو ٹھہرانا چاہئے۔ بلوچیوں نے کہا کہ تشریف لائے۔ اس کے بعد بادشاہ تشریف لے گئے۔ بلوچیوں کی اس جماعت نے سلام کیا۔ انہوں نے ایک قالین بچھایا۔

بادشاہ وہاں فروکش ہوئے۔ان کے پیچھے حضرت بیگم اور کچھ فاصلہ پر خواجہ عمیر تھے۔چوں کہ صبح ہو چکی تھی، بادشاہ نماز فجر ادا کرنے کھڑے ہو گئے۔نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ ملک خطی پہنچ گیا۔ بادشاہ نے فرمایا جب ملک خطی آ رہا تھا تو میرے دل میں یہ خیال گذرا تھا کہ اگر اس شخص کی نیت ٹھیک ہے تو ہمارے سیدھے ہاتھ کی جانب آئے گا۔مگر وہ بائیں ہاتھ کی طرف آ رہا تھا۔لیکن آتے میں یکا یک سیدھی طرف مڑ گیا اور حاضر ہو کر سلام کیا۔اس کی خیریت دریافت کی۔اس کے بعد اس نے عرض کیا کہ اس کے تین روز قبل مرزا کامران کا فرمان پہنچا تھا کہ جس وقت ہمایوں بادشاہ اس طرف آئیں تو تم ان کو جانے نہ دینا اور فوراً گرفتار کر لینا۔بادشاہ کی تشریف آوری ہمارے سر آنکھوں پر لیکن مناسب یہ ہے کہ حضور سوار ہو جائیں تا کہ میں اپنی سرحد تک پہنچا دوں۔بادشاہ سوار ہوئے۔اور پندرہ کوس تک ساتھ جا کر اس نے اپنی سرحد تک پہنچا دیا[17] اور پھر اجازت چاہی۔اب گرم سیر کے مقام پر جو خراساں اور قندھار کی سرحد ہے پہنچ گئے۔[18] سید عبدالحق کو جو گرم سیر کا[19] حاکم تھا خبر ملی لیکن اس کم عقل نے انسانیت کا برتاؤ نہیں کیا۔اس کے ایک غلام نے بادشاہ کی میزبانی کی اس غصہ میں اس نے غلام کو اندھا کروا دیا۔اس منزل پر تھے کہ خواجہ جلال الدین محمود جو مرزا عسکری کی ملازمت میں تھا قندھار سے فرار ہو کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔[20] پردے خیمے خچر اور گھوڑے جو وہ ساتھ لایا تھا بادشاہ کو پیش کر دیئے۔بادشاہ نے کہا کہ ہم اپنے بیوتات خانہ کا انتظام تمہاری سپردگی میں دیتے ہیں۔اس نے شکریہ ادا کیا۔وہاں سے کوچ کر کے منازل طے کرتے ہوئے سیستان پہنچے اس شہر کا حاکم محمد سلطان[21] جو حضرت عالم پناہ شاہ طہماسپ کے امراء میں سے تھا، بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔اس نے ایک گھوڑا لیلۃ القدر نامی پیش کیا۔بادشاہ کو گھر مہمان رکھا۔جو کچھ حق خدمت تھا بجا لایا۔اور عرض کیا کہ یہاں سے قندھار قریب ہے۔جو شخص ملازموں میں سے شکستہ حال ہو کر رہ گیا ہو وہ خدمت والا میں حاضر ہو جائے گا آپ یہاں قیام فرمائیں۔چند روز وہیں رہے۔اس کے بعد حاجی محمد خاں کوکہ وحسن بیگ کوکہ وکامران مرزا نے شرف رکاب بوسی حاصل کیا۔بیرم بیگ و دیگر امراء نے یہ مشورہ دیا کہ اس جگہ پر قیام کرنے سے شاہ عالم پناہ شاہ طہماسپ کے دل میں کیا خیال پیدا ہوگا۔آپ کے لئے مناسب یہ ہے کہ یہاں سے روانہ ہو جائیں اس کے بعد ایک ارادت نامہ شاہ عالم پناہ کی خدمت میں لکھ کر بھیجا کہ ہم آپ کے ملک میں آ گئے ہیں۔اب جو حکم ہو اُس پر عمل کیا جائے۔اس خط کی

عبارت یہ ہے:

عرضداشت ارادت مشحون محمد ہمایوں (22)

بعد از ادائے وظیفہ دعا و اخلاص بے ریا کہ شہود مرضیہ اصحاب اختصاص ست مشہود باد۔ باوجود قلت بندگی و کثرت شرمندگی خود را ذرہ مثال در نظر مہر سپہر حشمت و اجلال حضرت شاہی مظہر آگاہی و مظہر اوصاف کماہی الٰہی است در آوردہ، نمودہ می آید۔ کہ اگرچہ چہرۂ خود را در زمرۂ خدام عالی مقام انتظام نہ دادہ بود اما سراً در ربقہ محبت و اخلاص بہ رقبہ قلب چوں رصاص ہمیشہ متعلق ساختہ خاطر بسوے حضور موفور السرور فائز النور آں حضرت کہ موجب وصول و حصول انواع سعادات و کرامات است می کشید و ہر لحظہ از توجہ توجہ توجیہ وجہ شریف شہد لطیف می چشید تا آنکہ از ممر دور دھر دون واز گردش چرخ بوقلموں واثر گوں از فضائے سواد اعظم بہ تنکنائے بے ہوائے اظلم سندھ رسید و شد۔ بیت:

بگزشت بر سرما انچہ گذشت جہ بہ دریا وچہ کہسار و چہ دشت

اکنون طائر آرزو از برائے مشاہدہ جمال نیر عظمت و اجلال بال اقبال می کشاید امید از رحمت حضرت الٰہی آنست کہ بعد از دریافت دولت دریا نوال کہ موجب وصول بسے از مرادات ست۔ مقالات و حالات ساختہ و پرداختہ انچہ قابل عرض باشد معروض خواہد شد۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

قطعہ جو ہمایوں بادشاہ نے خود اپنی طبیعت سے موزوں فرمایا:

خسرو عمریست تا عنقائے عالی ہمتم — قلہ قاف قناعت را نشیمن کردہ است
روزگارے سفلہ گندم نما و جو فروش — طوطی طبع مرا قانع بار زن کردہ است
دشمنم شیرست و عمرے پشت بامن کردہ بود — ایندم از روئے عداوت رائے بامن کردہ است
التماس ایں زشہ دارم کہ بامن آں کند — انچہ با سلمان علی در دشت ارژن کردہ است

حضرت شاہ عالم پناہ شاہِ طہماسپ صفوی نے اپنے گماشتوں اور امراء کے نام فرمان صادر کیئے کہ ہر منزل پر جہاں ہمایوں بادشاہ پہنچیں ان کی خدمت بجالانے میں کوئی کوتاہی نہ ہو اور جیسی ہماری فرماں برداری کرتے ہیں، اُن کی فرمانبرداری اس سے دوگنی کریں۔ ایک خط بادشاہ کو ارسال فرمایا کہ بالکل اطمینان خاطر رکھیں۔ جو کچھ اُن کا مقصد ہے وہ حسب منشا پورا ہوگا اور یہ بیت شاہ عالم پناہ کے خط کے عنوان پر خود اُن کے دست مبارک سے لکھا ہوا تھا:

مشکیں نفس غالیہ آمیز سحر گاہ
مکتوب تو آورد صبا سلمہ اللہ

اور انتہائی محبت کے ساتھ یہ شعر خط کے اندر درج تھا:

ھُمائے اوج سعادت بہ دام ما افتد
اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد

(اس کے بعد) بادشاہ اس جگہ سے روانہ ہوئے۔

حوالہ جات

1- خردار۔ اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہوا کہ اس قدر وزن کا بوجھ جو ایک گدھا لے جا سکے، لیکن شاید یہاں بوریوں سے مراد ہے۔

2- رونائی۔ دہلی اور عبدالسلام گلشن کے نسخوں میں ارنائی ہے۔ اسٹورٹ نے رونائی و روتائی دونوں لکھے ہیں۔ ارسکن نے روتائی لکھا ہے۔ لٹن لائبریری کے نسخہ میں بھی رونائی ہے۔ چناں چہ ترجمہ میں یہی رکھا ہے۔

3- پیش نظر نسخوں میں یہ عبارت کتابت کی خرابی سے کچھ بے ربط ہوگئی ہے۔ اُردو ترجمہ قیاس

کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ احمد الدین صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہی نہیں یا ممکن ہے کہ جو نسخہ ان کے پاس تھا اس میں یہ عبارت موجود نہ ہو۔ (دیکھو تذکرۃ الواقعات عرف ہمایوں نامہ ص105)۔

4- ابوالفضل نے جون سے روانگی کی تاریخ 7 ربیع الثانی سنہ 950ھ (10 جولائی 1543ء) دی ہے۔ محمد معصوم کے بیان کے مطابق شاہ حسین نے ''صد ہزار مثقال نقد و سائر اسباب سفر'' کے علاوہ تین ہزار گھوڑے اور تین سو اونٹ بھی بھیجے تھے اور دریا پر پل باندھنے میں بھی مدد دی تھی۔ اس صلح اور پل بنانے کی تاریخ ''صراط مستقیم'' سے نکلتی ہے (یعنی 950)۔ (دیکھو تاریخ سند از محمد معصوم ص179-180)۔

5- اصل نسخوں میں آتش کا لفظ ہے، لیکن آش زیادہ مناسب ہے اور اسٹورٹ کے ترجمہ میں بھی شوربہ کا لفظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے اس کے نسخہ میں آش ہی ہوگا۔

6- ہمارے پیش نظر نسخوں میں کاتبوں نے اس نام کو بیش لکھا ہے، اسٹورٹ کے ترجمہ میں انیس ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

7- ابوالفضل نے شال لکھا ہے، یہ کوئٹہ کا پرانا نام ہے۔ اسی طرح مستان درحقیقت مستنگ ہے (اکبر نامہ۔ دفتر اول ص 190)۔ جوہر کی طرح بعض اور کتابوں میں بھی شال مستاں کو ایک مقام کہا گیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ ابوالفضل کی روایت صحیح ہے۔ ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ جوہر نے حافظہ کی بنیاد پر اپنی کتاب مرتب کی ہے۔

8- اصل نسخوں میں یہ عبارت کچھ مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ اسٹورٹ کا ترجمہ دیکھ کر شک اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

9- فارسی نسخوں میں معجب لکھا ہے۔ اگر اس کو معجب ہی پڑھتے ہیں تو عبارت مہمل ہو جاتی ہے۔ غالباً عجیب یا عجب ہے۔ اس واقعہ کے متعلق جوہر کی روایت دوسرے مورخوں سے قدرے مختلف ہے۔ لیکن اختلافات جزوی اور غیر اہم ہیں۔

10- چوبی بہادر۔ یہ نام تذکرۃ الواقعات کے نسخوں میں جو ہمارے پیش نظر ہیں اسی طرح لکھا ہے۔ ارسکن میں بھی یوں ہی ہے۔ لیکن اسٹورٹ نے جوئی بہادر لکھا ہے۔ اکبر نامہ میں جی بہادر ہے۔ ڈاکٹر بنرجی نے جے بہادر کر دیا ہے (اکبر نامہ دفتر اول ص 190 ترجمہ

اسٹورٹ ص52 بنر جی جلد دوم ص96)۔

11- اصل نسخوں میں ''کمان حزب جنگ'' لکھا ہے۔ اسٹورٹ کے ترجمہ میں قرابین ہے، یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

12- یہ واقعہ ابوالفضل نے بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (ص191)۔

13- ابوالفضل کا قول ہے کہ حسن علی آقا ''درشجاعت وجلادت امتیاز داشت'' (ص223)۔

14- جوہر نے صاف الفاظ میں نہیں کہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہمایوں کو اس کا موقع ہی نہیں مل سکا کہ اکبر کو ساتھ لے جاتا۔ بایزید کی عبارت یہ ہے ''ایشان را فرصت آں نہ شد کہ نواب شہزادہ عالمیان جلال الدین محمد اکبر مرزا را بخود ہمراہ سازند'' (تذکرہ ہمایوں واکبر ص807)

15- یعنی ہرات۔

16- ملک خطی۔ اکبرنامے میں ملک ھاتی بلوچ ہے۔ ابوالفضل نے اس کو ''قافلہ سالار راہزناں'' کہا ہے۔

17- احمد الدین صاحب نے اپنے ترجمہ میں بجائے پندرہ کوس کے سو میل لکھے ہیں۔ یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔

18- اکبرنامہ میں عبدالحئی ہے۔ (ص202)

19- گرم سیر۔ قندھار کے مغرب میں وہ علاقہ ہے جس میں دریائے ہلمند بہتا ہے اور جو سیستان تک چلا جاتا ہے۔ (جیرٹ جلد دوم ص394)

20- ابوالفضل لکھتا ہے کہ عبدالحئی مرزا عسکری کی طرف سے روپیہ وصول کرنے کے لئے آیا ہوا تھا۔

21- دوسرے مورخین نے اس کو احمد سلطان شاملو لکھا ہے۔ (اکبرنامہ دختر اول ص204 تذکرہ بایزید ص8)

22- ہمایوں کا خط مختلف کتابوں میں موجود ہے۔ سب سے پہلی تصنیف جس میں یہ خط نقل کیا گیا ہے ''تاریخ ایلچی نظام شاہ'' ہے۔ اس کا مصنف برہان نظام شاہ کی طرف سے شاہ طہماسپ کے دربار میں سفیر تھا۔ یہ نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ تذکرۃ الواقعات کے اس نسخہ میں جو اسٹورٹ کے پیش نظر تھا یہ خط موجود نہیں۔ انڈیا آفس کے نسخہ

میں بھی خط کا صرف حوالہ ہی ہے۔ لیکن ہمارے پیش نظر جو نسخے ہیں اُن میں خط شامل ہے۔ اس بنا پر بعض مورخوں کا خیال ہے کہ جوہر نے مکمل خط نہیں دیا تھا لیکن اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ پیش نظر نسخوں میں جوہر کی عبارت صاف بتاتی ہے کہ اُس نے خط نقل کیا ہوگا۔ سکمار رے نے اپنی کتابچہ ''ہمایوں ایران میں'' یہ خط نقل کیا ہے۔ ہم نے اس سے مقابلہ کر کے تصحیح کی ہے۔

چودھویں فصل

بادشاہ کا شاہ عالم پناہ کی طرف روانہ ہونا

جب خراسان کی جانب روانہ ہوئے اور ہری (ہرات) میں جو اس ولایت کا پایہ تخت ہے پہنچے شاہ عالم پناہ کے صاحبزادے یہاں موجود تھے (1) اُن کے اتالیق محمد خاں نے جو حاکم تھا، یہ منادی کرادی کہ سات سال سے لے کر ستر سال کی عمر تک کے لوگ بادشاہ کے استقبال کے لئے جائیں شہزادہ و محمد خاں اور تمام مخلوق نے استقبال کیا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ باغ مراد (2) میں اقامت گزیں ہوئے۔ تقریباً ایک ماہ اس شہر میں مقیم رہے۔ شاہ عالم پناہ کی طرف سے ایک خط آیا کہ آپ مشہد تشریف لائیں، وہاں ہم آپ سے شرف نیاز حاصل کریں گے۔ بوبک بیگ جو بیر خاں کے امراء میں سے تھا بادشاہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس نے عرض کیا کہ میرا ارادہ ہے کہ خانہء کعبہ کا طواف کروں۔ آپ کے ہمراہ چلنا چاہتا ہوں۔ آپ کی وجہ سے شاہ عالم پناہ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ وہاں سے فارغ ہو کر مکہ شریف چلا جاؤں گا۔ بادشاہ نے اس کی درخواست کو قبول فرمایا۔ یہاں سے روانہ ہو کر مشہد مقدس پہنچے۔ اس شہر میں شاہ قلی سلطان تھا۔ اس نے استقبال کے لئے حاضر ہو کر شرف قدم بوسی حاصل کیا اور ہر طرح سے خدمت اور مہمان نوازی کی۔ یہاں چالیس دن قیام رہا۔ ایک رات بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ سلطان دین و دنیا امام المومنین والمتقین حضرت امام علی موسیٰ الرضا علیہ التحیہ والثنا کے آستانہ کا طواف کریں۔ پانچ آدمیوں کو لے کر روانہ ہوئے۔ دوست بابا قوربیگی، دوسرے مہتر واصل توشک بیگی، تیسرے میر یعقوب بیگ سفرچی، چوتھے کو چک بیگ اور پانچویں خاکسار جوہر آفتاب چی۔ جب اس مقدس مقام پر پہنچے تو دربان نے آستانے کی زنجیر کھولنا چاہی، لیکن زنجیر سخت ہو گئی۔

دربان نے عرض کیا کہ زنجیر نہیں کھلتی، بادشاہ دو تین قدم واپس آئے، لیکن پھر آستانہ کی طرف متوجہ ہوئے، اور دل میں کہا، اے امام! جو شخص بھی اس آستانہ پر اپنی مراد لے کر حاضر ہوا، وہ بامراد واپس گیا، یہ غلام بھی ایک آرزو لے کر روضہ پر حاضر ہوا ہے اور اُمید رکھتا ہے کہ میری آرزو بھی پوری ہوگی۔ یہ کہہ کر دروازہ تک ہاتھ بڑھایا، فوراً دروازے کی زنجیر کھل گئی، گویا وہ علیحدہ ہی تھی۔ بادشاہ نے اس مقدس آستانہ کا طواف کیا۔ فاتحہ پڑھی اور اس کے بعد ایک جگہ پر جو اسی مقصد کے لئے تھی، بیٹھ کر قرآن خوانی میں مشغول ہوئے۔ اس آستانہ کے متولی نے عرض کیا کہ حضرت چراغ کا گل کاٹ دیجئے۔ فرمایا کہیں بے ادبی نہ ہو جائے اُس نے کہا اجازت ہے۔ چنانچہ قینچی لے کر چراغ کی گل کو کاٹ دیا[3] اور پھر فاتحہ پڑھ کر باہر تشریف لے آئے اور فرمایا کہ ایک کمان آستانہء مبارک میں رکھ دی جائے۔ اس کے بعد شاہ طہماسپ صفوی کا خط آیا کہ قزوین میں آیئے۔ چنانچہ وہاں سے روانہ ہو کر دو رات دن میں نیشاپور پہنچے۔ وہاں سے چھ دن بعد سبزوار آئے۔ امیر شمس الدین سبزوار کا حاکم تھا۔ چوں کہ امیر موصوف میر برکہ کے رشتہ داروں میں سے تھا اور بادشاہ کو اس سے خصوصیت تھی[4] وہاں چالیس روز مقیم رہے۔ وہاں سے تین شب کے بعد دامغان پہنچے۔ وہاں سے دو شب بعد بسطام آئے، وہاں سے سمنان اور پھر قلعہء اغذ[5] پر۔ اس کے بعد چشمہء اسحاق پر اور وہاں سے قلعہء مسیمہ پر پہنچے۔ اور اخروٹ کے ایک درخت کے سایہ میں آرام فرمایا۔[6]

بادشاہ جنگل کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں ایک قاصد نظر آیا۔ معلوم کیا کہ یہ قاصد کس طرف جا رہا ہے۔ اُس نے حاضر ہو کر سلام کیا۔ اس سے بادشاہ نے دریافت کیا، تم کہاں سے آئے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ قلعہء ظفر[7] سے آ رہا ہوں۔ ارشاد فرمایا کوئی خبر لائے ہو۔ اُس نے عرض کیا، جی ہاں۔ فرمایا، پیش کرو۔ اس نے مرزا سلیمان کی عرضداشت پیش کی۔ بادشاہ نے اس کو پڑھ کر فرمایا ان بے وفا دودھ شریک بھائیوں کا عجب حال ہے۔ حضرت بابر بادشاہ کے ساتھ اس قدر بے وفائی کی اور اب ہمارے ساتھ بے مروتی کر رہے ہیں۔ مرزا سلیمان کے دودھ شریک بھائی جس کا نام علی قلی اندرابی[8] ہے۔ مرزا کامراں کے کہنے میں آ کر مرزا سلیمان کو مع اہل وعیال کے قید کر کے کابل لے گیا ہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے خط کا جواب لکھا ''دعا پہنچے اور امید رکھیں، انشاء اللہ بہتر زمانہ آئے گا۔ یہ خط اس قاصد کو دے کر رخصت کیا اور نہایت مہربانی

سے فرمایا، مرزا سلیمان سے ہمارا سلام کہنا اور یہ کہ یہ سب ہماری وجہ سے ہے کہ تم یہ تکلیف برداشت کر رہے ہو۔ لیکن امید رکھو کہ اپنے مقصد کے موافق ہی کام ہو گا۔ آمین! یا رب العالمین۔''

نماز کے بعد وہاں سے کوچ کیا۔ لیموں کے عرق کی ایک بوتل تھی۔ سوار ہوتے وقت جوہر نے جو باوجود آفتابچی ہونے کے ہمرکابی میں رہتا تھا، مہتر دولہ رکابدار سے کہا کہ یہ عرق کی بوتل مجھے دے دو، جب تم سوار ہو جاؤ گے تو میں تم کو دے دوں گا۔ اُس نے فقیر جوہر آفتاب چی کے کہنے کو قبول نہیں کیا اور جواب دیا کہ سوار ہونے کے بعد ہم خود بوتل زمین پر سے اٹھالیں گے۔ چنانچہ سوار ہو کر زمین پر سے جب وہ بوتل اُٹھانا ہی چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ سے بوتل چھوٹ گئی اور زمین پر گر کر ٹوٹ گئی۔ جب ایک مقام پر پہنچے تو مغرب کی نماز کا وقت تھا۔ بادشاہ وضو کے لئے اُترے اور عرق لیموں طلب کیا اور حکم دیا کہ اس کا شربت تیار کیا جائے۔ بوتل کے ٹوٹ جانے کا جو واقعہ تھا میں نے بادشاہ سے کہہ دیا۔ اس پر بادشاہ بہت ناراض ہوئے اور فقیر جوہر اور دولہ مذکور کو پیدل چلنے کا حکم فرمایا۔ دو کوس چلے تھے کہ ارشاد فرمایا کہ جوہر بیچارہ تو بے قصور ہے، وہ سوار ہو کر چلے۔ قصوروار دولہ ہے، وہ پیدل چلے۔

بیرم خاں کو دربار میں بھیجنا

اس جگہ سے چشمہء سادوق بلاق (9) اور وہاں سے قلعہء درس پر پہنچے۔ یہاں شاہ عالم پناہ شہ طہماسپ کا خط ملا کہ اپنے وکیل بیرم بیگ کو بھیج دیں۔ بادشاہ نے بیرم بیگ کو مع دو سواروں کے شاہ عالم پناہ کی خدمت میں، جو اس وقت قزوین میں تھے، روانہ کر دیا۔ اُنہوں نے جا کر شاہ عالم پناہ کی رکاب بوسی کی۔ بعدہ شاہ طہماسپ نے فرمایا کہ سر کے بال تراشو اور تاج (10) پہنو۔ بیرم بیگ نے عرض کیا کہ بندہ ایک دوسری ہستی کا تابع ہے۔ اور وہاں سے جو کچھ حکم اس کو ملے گا اس پر عمل کرے گا۔ شاہ عالم پناہ کو اس کی یہ بات بری معلوم ہوئی۔ اور فرمایا کہ اپنے تابع ہو۔ چند چراغ کش پیشتر سے قید تھے کہہ کر سامنے لائے گئے اور بر بنائے سیاست ان سب کو سامنے قتل کر دیا گیا۔ شاہ عالم پناہ اس جگہ سے روانہ ہو کر چشمہء چکی چکی پر قیام پذیر ہوئے اور وہاں سے خط لکھا کہ ہمایوں بادشاہ اسی جگہ مقیم رہیں، جب تک کہ دربار میں طلب کیا جائے، اور بوبک بیگ کو

ہ ری خدمت میں بھیج دیا جائے۔ (چنانچہ) بوبک بیگ ازبک کو شاہ عالم پناہ کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد شاہ عالم پناہ نے حکم دیا کہ ہمایوں بادشاہ قزوین آ جائیں، اور یہاں تین دن قیام کر کے ہم سے ملاقات کریں۔ بادشاہ درس سے روانہ ہو گئے۔ قزوین پہنچے تو وہاں کے حاکم نے آ کر استقبال کیا۔ شاہ عالم پناہ کے محلات میں قیام فرمایا۔ پہلے دن وہاں کے حاکم کے مہمان رہے۔ دوسرے دن قاضی نے اُن کی ضیافت کی۔ اور تیسرے دن شہر کے لوگوں نے تواضع کی۔ ظہر کی نماز کے وقت وہاں سے کوچ کر کے آگے روانہ ہوئے۔ رات کے وقت راستہ میں جا رہے تھے اور رات آخر ہو چکی تھی کہ بادشاہ نے فرمایا کہ پانی کے قریب جگہ تلاش کرو۔ جہاں قیام کرنے میں سہولت ہو۔ اس طلب و جستجو میں تھے کہ خبر آئی کہ بیرم بیگ آ رہے ہیں۔ اُنہوں نے شرف رکاب بوسی حاصل کیا اور عرض کیا کہ منزل سے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ فرمایا اب واپسی ممکن نہیں۔ الغرض صبح کا وقت ہو گیا تھا اور بادشاہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر خواب میں تھے کہ بیلداروں نے اپنے مخصوص انداز میں گانا شروع کر دیا۔ وہ جگہ جگہ سے راستہ کو درست کرتے جاتے تھے۔ اُن کے گانے سے بادشاہ کی آنکھ کُھل گئی۔ وہ سمجھے کہ یہ سرکاری بیلدار ہیں۔ فرمایا کہ ان کو روکو۔ ہم رات بھر سفر کر کے تھکے ہوئے ہیں۔ اور اس وقت آرام کرنا چاہتے ہیں۔ خاکسار جوہر نے عرض کیا کہ وہ شاہ عالم پناہ کے بیلدار ہیں اور اس لئے آئے ہیں کہ ہماری منزل گاہ کو درست کریں۔ اس وقت حکم دیا کہ بیرم بیگ کو بلاؤ۔ بیرم بیگ نے آ کر عرض کیا کہ شاہ عالم پناہ کے آدمی استقبال کے لئے آ رہے ہیں۔ حضور والا دیوان خانہ میں تشریف رکھیں۔ بادشاہ نے غسل کر کے کپڑے بدلے اور دیوان خانے میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد بادشاہوں کے وکیل اور ان کے بعد خانوں اور مرزاؤں کے وکیل حاضر ہوئے۔ پھر سادات عظام تشریف لائے، اور قدم بوسی سے مشرف ہوئے۔ اب بادشاہ کو سوار کیا اور روانہ ہوئے۔ پھر اسی ترتیب سے جو اوپر بیان کی گئی سلاطین و خوانین نے ان کا استقبال کیا۔ جب مرزاؤں کی باری آئی تو سام مرزا آیا، اور اتنی دور سے کہ جہاں تک ایک تیر جا سکتا ہے وہ گھوڑے سے نیچے اُتر گیا۔ بادشاہ بھی اُتر آئے اور دونوں نے ایک دوسرے کی تعظیم و تکریم کی۔ ملاقات کے بعد سام مرزا واپس چلا گیا۔ اور جس جگہ گھوڑے سے اُترا تھا۔ وہیں سے سوار ہوا۔ اتنی دور گئے ہوں گے جہاں تک تیر جا سکتا ہے تو بہرام مرزا (11) ایک خلعت اور ایک بغیر پھرا ہوا گھوڑا لایا۔ (12) یساولوں (13) نے کیمپ تیار کیا اور

بادشاہ گھوڑے سے اترے۔ وہ قارلین جو شاہ عالم پناہ کی طرف سے آیا تھا۔ بچھایا گیا بادشاہ اس پر کھڑے تھے کہ بہرام مرزا نے آ کر ملاقات کی اور خلعت پہنایا ماسوا تاج کے۔ نئے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ (14)

یہ بغیر پھرا ہوا گھوڑا حضرت بادشاہ کی سواری میں بہت اچھی طرح سے رہا۔ ترکمانوں کو اس پر حیرت ہوئی کیوں کہ انہوں نے امتحان کیا تھا (اور معلوم ہوا) کہ ابھی اقبال ہمایونی قوی ہے۔ چلے جاتے تھے کہ قورچی باش اور دوسرے چھوٹے بڑے لوگ کرمانی گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے۔ سلام عرض کیا اور استقبال کیا۔ اس طرح آنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ معلوم ہو کہ چھوٹے اور بڑے سب لوگ بادشاہ کے ہمراہ ہیں جب حضرت بادشاہ شاہ عالم پناہ کی محفل بہشت آئین میں پہنچے تو اُنہوں نے غالیچہ کے کنارے تک آ کر استقبال کیا۔ دونوں ایک دوسرے کی ملاقات میں مشرف ہوئے۔ (شاہ ایران نے ہمایوں کو) سیدھے ہاتھ کی طرف تکیہ کے قریب بٹھایا اور پاس ہی خود بھی بیٹھ گئے۔ ان کی دل جوئی اور خیریت مزاج اور راستہ کی تکان کے متعلق دریافت کرنے لگے۔ پھر فرمایا کہ آپ تاج ضرور پہنیں گے بادشاہ نے عرض کیا کہ میرے لئے یہ عزت کا تاج ہے۔ اس کو ضرور پہنوں گا۔ شاہ عالم پناہ نے اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر تاج رکھا۔ اس پر جملہ خوانین و سلاطین جو وہاں موجود تھے سب نے تحسین کے نعرے لگائے۔ اور اللہ اللہ کہتے ہوئے سجدہ میں گر گئے، جیسا کہ اُن کے یہاں کا دستور ہے۔ بادشاہ نے عرض کیا کہ حکم ہو تو شاہزادے بیٹھ جائیں۔ شاہ عالم پناہ نے فرمایا کہ ہمارے ملک میں یہ قاعدہ نہیں ہے۔ پھر کھانا لایا گیا۔ شاہ عالم پناہ نے فرمایا کہ بادشاہ کا سفرچی دسترخوان لگائے۔ یعقوب سفرچی نے آ کر دسترخوان بچھایا اور کھانا کھانے میں مصروف ہوئے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مذکورہ بالا طریقہ سے سجدہ کیا۔ ان سجدوں کا مقصد یہ تھا کہ ہمایوں جیسے بادشاہ کو حق تبارک وتعالیٰ نے اس درگاہ عرش اشتباہ میں بھیجا ہے (پناہ لینے کی غرض سے)۔ پھر شاہ عالم پناہ نے ارشاد فرمایا کہ آپ کی قیام گاہ بہرام مرزا اور بدرخان کے مکانات کے درمیان ہے۔ حضرت بادشاہ کو رخصت کیا۔ اور بہرام مرزا حضرت بادشاہ کو اپنے مکان لے گیا حمام میں گئے، خط بنوایا۔ بہرام مرزا تین خلعتیں لائے اور خدمت اقدس میں پیش کیں۔ بادشاہ نے خلعت زیب تن فرمائی اور تمام شب عیش وعشرت میں گذاری۔ صبح کو شاہ عالم پناہ سلطانیہ کے مقام پر آئے۔ چلتے وقت بادشاہ سلام کے لئے گئے، انہوں نے توجہ اپنی

طرف نہ پا کر یہ محسوس کیا کہ شفقت وعنایت جوان کے حق میں پہلے تھی، اس میں کمی آ گئی ہے اس سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ (15) اور اب وہ سلطان محمد خدابندہ (16) کے مکان میں جس کی وجہ سے مذہب شیعہ امامیہ کو اقتدار حاصل ہوا تھا، مقیم ہوئے۔ بادشاہ لشکر میں حیران و پریشان تھے کہ اتنے میں قاضی القضلت قاضی جہاں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے اُن سے دریافت کیا کہ بادشاہ کے اس رویہ کا جو میری طرف ہے کیا سبب ہے' اُس نے عرض کیا کہ آپ کے ملازم اور خدمت گار صحیح راستہ پر نہیں ہیں۔ اور خوارج کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے شاہ عالم پناہ آپ سے بددل ہیں بادشاہ نے فرمایا کہ ہم دل و جان سے ائمہ معصومین علیہم السلام کے تابع و پیرو ہیں۔ اس پر قاضی جہاں نے شاہ عالم پناہ شاہ طہماسپ کے لکھے ہوئے تین خطوط نکالے اور دو خطوط بادشاہ ہمایوں کے پاس چھوڑ دیئے۔ بادشاہ ان کو پڑھ کر کھڑے ہو گئے اور خیموں کے باہر دروازہ پر آ کر بلند آواز سے دشمنان رسالت و ولایت و امامت پر لعنت کرنے لگے۔ اس وقت تیسرے کاغذ کو شاہ عالم پناہ نے خود لے کر حضرت کو دیا۔ اُنہوں نے شاہ عالم پناہ کی موجودگی میں اس کو پڑھا۔ اور مذہب برحق امامیہ اثنا عشریہ اختیار کیا۔ (17) اس کے بعد حضرت بادشاہ نے علی الصباح لشکر کو اسی جگہ چھوڑا اور شکار کو چلے گئے، قاضی جہاں کو حکم دیا کہ ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں موجود رہیں۔ تین دن میں شکار جمع ہو گیا۔ حکم دیا کہ اس طرف سے لشکر آئے۔ شکار کو محصور کیا۔ اور بہت سے جانور ذبح کئے گئے۔ ہرنوں کے حلقہ نے قورچیوں کی جانب راستہ نکال لیا۔ اور بھاگ نکلے۔ حکم ہوا۔ ان سب کی سزا یہ ہے کہ ہر فرد ایک گھوڑا اور ایک تومان کا جرمانہ ادا کرے۔ اس کے بعد دوسرے دن حکم ہوا کہ محمد ہمایوں بادشاہ اور بہرام مرزا تخت سلیمانی (18) جائیں اور شکار جمع کریں۔ وہ راتوں رات چل کر تخت سلیمانی پر پہنچ گئے۔ بہرام مرزا نے کہا کہ حضرت شاہ عالم پناہ کا شکار تین دن بعد ہوگا۔ بالفعل شکارگاہ کا محاصرہ کر لیں، چنانچہ اس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ چند ہرن اور جنگلی سؤر قمرغہ میں آئے۔ ان میں ایک اتفاقاً بہرام مرزا کی طرف سے نکل بھاگا۔ انہوں نے چلتے چلتے کہا کہ اس کو شکار کیا جائے۔ تمام شب چلتے رہے۔ ظہر کا وقت ختم ہو چکا تھا کہ شکار سے فارغ ہوئے۔ بادشاہ وضو کرنے کے لئے اُترے۔ اس وقت ان کی خدمت میں سوائے یعقوب سفرچی کے جو گھوڑا لئے کھڑا تھا، اور کوئی موجود نہ تھا۔ اُس نے آواز دی کہ آفتاب چی حاضر ہو۔ بندہ خاکسار جوہر آفتاب چی حاضر ہوا۔ جب بادشاہ وضو سے فارغ ہوئے تو اپنے

گھوڑے کی طرف چلے۔لیکن چونکہ سواری کی تکان غالب تھی اس لئے وہیں نزول فرمایا۔اور جوہر خاکسار کو حکم دیا کہ بدن دبائے۔ چنانچہ وہ بدن دبانے میں مصروف ہوگیا۔ یہاں تک کہ تکان دور ہوگئی۔اس کے بعد گھوڑے پر سوار ہوکر لشکر کی طرف تشریف لائے۔اس وقت بادشاہ اپنی جیب میں لعل اور ہیرے بھری تھیلیاں رکھے ہوئے تھے۔ان کی عادت تھی کہ وضو کرتے وقت اپنی جیب سے وہ تھیلیاں نکال کر علیحدہ سامنے رکھ لیتے۔ چنانچہ اس مرتبہ رکھ کر اٹھانا بھول گئے بندہ جوہر آفتابچی گھوڑے کی طرف آیا اس نے دیکھا کہ ایک سبز تھیلی اور قاب اور دوات پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اٹھا کر لے آیا۔اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ جب بادشاہ نے دیکھا تو بہت حیران و متعجب ہوئے۔اور فرمایا کہ اے غلام! تو نے عجب کام کیا کہ ہم کو شاہ کی شرمندگی سے بچا دیا۔انشاءاللہ امانت اس کے مستحق ہی کے سپرد کریں گے۔(19) ہیرے اور لعل ہمہ وقت اپنے پاس رکھنے کا سبب یہ تھا کہ پہلے روشن بیگ کے سپرد کئے تھے۔اس نے خیانت کی اس لئے یہ خیال ہوا کہ اب کسی کے سپرد نہیں کریں گے۔ورنہ پھر بددیانتی ظاہر ہوگی چلتے وقت ارشاد فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت گاہ کی سیر کرنے کے بعد ہم شکار کو جائیں گے جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بڑے پہاڑ کو کھودا گیا ہے،اور ایک بڑا قید خانہ تعمیر کرایا گیا ہے۔وہاں سے چل کر مغرب کے وقت منزل پر پہنچ گئے۔اور علی الصباح شاہی پیشکار شکارگاہ میں آ گئے۔ظہر کی نماز کے وقت تک سلیمان علیہ السلام کی تخت گاہ سے چار کوس کے فاصلہ پر شکار جمع ہوگیا۔ بادشاہ بھی شکارگاہ میں آئے اور جانوروں پر تیراندازی شروع کی۔ بھائیوں اور امراء میں سے کسی کو تیر چلانے کی اجازت نہ تھی۔ ہمایوں بادشاہ کے سوا۔شاہ عالم پناہ نے ہمایوں بادشاہ کو حکم دیا کہ تم بھی تیر چلاؤ اس اثنا میں دیکھا کہ ایک ہرن آہستہ آہستہ آ رہا ہے۔شاہ عالم پناہ نے کہا۔ ہمایوں بادشاہ! یہ ہرن آتا ہے،دیکھیں کیسے مارتے ہو ابھی بات بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ بادشاہ نے اُٹھا کر ایک تیر مارا جو اس کی کان کی لو میں لگا اور ہرن لوٹ پوٹ ہوگیا۔تمام ترکمان حیران رہ گئے اور کہنے لگے کہ ہمایوں بادشاہ آخر میں حکومت کریں گے۔اس کے بعد مکان واپس آ گئے۔حضرت بادشاہ کے واسطے نو ہرن بھیجے چند دن وہاں قیام کیا،اور یہیں سے وہ ہیرے اور جواہرات جو شاہ ایران کے لئے لائے تھے،ان کو بھیج دے۔خوانچہ اور صندوقچہ طلب کیا۔ایک ہیرا جو سب سے بڑا تھا،سیپ کے ڈبے میں رکھ کر اوس میں رکھا اور دوسرے لعل اور ہیرے اس کے چاروں طرف خوانچہ میں لگا کر بیرم بیگ کے حوالہ کئے

کہ شاہ عالم پناہ کی خدمت میں پیش کر دے۔ کیوں کہ یہ ہم خاص طور پر انہیں کے لئے لائے تھے۔ ان کی امانت ان کے سپرد کر دو۔ جب بیرم بیگ نے یہ نذر گزرانی تو حضرت شاہ عالم پناہ نے ہیرے اور لعل کو ڈبہ سے باہر نکالا۔ اور جوہری سے اس کی قیمت دریافت کی۔ جوہری نے عرض کیا کہ بے قیمت ہے۔ اس کے عوض میں جو بھی دیا جائے کم ہے اس پیش کش کو قبول فرمایا اور بیرم بیگ کو رخصت کیا۔ اور بادشاہ کو یہ کہلا بھیجا کہ بیرم بیگ کو خان کا خطاب اور ایک نقارہ ہم عطا کرتے ہیں۔ دوسرے روز وہ خطاب اور نقارہ عنایت فرما کر روانہ کیا۔ اس کے بعد دو مہینہ گزر گئے۔ آپس میں کسی قسم کی مدد کی بات چیت نہ ہوئی اور نہ ایک کی دوسرے کو خبر ہوئی۔ (20)

حوالہ جات

1- ان واقعات کی تفصیل اکبر نامہ اور تذکرہ بایزید میں ملتی ہے۔ ابوالفضل اور بایزید دونوں نے شاہ طہماسپ کے اس فرمان کو بھی نقل کیا ہے جو شاہ مذکور نے محمد خاں حاکم ہری کے نام جاری کیا تھا اور جس میں اس نے نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ ہمایوں کی مہمان نوازی کس طرح کی جائے۔
(اکبر نامہ دفتر اول ص206-212، تذکرہ بایزید ص12-31)

2- اکبر نامہ اور بعض دوسری تاریخوں میں باغ جہاں آرا ہے (دیکھو ارسکن۔ جلد 2۔ ص279)۔

3- ہمایوں کے ان الفاظ پر کہ کہیں بے ادبی نہ ہو جائے اسٹورٹ نے نوٹ لکھا ہے کہ چونکہ وہ سنّی تھا اس لئے اس کو مزار کے اندر داخل ہونے کا کوئی حق نہ تھا۔

4- اصل نسخوں میں کچھ کتابت کی غلطی ہے۔ مثلاً امیر برکہ کو امبر کہ اور خصوصیت کو خصومت لکھا ہے لیکن اسٹورٹ کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نسخہ میں یہ عبارت صحیح ہے۔

5- قلعہ اغذ۔ جو نسخے ہمارے پیش نظر ہیں اُن میں اسی طرح لکھا ہے۔ اسٹورٹ کے ترجمہ میں اغدوار ہے اور ڈاکٹر بنرجی نے اغذوار پڑھا ہے۔

6- ان مقامات ومناظر کا ذکر ابوالفضل اور بایزید نے بھی کیا ہے۔لیکن چھوٹے مقامات کے ناموں میں فرق ہے۔

7- پیش نظر نسخوں میں ''بیدائے ضفر'' ہے۔اسٹورٹ نے اپنے ترجمہ میں قلعہ بیزن ضفر لکھا ہے،لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ ظفر کی بگڑی ہوئی مختلف شکلیں ہیں۔جن کی ذمہ داری کاتبوں پر ہے۔ہندوستان سے واپس آ کر کامران مرزا نے سلیمان مرزا کو دو مرتبہ شکست دی اور بدخشاں پر قبضہ کرلیا۔اس موقع پر سلیمان مرزا نے قلعہ ظفر ہی میں پناہ لی تھی اور وہ یہیں سے گرفتار ہو کر کابل لایا گیا تھا۔اکبرنامہ میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔(دفتر اول ص200-201) قلعہ ظفر کا ذکر بابر نے بھی کیا ہے(توزک بابری جلد اول ص270 جلد دوم ص273)

8- بعض نسخوں میں الہ قلی ہے۔

9- بیورج کا خیال ہے کہ شاید یہ سوج بلاق ہوگا جس کے معنی سرد چشمے کے ہیں(ترجمہ اکبرنامہ جلد اول ص439۔نوٹ نمبر5)۔لی اسٹرانج نے بھی اس کا ذکر کیا ہے(ص218)۔

10- تاج ایک خاص قسم کی ٹوپی کا نام تھا جس کو ایرانی استعمال کرتے تھے۔

11- سام مرزا اور بہرام مرزا دونوں شاہ طہماسپ کے بھائی تھے۔اسٹورٹ نے سام مرزا کو شاہ ایران کا بیٹا لکھا ہے۔یہ غلط ہے(ص63) ابوالفضل کے الفاظ یہ ہیں ''بعدازاں بہرام مرزا وسام مرزا برادران گرامی شاہ استقبال نمودند''(دفتر اول ص216)

12- اسپ غزالہ۔بعض کا خیال ہے کہ غرنالہ گھوڑے کا نام تھا۔

13- بساول۔ہمارے نسخوں میں باول لکھا ہے جس کے معنی نوعمر لڑکے کے ہیں۔غالباً یہ بساول ہوگا جو میر تزک نقیب اور چوبدار کے معنوں میں مستعمل ہے۔اسٹورٹ کے ترجمہ میں بھی بساول ہی ہے۔

14- تاج نہ پہننے کی وجہ ارسکن نے یہ بتلائی ہے کہ اس میں بارہ اماموں کے نام تھے جس سے شبہ ہوتا تھا کہ ہمایوں نے امامیہ مذہب اختیار کرلیا ہے۔(جلد دوم ص283)۔

15- اکثر مورخوں نے بیان کیا ہے کہ شاہ ایران نے ہمایوں کا پُرتپاک استقبال کیا اور وہ خیمہ سے باہر آ کر اپنے مہمان سے بغلگیر ہوا۔گلبدن بیگم کے قول کے مطابق شاہ ایران خود سوار

ہوکر آیا اور بغلگیر ہوا (ہمایوں نامہ ص 169)۔ لیکن جوہر کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ ایران کا رویہ ابتدا ہی سے لاپرواہی کا تھا۔ یہی بیان صحیح ہے کیوں کہ جوہر چشم دید حالات بیان کرتا ہے اور اس کی عبارت مبالغہ اور حاشیہ آرائی سے مبرّا ہے۔

16- خدابندہ۔ اس کا اصل نام الجائیتو تھا۔ جب وہ مشرف با اسلام ہوا تو اس کا نام سلطان محمد خدا بندہ ہوا۔

17- اس واقعہ کا ذکر اکبر نامہ میں نہیں۔ ابوالفضل نے صرف اس قدر اشارہ کیا ہے کہ بعض مفسدوں کی وجہ سے دونوں کے تعلقات باہم کچھ عرصہ تک کشیدہ رہے لیکن وہ کشیدگی زیادہ قائم نہیں رہی اور بہت جلد خلوص میں تبدیل ہوگئی۔ جیسا کہ ابوالفضل کی عبارت سے ظاہر ہے: ''آں کدورت بامتدادنہ کشید ولیز لال صفامصفا گشت۔''

18- تخت سلیمانی۔ یہاں کے دل کش مناظر کا ذکر میجر النسن نے ان الفاظ میں کیا ہے: ''موسم بہار اور موسم گرما میں تخت سلیمانی کے قرب و جوار کا علاقہ بہشت زار بن جاتا ہے اور چاروں طرف زمردیں فرش بچھا ہوا نظر آتا ہے۔ ہوا نہایت لطیف اور ہزار ہا قسم کے پھولوں کی خوشبو سے مہکی ہوئی ہوتی ہے۔'' (ارسکن جلد دوم ص 286۔ نوٹ)

19- اسٹورٹ کے ترجمہ میں کچھ اختلاف ہے۔ معلوم نہیں یہ فرق اصل نسخہ ہی میں تھا یا اسٹورٹ کی لاپرواہی کا نتیجہ ہے۔

20- اکبر نامہ میں شکار کے واقعات زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

پندرہویں فصل

مرزا کامران کے ملازموں کا شاہ عالم پناہ کی خدمت میں ہمایوں بادشاہ کی مذمت کرنا

واقعہ یہ ہے کہ دو باتیں اس عرصہ میں ہوئیں۔ ایک یہ کہ حضرت بادشاہ محمد ہمایوں کے امراء روشن بیگ کوکہ خواجہ غازی دیوان اور سلطان محمد نیزہ باز نے جو کامران مرزا کے نوکر تھے، اور مکہء معظمہ کا طواف کر کے واپس آ رہے تھے، شاہ عالم پناہ شاہ طہماسپ صفوی کی خدمت میں بیہودہ باتیں کیں، کہ محمد ہمایوں بادشاہ اگر سلیقہ کے ہوتے تو ان کے بھائی ان سے علیحدہ نہ ہوتے اور یہ درخواست کی کہ ایک لشکر ہم لوگوں کو عنایت فرما دیجئے، کہ قندھار پر قبضہ کر کے حضور والا (شاہ طہماسپ صفوی) کی خدمت میں پیش کریں۔ قزلباش اور ترکمان یہ کہتے تھے کہ بابر بادشاہ نے جو ہمایوں کا باپ تھا شاہ اسماعیل صفوی سے مکرر امداد حاصل کی اور اس کے صلہ میں نجم بیگ وزیر کو بارہ ہزار سواروں کے ہمراہ جو اس کی کمک میں تھے قتل کرا دیا[1] (اس کے علاوہ) ازبکوں سے دھوکا کھا کر اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ اگر ہم لوگوں کو ہمایوں بادشاہ کی مدد میں بھیج دیجئے گا تو بلا سبب کسی موقعہ پر اپنے مشہور باپ کی طرح (وہ بھی) تمام لشکر کو قتل کرا دے گا۔ مرزا کامران بہادر نے پوشیدہ طور پر ایک خط اپنے بڑے بھائی کی مذمت میں شاہ عالم پناہ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ یہی چند واقعات درمیان میں حائل تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ جب بادشاہ گجرات کے سفر سے دارالخلافہ آگرہ میں تشریف لائے تو ایک روز تخت سلطنت پر بیٹھے ہوئے عام مجمع میں فرمایا تھا کہ شان وشوکت اور جاہ وجلال میں ہم شاہ طہماسپ صفوی سے زیادہ ہیں۔ یہ بات کچھ لوگوں نے حضرت شاہ عالم پناہ کی خدمت میں عرض کر دی تھی۔ اُنہوں نے خلوت میں اپنے خاص لوگوں سے

فرمایا تھا کہ اگر ہمایوں بادشاہ کو سلیقہ ہوتا تو اپنے بھائیوں، اپنے اعزہ، اور اپنے لشکر کو اپنے سے جدا نہ کرتے، اپنے دوستوں کو راضی رکھتے۔ اور پاجی شیر شاہ افغان سے شکست نہ کھاتے۔ بیشک یہ باتیں صحیح ہیں اور شاہ عالم پناہ نے درست کہا، لیکن حکم خدا سے کوئی چارہ نہیں، پیغمبروں کو بھی شکست ہوئی ہے، چنانچہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جب کافروں سے جنگ احد میں مصروف جنگ ہوئے تھے تو کس طرح لشکر اسلام نے شکست کھائی تھی، اس قسم کے واقعات سے بہادروں ہی کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک بڑھیا نے حضرت امیر حمزہ کے جگر کو کچا چبالیا تھا، ان کے جسم مبارک کے ستر ٹکڑے کئے، علاوہ ازیں حضرت رسالت پناہ محمد مصطفیٰ کے دندان مبارک شہید ہوئے عقلمند آدمی کو ہر وقت خداوند کریم سے پناہ مانگنی چاہئے، اس واسطے کہ خدا کا حکم تمام احکام پر غالب ہے (2) **قولہ تعالیٰ واللہ غالب علیٰ امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔**

الغرض ایک روز شاہ عالم پناہ نے بہرام مرزا سے وہ باتیں کہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور فرمایا کہ امرا یہ عرض کرتے ہیں کہ ہمایوں بادشاہ کو امداد دینا عقل سے بعید ہے۔ ان حالات میں وہ امداد کا مستحق نہیں۔ بہرام مرزا کو بادشاہ سے محبت اور خلوص تھا، اُسے سخت تکلیف پہنچی وہ رویا اور اپنے محل میں جا کر اپنی بہن سے یہ ماجرا بیان کیا کہ ہمایوں بادشاہ تیموری نسل سے ہے، اور بہ نفس نفیس استمداد کے لئے ہمارے گھر آیا ہے، ہمارے خاندان کی قدیم رسم یہی ہے کہ اس سے اظہار ہمدردی کیا جائے۔ قزلباش امراء نے جن کے باپ اور بھائی بابر بادشاہ کی معیت میں دھوکے سے قتل کر دیئے گئے تھے۔ شاہ عالم پناہ کے سامنے (ہمایوں بادشاہ) کی مذمت کی ہے۔ جب بادشاہ کو آپ دیکھنے آئیں تو آپ اُن کی سفارش کریں۔ چنانچہ جب بادشاہ ان کے گھر تشریف لے گئے وہ نیک خاتون رنجیدہ بیٹھی تھیں۔ اُن کے پہنچنے پر رونے لگیں۔ بہرام مرزا (برادر شاہ عالم پناہ) نے سلام کیا۔ اور باہر چلے گئے۔ شاہ عالم پناہ نے رونے کا سبب دریافت کیا۔ عرض کیا اپنے زمانے کو روتی ہوں۔ پھر فرمایا کیا ہماری سلامتی نہیں چاہتی ہو۔ کہا۔ حضرت کے لئے ہمیشہ دعا میں مشغول رہتی ہوں۔ لیکن مناسب حال کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ غرض مند اور متفنی لوگوں کی باتوں پر عمل نہ فرمایئے، بلکہ اپنی حیثیت کے موافق ایک لشکر ہمایوں بادشاہ کو دے کر ہندوستان کی طرف روانہ فرما دیجئے۔ تاکہ ہفت اقلیم میں حضور کا نام روشن ہو۔ بادشاہ کی ہمشیرہ سلطان بیگم نے ہمایوں بادشاہ کی یہ رباعی شاہ

طہماسپ کے سامنے پڑھی:

ما ایم زجاں بندۂ اولاد علی
ہستیم ہمیشہ شاد با یاد علی
چوں سر ولایت از علی ظاہر شد
دردیم ہمیشہ ورد خود نادِ علی

شاہ عالم پناہ نے یہ کلام سنا اور مطمئن ہو گئے۔ فرمایا کہ ایران کے امراء نے ہم کو غلط مشورہ دیا صحیح یہی ہے جو تم کہتی ہو۔ اس کے بعد شاہ عالم پناہ نے بادشاہ کی خدمت میں ایک خط بھیجا کہ ہمارے دربار میں آئے۔ ظہر کے وقت وہ آ کر شاہ عالم پناہ سے ملے اور رات گئے تک ان کی دل جوئی کی اور اس طرح اطمینان دلایا کہ آپ کا سفر کامیاب ہوگا۔ کچھ باتیں آپ کو قاضی جہاں سے معلوم ہوں گی جن کو (مجھے امید ہے) آپ مان لیں گے۔ بادشاہ نے شاہ عالم پناہ کے لئے دعائے خیر کی اور شاہ عالم پناہ سوار ہو کر چلے گئے۔ ایک مقام پر بادشاہ گھوڑے سے اترے اور سوائے مہتر کو چک کے آپ کی خدمت میں اس وقت کوئی موجود نہ تھا۔ جب شاہ عالم پناہ نے بادشاہ کو (ایک عرصہ تک نہ دیکھا) تو پریشان ہوئے کہ کہاں ہیں انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں ترکمانوں سے کسی مقام پر کوئی حماقت سرزد نہ ہو گئی ہو (3) اس وقت شاہ عالم پناہ کے ساتھ دو مشعلیں تھیں۔ ایک مشعل انہوں نے اپنے سپاہی کو دی اور کہا کہ مشعل لے جاؤ اور ہمایوں بادشاہ کو تلاش کرو۔ سپاہی ترکی زبان میں چلّاتا ہوا جاتا تھا کہ بادشاہ کے کان میں آواز پہنچی۔ بادشاہ نے کوچک سے فرمایا کہ اس سے کہہ کر فوراً یہاں آؤ۔ ترکمان نے آ کر عرض کیا کہ شاہ عالم پناہ طلب فرماتے ہیں وہ فوراً سوار ہو گئے۔ الغرض شاہ عالم پناہ کی خدمت میں پہنچے۔ وہاں فوجوں کے کچھ خیمے نظر آئے۔ جب قریب پہنچے تو شاہ عالم پناہ نے دریافت کیا کہ یہ خیمے کس کے ہیں۔ عرض کیا کہ محمد ہمایوں بادشاہ کے۔ پھر حضرت بادشاہ نے مصافحہ کر کے رخصت کیا اور خود اپنی بارگاہ میں چلے گئے۔ آدھی رات گذری تھی کہ بادشاہ نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ بھوک شدت کی لگ رہی ہے۔ شاہ عالم پناہ کا ایک فراش اس وقت بادشاہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس نے شاہ عالم پناہ سے جا کر عرض کیا کہ ہمایوں بادشاہ کو بھوک لگی ہے۔ شاہ عالم پناہ نے سنتے ہی ارشاد فرمایا کہ کچھ

کھانے کی چیزیں لے جائیں۔ پس کھانے کے نوخوان بھیجے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد آرام فرمایا اور اس دن وہیں مقیم رہے۔ قریب ہی ایک درہ تھا۔ شاہ عالم پناہ اس کی طرف متوجہ ہوئے ہمایوں بادشاہ نے فرمایا کہ بابا دوست قوربیگی مہتر واصل توشک چی، مہتر یوسف شربتی، مہتر کوچک بیگ دمیانی، واتف خادم اور جوہر آفتابچی ہماری خدمت میں حاضر ہوں۔ سب روانہ ہوئے اب پُر فضا مقام (4) پر نزول فرمایا اور خادموں سے کہا کہ آج شب میں شاہ عالم پناہ نے بہت مہربانی کی ہے اور قوی امید دلائی ہے۔ جو کچھ گفتگو اور واقعات ہوئے تھے ایک ایک کر کے بیان کیے۔ یہ بھی کہا ہے کہ بعض واقعات کو قاضی جہاں تم سے بیان کریں گے۔ ہم تمام خادموں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور خوش ہوئے۔ جب شاہ عالم پناہ کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ ہمارے قریب آیئے۔ پھر شکار میں چلے گئے اور اس مقام پر ہرنوں کو گھیرا جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکانات تھے۔ اس جگہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ صرف ایک ہی راستہ تھا۔ بھاگنے کی کوئی راہ نہ تھی۔ ایک ہرن کو ایک طرف سے شاہ عالم پناہ نے اور دوسری طرف سے ہمایوں بادشاہ نے سینگ پکڑ کر باہر نکالا اور چھوڑ دیا۔ شکار میں بے حد دلچسپی لی۔ اور تمام دن اسی شغل میں گزار دیا۔ (5) رات کے قریب لشکر گاہ میں پہنچے۔ بعد ازاں اس مقام پر جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت تھا، اقامت گزیں ہوئے۔ اس روز سے شاہ عالم پناہ بادشاہ کی مہمانی کے انتظام میں مصروف ہوئے۔ اور جو اشیاء مناسب ان کے پاس موجود تھیں ان کو چھوڑتے جاتے تھے۔ اس منزل پر پانچواں روز تھا کہ بادشاہ کے پاس یہ خبر پہنچی کہ روشن بیگ خزانچی و غازی سلطان محمد نیزہ باز کو شاہ عالم پناہ نے گرفتار کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے بادشاہ نے کہا کہ وہ اسی کے سزاوار ہیں۔ حدیث رسالت پناہ محمد مصطفیٰ (چاہ کن را چاہ در پیش) (6) الغرض ان کو گرفتار کر کے لے گئے۔ حکم ہوا کہ ان کے خیموں کی رسیاں کاٹ کر ان کی کمروں میں باندھ کر اس غار میں ڈال دو، جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل کا قید خانہ تھا۔ اگر رسیاں اس جگہ تک پہنچ جائیں تو وہیں چھوڑ دیں، اگر نہ پہنچیں تو باہر نکال لیں۔ جب یہ حکم صادر ہوا تو روشن بیگ نے ایک عرضداشت ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں روانہ کی کہ ہم گنہگار بے تمیز غلاموں نے جان بخشی کی امید بالکل منقطع کر دی ہے۔ مگر حضور کی سفارش کا آسرا لگا ہوا ہے۔ بے وقوفوں سے خطا اور بادشاہوں سے عفو و عطا ہوتا آیا ہے۔

گرما مقصریم تو دریائے رحمتی
برما مبیں و برِ کرم خویشتن بہ بین

جناب نے میری والدہ کا دودھ نوش فرمایا ہے۔ بادشاہ (ہمایوں) اس پر مہربان ہوئے۔ اور شاہ عالم پناہ کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا کہ شاہ اسماعیل کے مزار کے صدقہ میں انہیں رہا فرما دیں۔ جب یہ خط پہنچا تو شاہ عالم پناہ اس کو پڑھ کر بہت متعجب ہوئے اور فرمایا کہ محمد ہمایوں بادشاہ کتنے بردبار ہیں یہ لوگ ان کے درپے آزار تھے اور وہ ان کی سفارش کرتے ہیں۔ حکم ہوا کہ صبح کو یہ سب محمد ہمایوں بادشاہ کے سپرد کر دیئے جائیں۔ چنانچہ وہ اُن کے سپرد کر دیئے گئے۔ سات دن تک ایک جشن کی تیاریاں کی گئیں۔ اور پھر بادشاہ کو طلب فرمایا واللہ اعلم۔ تقریباً چھ سو خیمے نصب کئے گئے۔ بارہ مقامات پر خوشی کے نقارے بجوائے گئے۔ اور شاہانہ فرش بچھایا گیا۔ حضرت بادشاہ اس مجلس میں بہ نفس نفیس موجود تھے۔ پہلے دن برابر طرح طرح کے کھانے پکے اور شاہی خلعتیں، جڑاؤ تلواروں اور خنجروں کے ساتھ پہنچائی گئیں۔ دوسرے دن بادشاہ کو بلا کر اپنے قریب جگہ دی اور جو چیزیں تیار موجود تھیں سب ان کو بخش دیں۔ خیمے اور ڈیرے اور اونٹ اور خچر ایک بلند مقام پر کھڑے کئے گئے۔ جو کچھ سلطنت اور بادشاہی کے لئے درکار تھا سب مرحمت فرمایا۔ اور اپنے بیٹے کو بارہ ہزار فوج (7) کے ساتھ امداد کے لئے متعین کیا اور ارشاد فرمایا کہ ان کے لئے ضروری سامان سیستان میں ملے گا۔ اس شاہی سامان کے دینے کے بعد شاہ عالم پناہ کھڑے ہوئے اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے۔ اے محمد ہمایوں بادشاہ! ہماری طرف سے کمی اور آپ کی طرف سے کرم ہے۔

تیسرے دن قبق (8) پر انہوں نے تیراندازی کی رات ہونے پر ایک مجلس آراستہ کی گئی۔ اور دار چینی کا عرق منگوایا گیا۔ اور ہر ایک کے سامنے صراحی و شیشہ پیش کیا گیا۔ ہر شخص جو اس مجلس میں موجود تھا۔ اپنا جام خود بھرتا اور پیتا۔ ساقی کوئی نہ تھا۔ صبح ہونے پر اس مقام سے کوچ کیا۔ چلتے وقت بادشاہ شاہ عالم پناہ سے ملنے گئے۔ دیکھا کہ وہ ایک قالین پر بیٹھے ہیں۔ جس کی تین تہ ہیں۔ انہیں زمین پر اترنے میں کچھ تکلف ہوا۔ حاجی محمد قشقہ مغل نے فوراً اپنی ترکش کا کنارا پکڑا اور بچھا دیا۔ بادشاہ اس پر بیٹھ گئے۔ اور دریافت کیا کہ تو کون شخص ہے۔ اس نے عرض کیا کہ میں مغل ہوں

فرمایا کہ تم ہماری ہی خدمت میں رہو اس نے عرض کیا کہ میرا مالک آپ کی ملازمت میں ہے۔ بندہ کی کیا ہستی ہے۔ آپ میرے آقا کو جو کچھ حکم دیں گے وہ اس کو بجالائے گا۔ اس کے بعد میں بھی درگاہ عالم پناہ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ (9)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت گاہ سے روانہ ہو کر تبریز کی جانب چلے۔ منزل سے چار کوس کے فاصلہ پر قیام کیا۔ شاہ عالم پناہ نے بادشاہ سے کہا کہ آپ اپنی قیام گاہ پر ایک محفل منعقد کریں اور وہیں ہم سب جمع ہوں گے۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنے یہاں ایک شاہانہ محفل منعقد کی۔ اور طرح طرح کے کھانے تیار کئے جانے کا حکم دیا۔ شاہ طہماسپ نے کہا تھا کہ ہندوستانی کھانے تیار کئے جائیں۔ جب مجلس کے انتظامات مکمل ہو گئے تو حضرت شاہ طہماسپ کو اطلاع کرائی گئی۔ وہ اپنے گھر پر مدعو فرمایا۔ چنانچہ شاہ عالم پناہ، بادشاہ کے قیام گاہ پر تشریف فرما ہوئے۔ اس شاہانہ مجلس میں خوش آواز گانے والے بربط اور نے بجا رہے تھے۔ اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ کچھ شغل کے بعد ایک شاہی خوان تحائف سے بھرا ہوا لایا گیا۔ شاہ عالم پناہ نے فرمایا کہ یہ تقسیم کرو بادشاہ نے کہا جس کو حکم ہو۔ شاہ عالم پناہ نے فرمایا خواجہ معظم تقسیم کریں۔ خواجہ نے تقسیم کر دیا۔ ایک پلیٹ شاہ عالم پناہ کے سامنے اور ایک بادشاہ کے سامنے رکھی۔ باقی ماندہ ہر شخص کو حسب حیثیت تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد کھانا آیا اور وہ نوش کیا۔ ہندوستانی کھانوں میں سے خشک پلاؤ کو دال کے ساتھ کھایا کیوں کہ ان کے ملک میں خشک پلاؤ کو مرغی کے انڈے کے ساتھ ملا کر کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد وہ چل کر منزل میانہ پر پہنچ گئے۔ (شاہ عالم پناہ کا) حکم ہوا کہ محمد ہمایوں بادشاہ کا ڈیرہ وہیں رہنے دیا جائے۔ بادشاہ اپنے ڈیرہ کو اسی جگہ چھوڑ کر شاہ عالم پناہ کے ساتھ قطب رویہ روانہ ہوئے۔ دو کوس چلنے کے بعد پھر قیام کیا چوں کہ بارش شروع ہو گئی، بادشاہ نے شاہ عالم پناہ کی قیام گاہ میں آرام فرمایا۔

حوالہ جات

1- بابر اور شاہ اسماعیل کے تعلقات کی تفصیل مختلف تاریخوں میں موجود ہے۔ یہاں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ واقعات اور مورخین کے بیانات کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

ایرانی مورخین کا یہ الزام کہ ''بابر نے نجم ثانی کو قتل کرایا تھا'' بے بنیاد ہے۔ نجم بیگ درحقیقت قلعہ غجدوان کے محاصرہ کے دوران میں مارا گیا تھا (اکبر نامہ دفتر اول ص 15) اسٹورٹ صاحب اپنے ترجمہ میں نجم بیگ کو جنم بیگ لکھتے ہیں۔ (ص 69)

2- یہ واقعہ اسٹورٹ نے اپنے ترجمہ میں بالکل مختلف طریقہ پر لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پیش نظر نسخوں اور اسٹورٹ کے نسخہ کی عبارت میں کافی اختلاف ہے۔

3- جو نسخے ہمارے پیش نظر ہیں ان کی عبارت یہ ہے۔ ''حضرت شاہ عالم پناہ حضرت بادشاہ راندید، مصطرب شد کہ کجا باشد بتقریب ایں کہ ترکماناں جائے بلند درایشاں حماقتے واقع شد'' اس میں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

احمد الدین صاحب نے اپنے ترجمہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں کہ ترکمان لوگ جاہل ہیں کہیں ان سے کوئی حماقت سرزد نہ ہو جائے۔ (اس مترجم نے 'جاے بلند' کو ''جاھلند'' پڑھا اور بظاہر درست ہے۔ تاریخ)

4- فارسی نسخوں میں ''جائے منور'' ہے۔

5- ابوالفضل اور بایزید نے اس شکار کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (اکبر نامہ جلد اول ص 217-218) تاریخ ہمایوں و اکبر ص 32-35 بایزید اس موقع پر خود موجود تھا اور اس نے چشم دید واقعات بیان کئے ہیں (ص 36)

6- روشن بیگ خزانچی۔ ابوالفضل لکھتا ہے ''دیگر روشن کوکہ است کہ کوکلتاش حضرت جہانبانی جنت آشیانی بود۔ درین راہ باو جواہر سپردہ بودند۔ در آن ودیعت چوں خیانتے ظاہر کرد لاجرم چند روز در بند بود۔ و بوسیلہ عفو خلاصی یافت۔'' (اکبر نامہ جلد اول ص 222) اس واقعہ کو گلبدن بیگم نے نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے (ہمایوں نامہ ص 70-73)

7- بایزید اور نظام الدین احمد نے ایرانی فوج کی تعداد دس ہزار بتلائی ہے۔ لیکن ابوالفضل نے بارہ ہزار لکھی ہے۔ (تاریخ ہمایوں و اکبر ص 35 اکبر نامہ جلد اول ص 218 طبقات اکبری ص 210)

8- قبق ترکی میں کدو کو کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں ترک لوگ کدو کو لکڑی میں لٹکا کر نشانے کی مشق کیا کرتے تھے۔ اسی نسبت سے یہ لفظ نشانہ بازی کے لئے استعمال ہونے لگا۔

(قانون ہمایونی ص87)

9- اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ ایران بعض وقت ایسا برتاؤ کرتا تھا جس سے ہمایوں کو اپنی غریب الوطنی کا پورا احساس ہو جائے اس موقع پر اگر وہ قالین کو کھول کر بچھا دیتا تو ہمایوں کے بیٹھنے کے لئے بھی جگہ ہو جاتی۔

سولہویں فصل

بارش کے بعد شاہ عالم پناہ کا بادشاہ کو رخصت کرنا۔ اور بادشاہ کا قندھار کی طرف روانہ ہوا

ایک ساعت بھی نہ گزری تھی کہ شاہ عالم پناہ چاقو اور سیب اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے کھڑے تھے کہ فرمایا۔ محمد ہمایوں بادشاہ تم کو اجازت ہے۔ یہ لو۔ بادشاہ نے اپنا ہاتھ نیچے کرلیا۔ شاہ عالم پناہ نے فرمایا۔ اوپر اٹھایئے۔ ایک لحہ تک تعظیم کی اس کے بعد اپنی انگلیوں کے کناروں کو نیچے کرلیا۔ اور اس تحفہ کو (سیب) جلدی سے بادشاہ کو پیش کیا اور سلامتی کی دعا کر کے رخصت فرمایا۔ حکم دیا کہ بہرام مرزا ان کو ڈیرے [1] تک پہنچا کر رخصت کریں۔ جب اس جگہ سے روانہ ہوئے تو اُن کے کچھ لوگ بھی فاصلہ سے آ رہے تھے۔ یہ دونوں آپس میں گفتگو کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ بادشاہ خود اپنے دست مبارک سے سیب کو چاقو سے کاٹ کر نصف خود کھاتے اور نصف بہرام مرزا کو دے دیتے تھے۔ اس طریقہ سے منزل تک پہنچ گئے۔ جب بادشاہ کے خیمے نمودار ہوئے تو بہرام مرزا نے اپنے گھوڑے کی لگام روک کر اجازت طلب کی۔ بادشاہ نے اپنی جیب سے ایک انگوٹھی نکال کر جس میں الماس کا نگینہ لگا تھا بہرام مرزا کو دی اور کہا کہ یہ ہماری والدہ کی یادگار ہے [2] ہم تم کو بطور اپنی یادگار کے دیتے ہیں۔ فرمایا کہ ہمارے دل کو تمہاری وجہ سے تقویت تھی۔ ہم تم سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اور خواہش تھی کہ ساتھ ہی زندگی بسر کرتے، لیکن کسی نہ کسی طرح وقت گزار ہی دیں گے۔ زمانہ ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا۔ بہرام مرزا نے فرمایا کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ اطمینان رکھیں کہ آپ کا مقصد پورا ہوگا۔ رات گزرنے کے بعد میانہ کے مقام سے کوچ کیا۔ پانچ چھ کوس کے فاصلے پر ٹھہرے۔ تین دن بعد تبریز پہنچ گئے۔ پانچ دن یہاں

قیام رہا۔ بازار قیصر اور گنبد شام کی سیر کی۔ یہ گنبد ارض شام کی مٹی سے تیار کیا گیا ہے۔ بازار میں دو رومی (ترک) ملے۔ انہوں نے بادشاہ کو سلام کیا۔ بادشاہ نے فرمایا ہماری طرف سے شاہ روم کو دعا کہو۔ انہوں نے کہا ''بسر وچشم''۔ وہاں سے کوچ کر کے چار رات کی راہ طے کر کے اردبیل میں پہنچے۔ وہاں ایک ہفتہ قیام کیا۔ تا کہ شیخ صفی الدین اسحاق، جو شاہ طہماسپ صفوی کے جدامجد ہیں، اور شاہ اسماعیل کی قبروں کی زیارت کی۔ شیخ صفی الدین اسحاق شیخ کمال کے مرید ہیں۔ اور حضرت امیر تیمور صاحبقران المعظم گورگاں کی عنایت سے تخت پر فائز ہوئے (3) کیوں کہ شاہ عالم پناہ کی بھانجی معصوم بیگ کی لڑکی روانگی سے قبل بادشاہ سے منسوب کر دی گئی تھی۔ اس لئے مصلحتاً یہ ضروری تھ کہ وہ اردبیل جا کر ان مزارات کا طواف کریں۔ اور اس نسبت کا اظہار کر دیں۔ اردبیل جانے کا سبب یہ تھا۔ چنانچہ طواف کیا اور ایک ہفتہ اردبیل میں قیام کیا۔ مزار کے صدر دروازے پر ایک زنجیر بندھی ہوئی ہے۔ اور وہاں یہ طریقہ ہے کہ اگر کوئی ملزم فرار ہو کر اس (زنجیر کے نیچے) سے گزر جائے تو اس کو امان دیدی جاتی ہے۔ چاہے اس کا جرم چھوٹا ہو یا بڑا۔ اس کے بعد بحر قلزم (4) کی سیر کی جہاں ہمیشہ کہر محیط رہتا ہے۔ یہاں سے کوچ کر کے طارم کے مقام پر آئے۔ وہاں سے سرخاب پر۔ وہاں سے کوچ کرتے ہوئے قزوین پہنچے اور جب تک بادشاہ اردبیل خوردبیل، طارم، سرخاب، اور قزوین کے مقامات سے ہوتے ہوئے پہنچے۔ شاہ عالم پناہ یہاں دورہ فرما رہے تھے۔ ادھر بادشاہ قزوین پہنچے، اُدھر سے شاہ عالم پناہ بھی قزوین وارد ہوئے۔ اتنے میں بادشاہ کا لشکر نظر پڑا۔ شاہ عالم پناہ نے دریافت کیا کہ یہ کس کا لشکر ہے۔ عرض کیا ہمایوں بادشاہ کا۔ فرمایا کیا محمد ہمایوں بادشاہ ابھی تک اس ملک سے باہر نہیں گئے۔ اس کے بعد مہتر ضیای (5) کو حکم دیا کہ محمد ہمایوں بادشاہ کو بارہ کوس تک (6) پہنچا کر آؤ۔ چنانچہ بادشاہ کو فرس (7) کے قلعہ تک ہی پہنچایا تھا کہ جنگل میں چار سوار نمودار ہوئے۔ اور انہوں نے یعقوب سفرچی کو قتل کر ڈالا۔ یہ خبر بادشاہ کو ہوئی۔ انہوں نے ان سواروں کا پیچھا کیا۔ جب قریب پہنچے تو انہوں نے کہا تم ہمارے پیچھے کس لئے آ رہے ہو۔ ہم نے اس کو شاہ عالم پناہ کے حکم سے مارا ہے۔ یعقوب کے قتل کا سبب یہ تھا کہ حسن علی یشک آقا یعقوب مذکور سے بغض رکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس دن شاہ عالم پناہ نے بادشاہ کو تلواریں مرحمت فرمائی تھیں ان میں سے ایک تلوار حسن علی ایشک آقا لے گیا۔ یعقوب نے دیکھ لیا اور بادشاہ کو خبر کر دی کہ تلوار حسن علی لے گیا ہے۔ آخر الذکر نے اس وجہ سے شاہ عالم پناہ کی خدمت

میں شکایت کی کہ یعقوب نے تاج کی توہین کی ہے۔ یعقوب سفرچی کے قتل کا سبب یہ تھا۔ اس کے بعد سبزوار (8) پہنچے وہاں حکم دیا کہ حضرت بیگم مع لشکر کے طبس کے راستہ پر جائیں۔ اور خود بدولت مشہد مقدس کی طرف حضرت امام موسیٰ رضا کے آستانہ پر حاضری کے لئے روانہ ہوئے۔ اور وہاں پہنچ کر حضرت امام دین و دنیا علی بن موسیٰ رضا علیہ التحیہ والثنا کے آستانہ کا طواف کیا اور فاتحہ پڑھی۔ وہ کمان جو جاتے وقت یہاں چھوڑ گئے تھے معہ چلہ کے مل گئی۔ آستانہ پر بہت خوشی اور سرور حاصل ہوا کیوں کہ حضرت امام موسیٰ رضا رحمتہ اللہ علیہ کی مدد ہمارے شریک حال تھی۔ سات دن تک مشہد مقدس میں برف باری رہی۔ جب برف باری کم ہوئی تو وہاں سے کوچ کیا اور راوت (9) طرق کے مقام پر منزل کی۔ وہاں سے کوچ کر کے سنگرہ کے مقام پر جہاں شاہ قاسم انوار کا مزار ہے مقیم ہوئے۔ وہاں سے کوچ کر کے قلعہ کاہ پر جہاں بارہ اماموں میں سے ایک نے پردہ فرمایا ہے، تشریف لائے۔ آج تک نقاروں اور نفیری کی آواز وہاں سنائی دیتی ہے۔ جو شخص اپنی ضرورت کو لے کر وہاں عجز و انکساری کے ساتھ حاضری دے تو حق تعالیٰ جل جلالہ اس کی ضرورت پوری فرما دیتا ہے۔ بادشاہ اس مقام پر پہنچ گئے۔ ایک شب کے بعد طبس میں نزول فرمایا۔ وہاں سے چند منزلیں طے کر کے سیستان پہنچے۔ یہاں تقریباً 5 دن قیام کیا۔ اس لئے کہ شاہ عالم پناہ نے حکم دے دیا تھا کہ ان کے امراء تمام ضروری سامان وہاں مہیا کر دیں گے۔ چنانچہ تمام امراء اپنے اپنے پرگنوں سے آئے اور عرض کیا کہ حضور والا ان غلاموں کا سامان ملاحظہ فرمالیں۔ یہاں سے دس کوس پر قلعہ بض عرف (10) مدائن یعنی نوشیرواں کا پایہ تخت واقع تھا۔ اس جگہ میر خلج تھا جو مرزا عسکری کے امراء میں شامل تھا۔ فرمایا علی الصباح ہم سامان وہاں دیکھیں گے۔ اگر وہ بھی حاضر خدمت ہوا تو بہت اچھا ہے ورنہ میں تم کو اس پر متعین کروں گا کہ اس قلعہ کو لوٹ لو۔ اور نمک حراموں کو قتل کر ڈالو۔ ترکمانوں نے عرض کیا کہ یہ شاہ عالم کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ہم شاہ عالم پناہ کو (اس کے متعلق) لکھ دیں گے۔ جب لشکر سامنے آیا۔ تو اگرچہ بارہ ہزار سواروں کے متعلق لکھا تھا، لیکن سپاہیوں کی تعداد چودہ ہزار نکلی۔ اس کے بعد میر خلج اپنی گردن سے تلوار باندھ کر رکاب بوسی سے مشرف ہوا۔ (11) وہاں سے کوچ کر کے قندھار پہنچے اور بیرم خاں کو ایلچی بنا کر مرزا کامران کے پاس کابل روانہ کیا۔ میرزا عسکری حاضر خدمت نہ ہوا۔ قلعہ کے اندر کے لوگ لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ اور گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ پہلی لڑائی میں بابا دوست

قوربیگی اور مہتر یوسف شربتی نے جام شہادت نوش کیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ قندھار کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا جائے۔اور مال و دولت تقسیم کردیئے جائیں،الغ مرزا جو کامران کے پاس قید تھا،اور میر شیر افگن کی نگرانی میں تھا مع اُس (میر شیر افگن) کے کابل سے فرار ہوکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔اور شرف قدم بوسی حاصل کیا۔ایک دن بادشاہ ایک پہاڑی پر گئے ہوئے تھے کہ ان کی نظر خچروں کی قطار پر پڑی دریافت کیا کہ ان کا مالک کون ہے۔مخبر نے عرض کیا کہ مرزا عسکری کی والدہ۔(12) فرمایا کہ انہوں نے ہماری خدمت کی ہے۔اس کے بعد مرزا عسکری کے دیوان خانہ کو دیکھا۔حکم دیا کہ اس کے گنبد (پنجرہ) پر گولہ باری کی جائے۔چنانچہ بہ تعمیل حکم ان پر گولہ باری کی گئی۔یہاں تک کہ قلعہ کے اندر کہرام مچ گیا۔اور آدمیوں کی جماعت درہم برہم ہوگئی۔

حوالہ جات

1- اصل نسخوں میں ''ڈیرے'' کا لفظ ہی استعمال کیا گیا ہے۔

2- بعض نسخوں میں والدہ کا لفظ ہے لیکن اسٹورٹ اور ارسکن دونوں نے والدہ لکھا ہے۔یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

3- شاہان صفوی کی ابتدائی تاریخ پر اسٹورٹ نے ایک مختصر نوٹ دیا ہے۔سر جان ملکم کی تاریخ ایران میں بھی ان کے جد امجد شیخ صفی الدین اور ان کی اولاد کا ذکر ہے۔جوہر نے شیخ صفی الدین کی تیمور سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔یہ غلط ہے۔شیخ مذکور کے جانشین شیخ صدرالدین اس سے ملے تھے۔زبدۃ التواریخ کے حوالہ سے سر ملکم لکھتے ہیں ''جب شیخ صفی کا وصال ہوا تو شیخ صدرالدین ان کے جانشین ہوئے۔اس عہد کے بہت سے فرماں روا ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔جن میں امیر تیمور بھی شامل ہیں۔امیر نے شیخ سے کہا کہ وہ اس سے کوئی چیز طلب کریں شیخ نے کہا کہ آپ ان تمام قیدیوں کو رہا کردیجئے جو ملک روم سے گرفتار ہوکر آئے ہیں۔تیمور نے ان کی یہ خواہش پوری کی'' (ترجمہ تذکرۃ الواقعات صفحہ 56-57 تاریخ ایران از ملکم۔جلد اول صفحہ 32)۔

4- یہ بحر قلزم تو نہیں ہوسکتا۔ شاید جوہر کو مغالطہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب بحیرۂ خزر سے ہوگا جو طارم سے قریب ہی ہے۔

5- مہتر ضیا۔ اسٹورٹ نے اس نام کو مہتر خیالی پڑھا ہے۔

6- پیش نظر نسخوں میں دروازہ فرسخ لکھا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے دوازدہ فرسخ پڑھا ہے۔ اسٹورٹ نے بھی دوازدہ فرسخ کا ترجمہ کیا ہے۔

7- فرس غلط ہے۔ ورس کا قلعہ مراد ہے۔ اسٹورٹ نے ارس پڑھا ہے۔ (ارسکن جلد دوم صفحہ 296)۔

8- سبزوار میں حمیدہ بانو بیگم کے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ (اکبرنامہ جلد اول صفحہ 220)

9- راوت طرق۔ ابوالفضل نے کاروان سرائے طرق اور بایزید نے صرف طرق لکھا ہے۔ (اکبرنامہ جلد اول ص 221۔ تاریخ ہمایوں واکبر ص 38)

10- نسخوں میں قلعہ بض ہے، جیسا کہ ابوالفضل اور بایزید کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے یہ قلعہ بست ہونا چاہئے۔ میر خلج یہیں کا شقدار تھا۔ جوہر نے اس جگہ بہت اختصار سے کام لیا ہے اور واقعات کی ترتیب میں غلطی کی ہے۔ (اکبرنامہ جلد اول ص 227)۔ (تاریخ ہمایوں واکبر ص 39)۔

11- جوہر نے قلعہ بست کے محاصرہ کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔ ابوالفضل اور بایزید وغیرہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہم علی جلدیر اور امیر خلج نے مقابلہ کیا۔ لیکن اس میں اس کو کامیابی نہ ہوئی۔

12- بیگم مادر میرزا عسکری۔

سترہویں فصل

مرزا عسکری کا بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونا اور قلعہ قندھار پر قبضہ کرنا

جس وقت بادشاہ قلعہ قندھار کے محاصرہ میں مصروف تھے اُسی زمانہ میں میرزا کامران نے نواب خانہ زاد بیگم کو جو فردوس مکانی بابر بادشاہ کی ہمشیرہ تھیں، پیغام بھیجا کہ عسکری مرزا کو حضرت بادشاہ کے قدموں میں پیش کریں۔ چنانچہ عفت پناہی بیگم صاحبہ نے مرزا عسکری کے قصور کی معافی کی درخواست کی اور اس کو قلعہ سے باہر لا کر حضرت بادشاہ کی قدم بوسی سے مشرف فرمایا۔

ترکمانوں نے جو مرزا الغ کو سنجیدہ دیکھا تو کہا کہ یہ ہمایوں بادشاہ کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ قلعہء قندھار کے فتح کرنے کے بعد امراء (1) نے حضرت بادشاہ سے یہ درخواست کی کہ مرزا عسکری کے خزانہ کی نگہبانی کی جائے۔ مرزا عسکری کو بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔ ورنہ خزانہ شاہ عالم پناہ کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے۔

بادشاہ نے فرمایا کہ خزانہ کو پیش کش کے طور پر بھیج دیا جائے گا (2) اور یہ حکم صادر فرمانے کے بعد حضرت بادشاہ خود قلعہ میں تشریف لے گئے۔ ہمر کابی میں مہتر واصل توشک چی اور مہتر انس جن کو ''مہتر خاں'' کا خطاب ہے، بندہ خاکسار جوہر آفتاب چی اور شاگرد پیشہ سپاہی تھے۔ جب بادشاہ مرزا عسکری کے محل میں داخل ہوئے تو حکم دیا کہ خزانے کو باہر لا کر جمع کریں۔ جس جگہ خزانہ جمع کیا جا رہا تھا وہاں بادشاہ خود شاہ قلی خاں جو کرمان کا حاکم تھا، اُس کا بھائی، جو بادشاہ کا قورچی باشی تھا۔ شاہ حسین سلطان ہاکم سنجاب کا لڑکا بداغ خاں اور احمد خاں سلطان حاکم سیستان (جس نے جاتے وقت بادشاہ کی بہت خدمت کی تھی) موجود تھے۔ ان سب کی موجودگی میں خزانہ پر قفل لگا دیا گیا اور اس پر بادشاہ اور شاہ قلی خاں جو شاہ ایران کے امراء میں سے تھا اور میر بداغ خاں کی

مہریں لگادی گئیں۔اور قلعہ سے باہر آ گئے۔ترکمانوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ بادشاہ اور میرزا عسکری اور خزانہ کو شاہ ایران کے پاس لے جانا چاہئے تا کہ وہ اس کے متعلق حکم صادر فرمائیں۔یہ خبر بادشاہ کو پہنچ گئی اور اُنہوں نے حکم دیا کہ تمام امراء توپ خانہ اور پچاس سوار (3) مسلح ہو کر ہر طرف سے حاضر ہوں۔جب امراء ہر طرف سے جمع ہو رہے تھے تو ترکمانوں نے ان کو دیکھ کر آپس میں یہ قرارداد کی کہ بادشاہ کا ارادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔چنانچہ ان کے والد بابر بادشاہ نے نجم بیگ وزیر کو ازبکوں اور ترکمانوں کے ہاتھ سے قتل کرادیا تھا۔یہ ضرور ہم سب کو بھی قتل کرادے گا۔یہ بات سمجھ کر مرزا عسکری کے خزانہ کو لدھوادیا۔اور بارہ کوس کے فاصلہ پر منزل تھی، وہاں پہنچ گئے اور منزلیں طے کرتے ہوئے شاہ عالم پناہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔شاہ ایران نے خلعت اور ایک تیز رفتار خچر بھیجا۔بادشاہ تعظیم کے لئے اُس خچر پر سوار ہو کر پانچ چھ قدم چلے اور پھر نیچے اُتر آئے۔وہاں سے کوچ کر کے باغ خلجہ (4) میں قیام کیا۔اور ایک ماہ وہاں ٹھہرے رہے۔بداغ خاں نے کہا کہ غلہ کی رسد ہمایوں بادشاہ کے پاس سے لشکر میں نہ پہنچنے دیں۔جب یہ خبر بادشاہ کو ہوئی تو امراء سے مشورہ کیا۔انہوں نے عرض کیا کہ ترکمانوں نے ایک ہزار سات سو گھوڑے سوداگروں کے ہاتھ فروخت کئے ہیں۔اور یہ گھوڑے قلعہ کے باہر موجود ہیں۔ان کو قبضہ میں لانا چاہئے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ لشکر گنبد سفید کے مقام پر قیام کرے اور خود بدولت بابا حسن ابدال کے مقام پر تشریف لائے۔ظہر کی نماز اسی جگہ ادا کی، پھر حکم دیا کہ پہلے حاجی محمد کو کہ روانہ ہوں۔ان کے پیچھے الغ بیگ ان کے بعد بیرم خاں اور ان کے بعد حضرت بادشاہ بہ نفس نفیس روانہ ہوئے۔ظہر و عصر کے مابین قندھار پہنچ کر گھوڑوں پر قابض ہو گئے۔وہاں سے واپس آ کر نصف شب کے قریب لشکر میں آ ملے۔صبح ہونے پر فرمایا کہ تمام گھوڑوں پر داغ لگائے جائیں۔سوداگروں کو تمسک لکھ کر دیدیئے گئے کہ تم سے قرض لیا گیا ہے۔اور ایک سو پچاس گھوڑے ہندال مرزا اور ناصر مرزا کے لئے علیحدہ کر دیئے گئے۔باقی گھوڑوں کو حسب مراتب تقسیم کر دیا گیا۔

حوالہ جات

1- یعنی امراء ایران نے۔

2- ہمایوں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ خزانہ پر شاہ ایران کا کوئی حق نہیں، لیکن تعلقات خوشگوار رکھنے

کی غرض سے پیش کش کے طور پر بھیج دیا جائے گا۔

3- پچاس سوار۔ پیش نظر نسخوں میں ''پنجاہ سوار'' لکھا گیا ہے۔ احمد الدین احمد صاحب نے پچاس ہزار لکھا ہے۔ اس وقت ہمایوں کے پاس اس قدر فوج نہ تھی۔ ارسکن نے کوئی تعداد نہیں دی۔ صرف اس قدر کہا ہے کہ بادشاہ نے اپنے پرانے اور نئے سب ساتھیوں کو جمع کر کے معائنہ کیا جس سے ایرانی فوج کے امراء گھبرا گئے۔

4- ابوالفضل نے ''چہار باغ حضرت فردوس مکانی'' لکھا ہے (ص 232)۔

5- اکبر نامہ کی عبارت یہ ہے: ''از باغ حضرت فردوس مکانی نہضت نمودہ بالاتر از مقام حسن ابدال در گنبد سفید نزول اجلال فرمودند۔''

اٹھارہویں فصل

شاہزادہ ایران کی وفات۔ اور قافلہء قندھار پر ہمایوں کا قبضہ کرنا

ترکمانوں کے پاس سے کابل جانے کا ارادہ تھا۔ گھوڑوں کی تقسیم کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے ہی تھے کہ شاہ ایران کے لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ بداغ خاں نے یہ خبر بادشاہ کو نہیں پہنچائی۔ (1) بادشاہ نے اپنے امراء سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہئے۔ شاہ ایران کے لڑکے کا انتقال ہو گیا ہے اور بداغ خاں قلعہ میں موجود ہے۔ آخر یہ طے ہوا کہ بداغ خاں سے قندھار کا قلعہ لے لیا جائے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ قلعہ کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حاجی محمد کوکہ نے عرض کیا کہ یہ خدمت بندے کے سپرد کی جائے۔ یہی طے ہوا۔ فاتحہ پڑھی اور آدھی رات کے وقت وہاں سے کوچ کیا۔ صبح جوں ہی قندھار کے دروازے کھولے گئے، حاجی محمد کوکہ قلعہ میں گھس گیا ایک آدمی کے تیر مارا اور بداغ خاں کے آدمیوں نے ارک میں پناہ لی۔

بادشاہ قندھار سے ایک ہی کوس کے فاصلہ پر پہنچے تھے کہ ہوش نامی حاجی محمد کوکہ کے خدمتگار نے حاضر خدمت ہو کر قلعہ کی فتحیابی کی مبارکباد پیش کی (2) بادشاہ نے وہاں پہنچ کر برج اقشعہ میں قیام فرمایا۔ بداغ خاں قلعہ کے اندر تھا۔ جب بادشاہ نے اس کو یہ کہلا بھیجا کہ شاہ عالم پناہ کا بیٹا ہمارا بیٹا تھا اس کو اُنہوں نے ہمارے ہی سپرد کر دیا تھا۔ وہ فوت ہو گیا اور تو نے ہم کو خبر تک نہ بھیجی کہ ہم تعزیت کو آتے اور اس کے لئے خیرات وصدقہ کرتے۔ تیری سزا یہی ہے کہ تو دروازے سے باہر نہ آئے۔ کیوں کہ مجھے خوف ہے کہ چغتائی تجھے قتل کر ڈالیں گے۔ لیکن میں تیری جان بخشتا ہوں۔ قلعہ کی پیچھے کی دیوار میں نقب لگا کر نکل جا۔ میں تیری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ آخر الامر بداغ خاں قلعہ کے پیچھے نقب لگا کر باہر چلا گیا۔ بادشاہ نے ولایت قندھار کو اپنے امراء میں تقسیم کیا۔ چونکہ

فصل ربیع کے محاصل کا ایک حصہ ترکمان وصول کر چکے تھے۔ اس لئے جو کچھ باقی تھا انہوں نے وصول کیا۔ اور اپنے تصرف میں لائے۔

اس کے بعد حضرت بیگم اور بیرم خاں کو قندھار کے قلعہ میں چھوڑا۔ اور فرمایا کہ قندھار کا قلعہ میں نے بیرم خاں کے سپرد کیا۔ اور بیگمات کو خواجہ عنبر کے وہاں سے کوچ کر کے کابل کی طرف روانہ ہوئے۔ مرزا کامران کے سب امیروں نے ایک عرضداشت بھیجی تھی کہ ہم غلام اور کابل کا ملک حضور ہی کے ہیں۔ آپ تشریف لائیے۔ ہم خدمت سے منہ نہ موڑیں گے۔ جب تبری کے مقام پر پہنچے جو ضلع ہزارہ میں واقع ہے اور مرزا الغ بیگ کی جاگیر میں تھا تو مرزا ہندال اور تردی بیگ حاضر خدمت ہو کر قدمبوسی سے مشرف ہوئے۔ مرزا کامران نے کابل سے باہر آ کر باغ گزرگاہ میں قیام کیا۔ بادشاہ معہ اپنے فتح مند لشکر کے مسلح ہو کر کوچ کرتے ہوئے آ رہے تھے کہ خبر پہنچی کہ قاسم برلاس مرزا کامران کی طرف سے درۂ خمار (3) تک جنگ کے ارادہ سے آ چکا ہے۔ بادشاہ نے حاجی محمد کوکہ۔ خواجہ معظم بیگ۔ تولک تورچی اور ایسے ہی چند اور لوگوں کو قاسم برلاس سے جنگ کرنے کے لئے متعین کیا۔ وہ آئے اور درۂ خمار میں لڑائی ہوئی۔ خواجہ معظم اور تولک تورچی نے خوب تلوار چلائی۔ حق تعالیٰ نے فتح نصیب کی۔ اور شکست خوردہ لوگ بھاگ گئے۔ بادشاہ درۂ خمار میں تشریف لائے۔ امراء نے مبارکباد پیش کی۔ بعض امراء اور ارکان دولت نے عرض کیا کہ مرزا کامران کا قصور معاف کر دیا جائے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ پہلے میں وہاں جا کر یہ دیکھ لوں کہ معاملہ کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ جو کچھ مصلحت ہوگی وہی کروں گا۔ کوچ کا نقارہ بج چکا تھا کہ اللہ قلی اور بہادر (4) نے شرف قدم بوسی حاصل کر کے عرض کیا کہ حیدر سلطان ہمارے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ بادشاہ اُن سے بغلگیر ہوئے اور فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے باپ کے بجائے ہم ہیں۔ ہم تمہاری پرورش کریں گے۔ فکر نہ کرو اور ہمت نہ ہارو۔ بادشاہ نے ان کو تشفی اور تسلی دی اور حیدر سلطان کو آخری منزل (قبر) تک پہنچایا اور پھر روانہ ہو گئے۔ اور خواجہ بستان (5) کے مقام پر پہنچے اور مقیم ہوئے۔ جو باغ گزرگاہ سے جہاں جنگ ہوئی تھی، تین کوس دور تھا۔ اسی وقت پیرزادہ خواجہ عبدالحق اور خواجہ جان محمد (6) بادشاہ کی خدمت میں صلح کے لئے حاضر ہوئے۔ بادشاہ گھوڑے سے اُترے اور اُن کے قواعد دریافت فرمائے اور نماز فجر پیرزادوں کی معیت میں ادا فرمائی اور اُن کو رخصت کیا۔

پیرزادوں نے کہا کہ آپ لوگوں کے درمیان ہم صلح کراتے ہیں۔ اگر کامران مرزا ہماری نصیحت قبول کر لے گا تو ہم دور تک پہ ظہر وعصر کے (7) درمیان آپ کی خدمت میں واپس آ جائیں گے۔ اگر نہ آئیں تو پھر آپ خود اپنی فکر کریں۔ چوں کہ کامران مرزا نے نصیحت نہ مانی (8) اس لئے پیرزادہ رخصت ہو کر کابل میں آ گئے۔ (9) وعدہ کا وقت پورا ہو گیا۔ اس لئے بادشاہ نے روشنک تو شک بیگی کو کامران مرزا کے پاس یہ کہلا کر بھیجا کہ ہم مسافر ہیں اور تم مجاور۔ اگر تم آؤ تو اختیار ہے ورنہ ہمیں تو ضرورت نہیں ہے۔ جب روشنک مرزا کامران کے پاس گیا تو وہ اس کو پہچانتا تھا اس لئے تعظیم کی، اور جو کچھ ماجرا تھا اس نے سب معلوم کر لیا۔ مرزا نے وضو کیا اور کہا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔ روشنک نے دیکھا کہ آدمی پریشان حال ہیں اور کابل کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ روشنک مرزا کی اجازت کے بغیر آ گیا اور جو کچھ دیکھا تھا حضور میں عرض کیا۔ بادشاہ نے مرزا ہندال۔ حاجی محمد کوکہ اور چند دیگر امراء کو حکم دیا کہ وہ روانہ ہوں 700 سوار نیزہ بازا پنے اپنے نیزے لے کر ہمارے ساتھ چلیں۔

سب سے پہلے خواجہ کلاں بیگ کا لڑکا مصاحب بیگ جو کامران کا امیر الامراء تھا، آیا اور حضرت کو دعا دی اور مرزا کامران کے جو امراء آتے تھے وہ دور سے دعائیں دیتے تھے (بادشاہ) فرماتے تھے خیریت سے آئیں۔ اسی طرح چلتے رہے۔

حوالہ جات

1- پیش نظر نسخوں میں ''رساند'' ہے جو یقیناً غلط ہے۔ غالباً عبارت میں کاتب کی غلطی سے ''نہ'' رہ گیا ہے۔

2- ابوالفضل کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں نے شاہ ایران سے وعدہ کر لیا تھا کہ قندھار اس کو دیدیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ایرانی سپاہیوں نے قندھاریوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا اور اُن پر اس قدر ظلم کیا کہ وہ لوگ فریاد لے کر ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس کے علاوہ بعض مورخین مثلاً عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ ایرانی سپاہی

تبرا کرتے تھے جس سے سینوں کو روحانی اذیت ہوتی تھی۔ اس پر بھی شاید ہمایوں کی بردباری اس کو خاموش رکھتی لیکن بداغ خاں کا رویہ ایسا نہ تھا کہ ہمایوں اس کو برداشت کرتا۔ ہمایوں نے اس سے کہلوایا کہ وہ کچھ ضروری سامان اور عورتیں قلعہ میں چھوڑنا چاہتا ہے۔ بداغ خاں اس کے لئے تیار نہ ہوا۔ اسی زمانہ میں شاہ ایران کا لڑکا شہزادہ مراد کا انتقال ہوگیا۔ اب ہمایوں کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ مجبوراً اُس نے قندھار پر حملہ کر کے اس کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ (اکبرنامہ جلد اول ص238-239، طبقات اکبری ص211۔ منتخب التواریخ۔ مطبوعہ نولکشور پریس ص122)۔

3- خمار۔ بعض نسخوں میں تکسائے خار بھی لکھا ہے۔ اکبرنامہ کے مطبوعہ نسخہ میں تکیہء چمار ہے۔

4- اللہ قلی بہادر۔ یہ علی قلی بہادر ہونا چاہئے۔ علی قلی اور بہادر دونوں بھائی تھے اور حیدر سلطان کے لڑکے تھے۔ (اکبرنامہ جلد اول صفحہ 244۔ تاریخ ہمایوں و اکبر ص57)

5- خواجہ بستاں۔ اکبرنامہ (ص243) میں خواجہ پشتہ اور تاریخ ہمایوں و اکبر میں (ص56) خواجہ بستہ ہے۔

6- اکبرنامہ میں خواجہ خاوند محمود ہے (ص244)۔ بایزید نے یہ تین نام دیئے ہیں: ''حضرت خان محمود و خواجہ عبدالحق و خواجہ دوست خاوند.....'' (ص57)۔

7- اصل الفاظ یہ ہیں ''نیم روز میانہ دو نماز۔''

8- یہاں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ''پند پزیر شد'' کے بجائے ''پند پذیر نہ شد'' ہونا چاہئے۔

9- بایزید کے بیان کے مطابق مرزا نے اپنے سفیروں کو دو مرتبہ کچھ ہمایوں کے پاس بھیجا لیکن ان لوگوں نے جو شرائط صلح پیش کیں وہ ہمایوں نے قبول نہیں کیں (ص58)۔

اُنیسویں فصل

کابل پر قبضہ کرنا۔ اور مرزا کامران کا پہلی مرتبہ بھکر کی طرف فرار ہونا اور بادشاہ کا سلیمان مرزا سے بمقام تیرگراں جنگ کے بعد فتح پانا

جب بادشاہ اپنے دبدبہ اور اقبال کے ساتھ وہاں پہنچے تو مرزا کامران بھاگ کر قلعہ کے اندر چلا گیا۔ اور قراچہ خاں اور خواجہ دوست خاں سے کہا کہ تم بادشاہ کو اس وقت تک روکے رہو جب تک میں اپنے بال بچوں کو یہاں سے نکال لے جاؤں۔ وہ ٹھہرے ہوئے تھے قراچہ خاں اور خواجہ دوست خاں نے بادشاہ کو اس حالت میں نہ دیکھا کہ بادشاہ قلعہ کے اندر نہیں آئے۔ جب مرزا کامران اپنے بال بچوں کو باہر لایا اسی دن تین چار پہر رات گزرنے پر قراچہ خاں اور خواجہ دوست خاں نے آ کر قدمبوسی کی۔ اور مبارکباد پیش کرنے کے بعد عرض کیا کہ قلعہ کے اندر تشریف لائیں۔

بادشاہ قلعہ میں داخل ہوئے[1] وہاں مرزا کامران کے دیوان خانہ میں ایک بڑے خیمہ میں مقیم ہو گئے۔ اور واصل توشکچی سے فرمایا کہ ایک پہر رات گزر چکی ہے۔ ہم نے ابھی روزہ افطار نہیں کیا،[2] کیا یہاں کوئی ہے جو گرم یخنی کا ایک پیالہ تیار کر دے۔ پھر بادشاہ کو یاد آیا۔ (فرمایا کہ) بی بی کے گھر جن کا نام بیکہ بیگم تھا، یخنی تیار ہو تو جا کر لے آؤ۔ مہتر واصل، توشک بیگ اور جوہر آفتابچی تینوں گئے اور سلام و دعا کے بعد عرض کیا کہ بادشاہ نے ابھی تک کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔ ہم کو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ اگر کھانے کو کچھ ہو تو دیدیں۔

عصمت پناہی بیگم نے گائے کے گوشت کا قلیہ اور شکنبہ گاؤ[3] پیش کیا۔ مہتر واصل نے دسترخوان بچھا کر کھانا لگایا۔ جیسے ہی بادشاہ نے کھانے میں چمچہ ڈالا، کیا دیکھتے ہیں کہ گائے کا

گوشت اور گائے کا شکنبہ ہے۔ چمچہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور رونے لگے اور کہا کہ اے مرزا کامران! تو کس طرح سرسبز ہوسکتا ہے کہ تو نے یہاں تک نوبت پہنچادی کہ عصمت پناہی بی بی صاحبہ کے وظیفہ معاش میں گائے کا گوشت اور شکنبہ مقرر کیا ہے۔ کیا تو یہ نہیں کرسکتا تھا کہ ان کے مطبخ کے لئے ایک بکرا مقرر کردیتا۔ عصمت پناہی بی بی صاحبہ وہ ہیں جنہوں نے فردوس مکانی کی ہڈیوں کو لا کر بزرگوں کے پاس دفن کیا۔ باوجود اس کے کہ ہم فردوس مکانی کے چار بیٹے ہیں۔ لیکن ہم نے وہ نہیں کیا جو انہوں نے کیا۔ (4) آخر کار انہوں نے شربت کا ایک (5) پیالہ پیا اور دوسرے دن پھر روزہ رکھ لیا۔ فی الجملہ مرزا کامران کے چھوٹے اور بڑے سب امراء بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر قدم بوسی سے مشرف ہوئے۔ انہوں نے ہر ایک کو تسلی اور دلداری فرمائی اور خوش کیا اور امن قائم ہوا۔ اور علاقہ کو حسب حیثیت تقسیم کیا۔ اس کے بعد مرزا سلیمان کے نام ایک فرمان صادر کیا۔ کہ ہماری وجہ سے مرزا کامران نے تم کو بہت تکلیف دی۔ (6) اب حالات حسب مراد ہوگئے ہیں۔ اطمینان رکھو۔ ہم کو ملاقات کا بہت اشتیاق ہے۔ کب ملاقات ہوگی۔ مرزا سلیمان نے جواب لکھا کہ مرزا کامران سے ہمارا عہد ہے کہ جب تک میں تم سے جنگ نہ کروں گا، ملاقات نہیں کروں گا۔

اس کے بعد بادشاہ کو شہزادے محمد اکبر خلد اللہ ملکہ کی فکر ہوئی۔ اور فرمایا کہ صورت خانہ کو سجایا جائے۔ اور قراچہ بیگ اور مصاحب بیگ کو قندھار بھیجا، تاکہ مریم مکانی حمیدہ بانو بیگم کو لے آئیں کہ شہزادہ کی ختنہ کی تقریب کی جائے۔ اور خود دریائے باراں کی سیر کو گئے۔ دو ماہ بعد مریم مکانی بیگم قندھار سے تشریف لے آئیں اور بادشاہ بھی سیر سے واپس آگئے۔ بادشاہ کے لئے ایک تخت لگایا گیا اور بعض امراء اور میرزاؤں کے لئے کرسیاں رکھی گئیں۔ بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ مرزا اور امراء بھی حسب مراتب کرسیوں اور تکیوں پر بیٹھے اور خوشیاں منائیں۔ شہزادہ کی رسم ختنہ ادا کی گئی۔ مرزاؤں اور امراء کو خلعت عطا کئے گئے۔ اس رسم کے بعد بادشاہ قلعہ ظفر کی طرف روانہ ہوئے۔ میر محمد علی تغائی کو کابل کی حکومت دی۔ (7) اس کے بعد جنگ کی تیاری کر کے بادشاہ روانہ ہوئے۔ جب اندراب کے قریب پہنچے تو دوسری طرف سے مرزا سلیمان آگئے اور تیرگران گاؤں کے نزدیک جنگ ہوئی۔ حق تعالیٰ جل جلالہ نے فتح عطا فرمائی۔ (8) مرزا سلیمان شکست کھا کر بھاگ گیا اور بادشاہ کوچ کر کے کشم کے مقام پر واپس آگئے۔ وہاں تین ماہ تک مقیم رہے۔

اس کے بعد کشم سے چار کوس پر نزول فرمایا۔ یہاں بادشاہ کی طبیعت خراب ہوگئی۔ ایک روز بے خوابی کا سخت غلبہ رہا یہاں تک کہ لوگ اُن کی زندگی سے مایوس ہو گئے اور اسباب لے کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ قراچا خان نے دھوکا دے کر مرزا عسکری کو گھر میں بلا لیا اور اپنی نگہداشت میں رکھا۔ حضرت ماہ چوچک بیگم اگرچہ بہت کمزور ہوگئی تھیں لیکن انار کا عرق نکال کر بادشاہ کے حلق میں ڈالتی رہیں۔ حق تعالیٰ جل جلالہ نے شفا بخشی۔ اُنہوں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو بیگم کا حال بہت خستہ پایا۔ اشارہ سے دریافت کیا کہ کیا حال ہے۔ عرض کیا کہ تمام عالم پریشان ہے۔ فرمایا قراچا خاں کو بلاؤ۔ جب وہ حاضر ہوا تو اُس کو قریب بلایا اور فرمایا کہ اب ہم بالکل ہوشیار ہیں لوگوں کو اطمینان دلا دو۔ وہ باہر آیا اور بادشاہ کی صحت کا اعلان کیا۔ بادشاہ کو کامل صحت عطا ہوئی اور وہاں سے کوچ کر کے قلعہ ظفر (9) کی جانب روانہ ہوئے۔ جب وہاں پہنچے تو حکم فرمایا کہ مہتر واصل اور مہتر وکیلا (10) کابل جا کر خیمہ وغیرہ کا انتظام کریں۔ تا کہ یہاں سے بخیریت واپس ہو کر ہندوستان کی جانب بڑھیں۔

حوالہ جات

1- ابوالفضل نے فتح کابل کی تاریخ 12 رمضان مبارک 952ھ لکھی ہے۔ بایزید لکھتا ہے کہ 10 رمضان مبارک 943ھ کو ہمایوں کابل میں داخل ہوئے۔ یہ غلط ہے۔ فرشتہ میں بھی 10 رمضان ہی ہے۔ نظام الدین احمد نے 953ھ لکھی ہے، لیکن آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ بعض مورخین نے فتح کابل کی تاریخ 952ھ لکھی ہے۔ (اکبر نامہ ص 244 طبقات اکبری ص 212۔ فرشتہ جلد اول ص 248۔ تاریخ ہمایوں و اکبر ص 58)۔

2- یہ لفظی ترجمہ ہے۔ غالباً ہمایوں کا مطلب یہ تھا کہ روزہ افطار کرنے کے بعد کچھ کھایا نہیں۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ ایک پہر رات گزرنے تک اس نے روزہ نہ افطار کیا ہو۔

3- نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی عبارت اس طرح ہے: ''قلیہ گوشت گاؤ وسہرادہ از شکنبہ گاؤ''

4- ہمارے پیش نظر نسخوں کی عبارتیں بہت غلط معلوم ہوتی ہیں۔ ترجمہ مولوی ذکاء اللہ مرحوم کی

''تاریخ ہندستان'' کی عبارت کے مطابق کیا گیا ہے۔اس کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے مصنف مذکور کے پیش نظر، تذکرۃ الواقعات کا کوئی صحیح نسخہ تھا۔ (تاریخ ہندوستان جلد سوم ص417) اسٹورٹ کا ترجمہ اس سے بالکل مختلف ہے۔لیکن وہ چنداں قابل اعتبار نہیں۔ ارسکن نے جوہر کا حوالہ دے کر یہ الفاظ تحریر کئے ہیں ''عصمت پناہی وہ ہیں جنہوں نے ہمارے محترم باپ کی ہڈیوں کو قبر میں دفن کیا۔ص325)۔

5- اسٹورٹ اور مولوی ذکاءاللہ نے شراب کی جگہ شربت لکھا ہے۔اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہمایوں کم از کم روزہ افطار کے بعد شراب نہ پیتا ہوگا۔دوسرے یہ کہ اُس کے پاس کھانے کو کچھ میسر نہ تھا۔ایسی صورت میں شراب کا دستیاب ہونا قرین قیاس نہیں۔اور اگر شراب سے شربت مراد لیا جائے تو پھر کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ارسکن نے بھی شربت ہی لکھا ہے۔

5- پیش نظر نسخوں میں کتابت کی غلطی ہے۔ترجمہ اسٹورٹ کی عبارت کے مطابق کیا گیا ہے۔

7- اکبرنامہ۔جلد اول ص251

8- ابوالفضل نے اس لڑائی کے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔

9- ابوالفضل کے الفاظ یہ ہیں:

''چوں بہ موضع شاخدان کہ مابین کشم وقلعہ ظفر است نزول اجلال شد مزاج صحت امتزاج آنحضرت از مرکز اعتدال فی الجملہ منحرف شد۔''

10- پیش نظر نسخوں میں وکیلا ہی ہے۔ظاہر ہے کہ نام مہتر وکیل ہوگا۔یہاں نسخوں کی کتابت کی پابندی کی گئی ہے۔

بیسویں فصل

مرزا کامران کا کابل کی طرف بھکر سے واپس آنا۔ اور آدمیوں کو تکلیف پہنچانا اور شہزادہ عالمیان کو اپنے قبضہ میں کرنا

مہتر واصل اور مہتر وکیلا کابل پہنچ کر اپنی مہم میں مصروف ہوئے۔ مرزا کامران بھکر کی طرف سے یلغار کرتا ہوا تیری (1) کے مقام پر پہنچا تھا تو اس نے علی کو پکڑ لیا اور اس کی دونوں آنکھیں نکلوا دیں۔ اور وہاں سے غزنی آ گیا اور زاہد بیگ کو پکڑ کر مار ڈالا۔ یہاں سے یلغار کر کے کابل پہنچا۔ میر فضائل بیگ (منعم خاں کا بھائی) مہتر واصل اور مہتر وکیلا کو گرفتار کر لیا۔ اور ان کو اندھا کر دیا۔ محمد علی تغائی (2) کو جو کابل کا حاکم تھا، قتل کر دیا۔ شاہزادہ محمد اکبر پھر مرزا کامران کے قبضہ میں آ گیا۔ یہ خبر بادشاہ کو پہنچی۔ انہوں نے مرزا سلیمان سے صلح کر لی۔ قلعہ ظفر مرزا سلیمان کو دیدیا۔ اور قندھار کا قلعہ جو قلعہ ظفر کے حدود میں تھا، اس سے علیحدہ کر کے مرزا ہندال کو دیا۔ اور سب لوگوں کو اطمینان دلا کر کابل کی طرف روانہ ہو گئے۔

شیر افگن ولد قوچ بیگ (3) بھاگ کر مرزا کامران کے پاس چلا گیا۔ بادشاہ نے وہاں سے کوچ کیا۔ اور تالقان کے مقام پر قیام کیا چند روز تک برفباری رہی اور تالقان ہی میں مقیم رہے۔ جب برفباری بند ہو گئی تو پھر وہاں سے سفر کر کے قندھار پہنچے مرزا ہندال نے جو وہاں موجود تھا بادشاہ کو چند دن اپنا مہمان رکھا۔ قراچا خاں نے عرض کیا کہ شیر افگن ولد قوچ بیگ کے فرار ہو جانے سے لشکر کے آدمی شکستہ خاطر ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگوں کو آپ سمجھائیے اور کچھ کو میں سمجھاتا ہوں۔ غرضیکہ لوگوں کو سمجھا بجھا کر چاریکاران کے راستہ سے ہو کر کابل کی طرف روانہ ہوئے۔ سردی کا موسم تھا اور خوب برف باری ہو رہی تھی۔ برف کی وجہ سے راستے بند ہو گئے تھے اور گزرنا

دشوار تھا۔

چنانچہ پہلے برف کو کاٹتے تھے۔ اور پھر گھوڑے اور اونٹ گزرتے تھے۔ جب چاریکاران کے مقام پر نزول فرمایا تو کامران کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ جنگ کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ وہاں سے کوچ کر کے بابا خاتوں (4) کے مقام پر آئے۔ وہاں سے مسلح ہو کر سوار ہوئے اور رورت چلاک کے مقام پر آئے اور یہاں وضو کے لئے اترے بادشاہ کے ایک ہاتھ میں سیب اور رومال تھا اور دوسرے ہاتھ سے روئے مبارک پر پانی ڈال رہے تھے کہ یکا یک آفتاب پر نظر پڑی۔ دیکھا کہ آفتاب ہالہ میں ہے دل میں خیال کیا کہ انشاءاللہ یہاں فتح ہوگی کیوں کہ ایک ہاتھ میں سیب اور رومال ہے اور دوسرے ہاتھ سے میں اپنا منہ دھو رہا ہوں۔ حکماء کا قول ہے:

چو خور بہ ہالہ نشیند دلیل جنگ عظیم
چو مہہ بہ ہالہ نشیند دلیل باران است

فرمایا نیک فال ہے۔ پھر سوار ہو کر دہ افغانان کی طرف جا رہے تھے کہ شیر افگن مرزا کامران کی طرف سے آیا۔ مرزا ہندال بادشاہ کی طرف سے آگے بڑھے۔ اور باہم جنگ ہوئی۔ مرزا ہندال کا ایک قورچی مارا گیا۔ ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے کہ بادشاہ خود جنگ کے لئے آگے بڑھے۔ قراچا خاں نے عرض کیا، خاکسار کو حکم صادر فرمائیں۔ یہ خاکسار جنگ کرے گا۔ بادشاہ نے اجازت دی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ اور خوب مقابلہ کیا۔ شیر افگن جنگ میں گھس گیا اور تین مرتبہ تلوار چلائی قراچا خاں نے تینوں مرتبہ اس کی تلوار کو اپنی تلوار پر لے لیا۔ چوتھی مرتبہ اس نے پھر تلوار چلانا چاہی۔ قضائے الٰہی سے اس کا گھوڑا گر گیا قراچا خاں اپنے گھوڑے کو اُٹھایا۔ اور شیر افگن کو اس کے گھوڑے سے علیحدہ کر کے زندہ گرفتار کر لیا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر کیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ اسے نظر بند رکھا جائے۔ قراچا خاں نے عرض کیا کہ یہ بڑا نمک حرام ہے، اس کو قتل کرنا چاہئے۔ اسی وقت شیر افگن کو قتل کر دیا۔ اور فتح حاصل ہوئی۔ مرزا ہندال نے آدمیوں کو سفارش کی۔ بادشاہ نے بھی ان کی دل جوئی فرمائی۔

قراچا خاں یہ خبر لایا کہ مرزا کامران کابل سے باہر جانا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ سیاہ سنگ کی طرف ہم کو خود رہنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اسی راستہ سے وہ باہر نکل آئے۔ اور تم بھی ہوشیار

رہو۔ کابل کے گرد ونواح میں ہوشیار رہنا چاہئے ایک شخص کو قلعہ کی طرف بھیجا کہ اس کی تحقیق کرے کہ صورت حال کیا ہے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور قلعہ سے باہر نہیں آتا ہے تو بادشاہ قراچا خاں کے قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ اس نے اپنی پگڑی ان کے قدموں پر ڈال دی۔ بادشاہ نے اس کی پگڑی کو قراچا خاں کے سر پر رکھ دیا اور بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد مرزا کامران نے قراچا خاں کے پاس پیغام بھیجا کہ ہماری خدمت میں حاضر ہو ورنہ تیرے بیٹے سردار بیگ کو قتل کر دیا جائے گا۔ اس نے آ کر تمام ماجرا بادشاہ کی خدمت میں عرض کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں بھی تمہارے لئے سردار بیگ ہوں۔ قراچا بیگ نے کہا کہ سو ہزار سردار بیگ آپ کے ایک بال پر قربان کروں گا۔

جب آفتاب طلوع ہوا۔ اور تمام دنیا میں روشنی ہوگئی، تو حکم دیا کہ قلعہ کا محاصرہ کر لیا جائے اور جا بجا مورچے تقسیم کر دیئے جائیں۔ بادشاہ نے خود کوہ عقابین (5) پر جہاں سے کابل کا قلعہ زد میں آتا تھا، نزول فرمایا۔ اور وہاں قلعہ بندی کی۔ اور ہر چار طرف جنگی توپیں نصب کیں، مرزا کامران نے کہا کہ ان کے بیٹے محمد اکبر کو سامنے رکھا جائے۔ جب یہ خبر بادشاہ کو ہوئی تو حکم دیا کہ توپیں ابھی سر نہ کی جائیں۔ تمام سپاہی اپنے اپنے مقام پر تیار اور ہوشیار رہیں اور اپنے مورچوں کی پوری پوری حفاظت رکھیں۔ (6)

حوالہ جات

1- تیری۔ اکبر نامہ (مطبوعہ کلکتہ) میں تیری ہے۔ اور مترجم کے ذاتی نسخہ میں تری ہے۔

2- ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اپنی نئی کتاب ''دی لائف اینڈ ٹائمس آف ہمایوں'' میں تغائی کو ''قفائی'' لکھا ہے جو صریحاً غلط ہے (دیکھو ص 222 نوٹ 3)

تغائی کو حمام میں غسل کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا اور اسی جگہ قتل کر دیا گیا۔ ابوالفضل کے الفاظ یہ ہیں ''علی قلی لعلی کہ یکے از قورچیان مرزا بود درون حمام درامدہ محمد علی را برھنہ از حمام آوردو مرزا او را بہ آب شمشیر غسل داد۔''

3- کاتبوں نے یہاں غلطی کی ہے۔ شیر افگن کا نام شیر افگن ولد قوچ بیگ ہے جیسا کہ ابوالفضل نے لکھا ہے (نسخہ مترجم۔ نیز تاریخ ہمایوں واکبر صفحہ 25)

4- بابا خاتوں۔ اسٹورٹ نے اما خاتوں اور ڈاکٹر بنرجی نے ماما خاتوں لکھا ہے (ترجمہ اسٹورٹ ص86۔ بنرجی جلد دوم ص165)۔

5- اکبرنامہ۔ جلد اول ص263۔ تاریخ ہمایوں واکبر۔ ص80

6- ابوالفضل نے حسب معمول اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا یہ اکبر کی ایک کرامت تھی کہ اس پر بندوق اور توپوں کی گولہ باری نے اثر نہ کیا (ص 265) نظام الدین نے صرف اتنا کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی۔ صحیح واقعہ صرف اتنا ہی تھا جو جوہر نے بیان کیا ہے۔ جوہر خود موقع پر موجود تھا۔

اکیسویں فصل

مرزا کامران کا فرار ہونا اور بادشاہ کا کابل کے قلعہ کو فتح کرنا اور اس میں داخل ہونا۔ مرزا کامران کا قلعہ ظفر کی طرف جانا اور مرزا سلیمان کے ساتھ جنگ کرنا اور شکست کھا کر از بیگون کے پاس پہنچنا

جب کابل کے محاصرہ کو تین ماہ گزر گئے تو ایک رات کو مرزا کامران قلعہ سے باہر آیا اور قلعہ ظفر کی طرف روانہ ہو گیا[1] خدا کے فضل سے (بادشاہ کو) فتح حاصل ہوئی۔ مرزا ہندال کو اُس کے تعاقب کے لئے روانہ کیا[2] جب وہ پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ کامران مرزا ایک آدمی کی پیٹھ پر سوار جا رہا ہے۔ اُس نے پکڑنا چاہا۔ مرزا کامران نے کہا کہ اگر تو مجھے وہاں لے جائے گا تو بادشاہ مجھے قتل کرا دیں گے، تجھے کیا ملے گا۔ اُس کے دل میں رحم آیا اور اُسے ایک گھوڑا دیا۔ وہ واپس چلا آیا۔ بادشاہ نے معلوم کر لیا کہ کابل کے آدمی بے بس اور مجبور ہیں۔ حکم دیا کہ لوٹ لیا جائے۔ تمام رات لوٹ مار رہی اس کے بعد منادی کر دی کہ کوئی کسی کو ایذاء نہ پہنچائے ورنہ مجرم قرار دیا جائے گا۔

مرزا کامران قلعہ ظفر میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے مرزا سلیمان سے جنگ کی اور شکست کھا کر از بیگون کی طرف بھاگا۔ وہاں سے مدد لا کر قندوز کے قلعہ کا محاصرہ کیا[3] اس قلعہ میں مرزا ہندال بھی موجود تھا۔ ایک خط مرزا کامران کی طرف لکھ کر بھیجا کہ از بیگ ہمارے اور تمہارے دونوں کے دشمن ہیں۔ میں ان کو ایک بہانہ سے لے آیا ہوں قلعہ سے باہر نکل آؤ تا کہ انہیں قتل کر دیں۔ جب یہ خط از بیگوں کے ہاتھ میں پڑا تو اُنہوں نے اسے پڑھ کر یہ یقین کر لیا کہ یہ بھائی

آپس میں ایک ہیں اور ہمیں دھوکہ سے لائے ہیں۔ از بیگ بھاگ گئے۔ مرزا کامران اب مجبور ہو گیا اور تالقان اور ظفر کے دونوں قلعے مرزا کامران کے قبضہ میں رہے۔

قراچہ قرابخت ومصاحب بیگ و پابوس بیگ [4] کے فرار ہو جانے کا واقعہ۔

ایک روز قراچہ خاں نے ایک شخص کے متعلق بادشاہ سے عرض کیا کہ اس کو دس تومان دیدیئے جائیں۔ بادشاہ نے حکم فرمایا اور قراچہ خاں نے اُسے پروانہ دے دیا۔ جب اس شخص نے خواجہ غازی کے سامنے پروانہ پیش کیا تو اُس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور بادشاہ کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ ہم لشکر کے کل سامان کا انتظام کر چکے ہیں۔ اگر کسی کو کچھ عطا فرمانے کا حکم ہو گا تو خزانہ میں اب گنجائش نہیں۔ اُس شخص نے وہ پروانہ لے جا کر قراچہ خاں کو واپس دے دیا۔ اور اُس نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا۔ بادشاہ نے توجہ نہ کی۔ اس بدمزگی کی وجہ سے اُس نے چند امراء کو بہکایا اور چاہتا تھا کہ مرزا کامران کی طرف چلے جائیں یہ خبر بادشاہ کو پہنچی۔ فرمایا کہ شاہزادہ محمد اکبر جائیں اور قراچہ خاں و دیگر امراء کو تسلی دے کر لے آئیں۔ خواجہ عنبر نے عرض کیا کہ شاہزادہ کا جانا مناسب نہیں ایسا نہ ہو کہ مرزا عسکری کے بدلہ میں لے جائیں۔ بادشاہ نے قراچہ خاں سے یہ کہلا بھیجا کہ نصیحت مانو اور ہم سے جدا نہ ہو۔ کیوں کہ تم ہمارے خیر خواہ ہو۔ اُس نے عرض کیا کہ خواجہ غازی دیوان کو میرے حوالے کر دیجئے اس پر بادشاہ نے فرمایا یہ ہمارے لئے مناسب نہیں لیکن تم ہمارے وزیر اور وکیل ہو، کسی دن وہ تمہارے ہاتھ آ ہی جائے گا۔ مگر اس نصیحت سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اور قراچا خاں اور مصاحب بیگ اور پابوس بیگ اور مغلوں کی ایک جماعت مسلح ہو کر چلی گئی۔ یہ خبر بادشاہ کو پہنچا دی گئی کہ امراء نے نمک حرامی کی ہے۔ درہ پائے منارہ تک پہنچے ہوں گے، بادشاہ یہ خبر سن کر فوراً سوار ہو گئے اور اشتر کرام کے مقام پر یلغار کرتے ہوئے مع لشکر کے پہنچے۔ وہاں جنگ ہوئی۔ امراء نے جو فرار ہو کر گئے تھے شکست کھائی اور مرزا کامران سے مل گئے۔ بادشاہ نے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ قراچا قرابخت ومصاحب بیگ منافق ہیں اور پابوس بیگ دیوس نمک حراموں کی طرح فرار ہو گئے۔ [5] بادشاہ کابل میں تشریف لائے اور محمد سلطان مرزا کو بلا کر فرمایا کہ اس وادی میں تم نے اکثر قزاقی کی ہے اور ہر راستہ سے واقف ہو۔ مختصراً بتاؤ کہ کیا کرنا چاہئے۔

مرزا نے عرض کیا کہ اگر ہندوکش کے پہاڑ سے پہلے آپ گزر گئے تو فتح آپ کی ہے اور اگر پہلے وہ گزر گیا تو فتح اُس کی ہے۔ وہ امراء جو اُس کے پاس گئے ہیں بہت مغرور ہیں۔ بادشاہ نے فرمایا کہ اگر وہ مغرور ہے تو ہم اپنی بیچارگی اور عجز خدائے تعالیٰ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ فتح انشاءاللہ ہماری ہی ہوگی۔ اور ہم ہی پہلے اس پہاڑ سے گزریں گے۔ دعائے خیر کی۔

سہ شنبہ کی رات کو سوار ہوئے اور ریواس جلاک (6) کے مقام پر فروکش ہوئے۔ حاجی محمد قشقہ غزنی میں موجود تھا۔ ایک فرمان اُس کے اور اُس کے امراء کے نام بھیجا کہ تم فوراً خدمت میں حاضر ہو۔ اکثر لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ نہیں آئے گا۔ لیکن فرمان کے پہنچتے ہی حاضر ہو گیا۔

حوالہ جات

1- ابوالفضل نے کامران کے فرار ہونے کی تاریخ 7 ربیع الاول 854ھ لکھی ہے۔ بایزید لکھتا ہے کہ مرزا ہندال نے رحم کھا کر دروازہ کھول دیا تھا کہ کامران بھاگ سکے۔ ص84

2- اکبرنامہ میں یہ واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ ص268

3- قندوز۔ بعض نسخوں میں قندوز کے بجائے قندھار ہے۔

4- اکبرنامہ اور تاریخ ہمایوں و اکبر کے مطبوعہ نسخوں میں بابوس بیگ ہے۔ ارسکن اور ڈاکٹر بنرجی نے باپوس لکھا ہے۔

5- ہمایوں نے غصہ میں ان تینوں سرداروں کے ناموں کے ساتھ یہ الفاظ استعمال کئے ہیں: بایزید نے قراچہ کو کم عقل لکھا ہے اور دلیل کے طور پر کہنا کہ اُس کا قد بھی لمبا تھا اور داڑھی بھی بڑی تھی۔ ص85۔

6- فارسی نسخوں میں ریواس جلاک کی شکل کاتبوں نے بگاڑ دی ہے۔ اس مقام کے لئے دیکھو تاریخ ہمایوں و اکبر۔ ص85۔ ارسکن نے خواجہ ریواج لکھا ہے۔ (جلد دوم۔ ص351)

بائیسویں فصل

بادشاہ کے شانہ پر مرغ کا آ کر بیٹھنا اور اس سے فال نیک لینا۔
قلعہء تالقان کا محاصرہ کرنا جس میں مرزا کامران محصور تھا

واقعہ یہ ہے کہ ایک سفید مرغ خوش رنگ آفتابہ خانہ میں ہمیشہ رہتا تھا۔ بادشاہ خود اس کو کشمش کھلایا کرتے تھے اور چوں کہ آخری حصہء شب میں وہ بانگ دیا کرتا تھا اس لئے اس کی نگہداشت بہت کی جاتی تھی۔ (اس کی بانگ سے) ملازم بیدار ہو کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ایک دن بادشاہ آفتابہ خانہ میں کھڑے تھے کہ دل میں یہ خیال گزرا کہ اگر سلطنت ہمارے لئے ہے تو یہ مرغ ہمارے شانہ پر آ کر بیٹھ جائے گا اور بانگ دے گا۔ اس خیال میں تھے کہ مرغ بادشاہ کے شانہ پر آ کر بیٹھ گیا اور اذان دی۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے اور اُس کے پاؤں میں چاندی کا ایک چھلہ ڈالنے کے لئے اُسے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ وہاں سے کوچ کر کے قراباغ(1) میں نزول فرمایا۔ وہاں سے چار کرام کے مقام پر، پھر گل بہار، پھر پنجشیر کے مقام پر جو ایک سرسبز اور نعمتوں سے مالا مال وادی میں واقع تھا قیام کیا۔ وہاں کے باشندے سیاہ پوش کافروں سے قرابت رکھتے ہیں۔ اور یہ مقام کابل کے ماتحت ہے۔ وہاں سے کوچ کر کے ہندوکش کی پہاڑیوں میں قیام کیا اور علی الصباح درۂ ہندوکش سے گزر کر دریائے بنگی کے کنارے آ کر ٹھہرے۔ یہاں ایک عرضداشت اور کچھ خرپزے ہندال مرزا کی طرف سے آئے۔ ظہر کے وقت کوچ کر کے آگے بڑھے ایک پہر رات گزری تھی کہ مرزا ہندال کے آنے کی خبر پہنچی۔ مرزا گھوڑے سے اُترنا چاہتا تھا بادشاہ نے اُسے اپنے سر کی قسم دے کر کہا کہ پیادہ نہ چلو۔ الغرض وہ ساتھ ہو گیا۔ بادشاہ نے تسلی و تشفی فرمائی اور مہربانی سے پیش آئے اور یہ گفتگو شروع کی کہ کامران

اور منافقوں کے متعلق کچھ خبر سناؤ۔ اُس نے عرض کیا کہ قلعہ ءظفر میں ہیں۔ اب دریائے حلقہ کے کنارے پہنچ گئے تھے۔

مرزا کامران سے جنگ

ایک پہر رات باقی تھی کہ مرزا کامران قلعہ ءظفر سے پچیس کوس راہ چل کر یلغار کرتا ہوا آیا۔ ایک ساعت رات باقی تھی کہ اُس نے لشکر گاہ کے مقابلہ میں اپنی فوج تیار کر کے کھڑی کی۔ جب آفتاب کی روشنی سے تمام دنیا روشن ہوگئی تو دیکھا کہ مرزا کامران اپنی فوج کو ترتیب دیئے تیار کھڑا ہے۔ بادشاہ نے اپنے لشکر سے فرمایا کہ تمام فوجیں مختلف مقامات پر تیار ہو کر مقابلہ میں آئیں۔

حاجی محمد خاں کوکی بادشاہ سے بائیں ہاتھ پر تھا۔ چوں کہ کامران مرزا نے بڑی جمعیت اور جھنڈے دیکھے اُس کو خیال ہوا کہ بادشاہ ہیں۔ اُس نے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ حاجی محمد خاں کی جماعت اس حملہ کی تاب نہ لاسکی۔ جو کچھ سامان واسباب تھا وہ مرزا کے سپاہیوں کے ہاتھ لگا۔ اُنہوں نے اسے خوب لوٹا اور قلعہ ءتالقان میں گھس گئے۔ افواہاً یہی بھی بتایا گیا کہ ایک شخص چاکر نامی حاجی محمد کوکہ کے خواص میں سے تھا۔ مرزا کامران نے اپنے ہاتھ سے اُس کے منہ پر ایسی تلوار ماری کہ گدی تک پہنچی۔ بادشاہ نے کتاب خانہ کے متعلق دریافت کیا لوگوں نے عرض کیا وہ محفوظ ہے۔ اس کے بعد حکم فرمایا کہ بارہ جھنڈے کھول دیئے جائیں اور جنگ کا نقارہ بجایا جائے جب مرزا کامران نے نقارہ کی آواز سنی، اور جھنڈوں کو دیکھا تو اُس نے سمجھ لیا کہ بادشاہ ہیں۔ کہا کہ ہم نے شکست کھائی۔ قلعہ کے اندر آ گیا۔ مرزا کے آدمیوں میں سے پہلا شخص جس کو سپاہی گرفتار کر کے لائے شیخم خواجہ خدائی تھا۔ (2) اس کو حکم دیا گیا کہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ اس کے بیالیس زخم لگے لیکن پھر بھی نہیں مرا، اور اُٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔ (3) بادشاہ فتح پا کر قلعہ ءتالقان کی طرف آگے بڑھے۔ مرزا کے آدمیوں میں سے جس قدر بھی قید ہو کر آئے تھے اُن کے قتل کئے جانے کا حکم صادر فرمایا۔ بہت سے لوگوں کو تہ تیغ کر دیا گیا یہاں تک کہ بادشاہ کے دل میں رحم آیا۔ ایک باغ میں قیام کیا اور ایک خط مرزا کامران کو لکھ کر بھیجا کہ اے برادر بے مہر! یہ کیا حرکت ہے جو تو کرتا ہے، جو خوں اُس وقت ہوگا تیری گردن پر رہے گا۔ اور حشر کے دن تجھ ہی سے اس کی پرسش کی جائے گی۔ تو آ، تا کہ آپس میں صلح کر لیں اور خلق اللہ کو ایذا نہ ہو۔ نصیب رمال کو طلب کیا اور

فرمایا کہ یہ رقعہ مرزا کامران کے پاس لے جاؤ۔ نصیب جب وہ رقعہ مرزا کامران کے پاس لے گیا، تو اُس کو خبر کی گئی اُس نے نصیب کو طلب کیا۔ اُس نے وہ رقعہ پیش کیا اس کو پڑھ کر مرزا کامران خاموش ہوا۔ نصیب نے جواب کے لئے عرض کیا، میرزا کامران نے یہ بیت پڑھا:

عروس ملک کسے در کنار گیں چست
کہ بوسہ برلب شمشیر آبدار زند

نصیب نے آ کر بادشاہ سے عرض کیا۔ اُنہوں نے حکم دیا کہ جگہ جگہ مورچے قائم کر دیئے جائیں اور اس کے بعد خاکسار جوہر کو حکم دیا کہ ان کے واپس آنے تک مورچے قائم ہو جائیں۔ آدھی رات سے لے کر صبح تک بادشاہ مورچے تقسیم کرتے رہے اور بے دل خاں عرف سمبھل مرزا کو حکم دیا کہ ایک سرکوب توپ کے چلانے کے لئے درست کریں۔ مورچوں کی تقسیم کے بعد توپ اور نیزے چلائے گئے۔ جب دو ماہ گزر گئے تو مرزا کامران نے عاجز ہو کر اعلان کیا کہ اپنے صدر کو بھیجیں تا کہ بادشاہ کا خطبہ پڑھے جمعہ کا دن تھا کہ حکم ملنے پر مولانا عبدالباقی صدر گئے تا کہ وہاں خطبہ پڑھیں۔

شنبہ کی رات کو قراچہ خاں، مصاحب بیگ، اور پابوس بیگ جو باغی ہو کر چلے گئے تھے اپنے ترکش اور تلواریں گردن میں باندھ کر بادشاہ کی خدمت میں قدم بوسی سے مشرف ہوئے۔ بادشاہ نے ان کا قصور معاف کر دیا۔ شنبہ کے دن کامران قلعہ سے باہر آیا اور دریائے بنگی کے کنارے قیام پذیر ہوا۔ جب مرزا کامران قلعہ سے باہر آیا تھا تو مرزا ابراہیم حسین پسر مرزا سلیمان یدخشی نے مرزا کامران کے آدمیوں کے ساتھ گستاخی اور دست درازی کی تھی۔ اس سبب سے مرزا کامران کے دل کو صدمہ پہنچا تھا۔ یہ خبر بادشاہ کو پہنچی۔ طلب کر کے بلوایا۔ اس کے بعد گھوڑا اور خلعت اور قیمتی کپڑا اور کلاہ قند اور نو پارچے پنبہ دار خواجہ جلال الدین محمود میر بیونات کے ساتھ کر دیئے گئے اور ایک فرمان لکھا کہ مرزا ابراہیم سے غلطی ہو گئی ہے، کم عمر ہے سمجھا نہیں، اس کو معاف کر دیں اور اس پر نظر کرم رکھیں۔ جلال الدین محمود میر بیوتات کو مرزا کامران کے پاس عذر خواہی کے لئے ہم نے بھیجا ہے، اور قندھار ہم نے تم کو دیا۔ وہ مرزا کامران کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور گھوڑا، خلعت اور جس قدر تحائف لایا تھا پیش کئے، مرزا کامران نے ادب کے ساتھ خلعت پہنی

فرمان پڑھا اور کہا کہ میں بادشاہ کی خدمت میں جاتا ہوں، جو حکم ہوگا مجھے منظور ہوگا۔ جلال الدین نے قلم دوات طلب کیا اور ایک عرضداشت لکھی کہ مرزا کامران چاہتا ہے کہ حضور کی خدمت میں حاضر ہو۔ جو حکم ہو تعمیل کی جائے۔

حوالہ جات

1- قراباغ۔ اس مقام پر ہمایوں نے دس بارہ روز قیام کیا۔ مرزا سلیمان کا لڑکا مرزا ابراہیم اُس سے اسی جگہ آ کر ملا۔

2- شیخم خواجہ خدائی یہ نام کاتب نے غلط لکھا ہے۔ خواجہ خضری ہونا چاہئے۔ (اکبر نامہ ص277) طبقات اکبری ص215۔ بایزید ص90۔

3- ابوالفضل کے الفاظ یہ ہیں: ''چنداں بمشت ولکد زدند کہ برنظارگیاں یقیں شد کہ جان تیرہ اش را تعلق بہ بدن نماند۔'' فارسی کا نسخہ جو پیش نظر ہے اُس کی عبارت یہ ہے: ''اورا فرمودند کہ سہ علم پارہ پارہ کنند۔'' اس میں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، غالباً عبارت یوں ہوگی: ''اورا فرمودند کہ سر قلم و پارہ پارہ کنند۔''

تیئسویں فصل

قلعہ تالیقان پر قبضہ کرنا، میرزا کامران کا قدم بوسی سے مشرف ہونا، میرزا عسکری کا رہا ہونا اور بادشاہ کا بلخ کی جانب روانہ ہونا

جب وہ قاصد آیا اور عریضہ پیش کیا تو فرمایا کہ اچھا ہے آئے اور اپنے بھائی کو دیکھے۔ حضرت بادشاہ بہت مسرور تھے۔ ایک فرمان لکھ کر بھیجا جو قاصد نے وہاں لے جا کر اپنے آقا کی خدمت میں پیش کیا اس کے بعد میرزا کامران درگاہ شاہی کی طرف روانہ ہوا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ میرزا عسکری کے پاؤں سے بیڑیاں کھول دی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس کے بعد خبر آئی کہ میرزا کامران آ رہا ہے۔ حکم دیا کہ تمام میرزا اور امراء استقبال کریں، شامیانے کھڑے کئے جائیں اور خوشی کے نقارے بجائے جائیں۔ اور فرمایا کہ جب میرزا کامران آئے تو میرزا اہندل کی قیام گاہ میں مقیم ہوں اور میرزا اہندال کمبل پر بیٹھیں اور جب میرزا کامران جھکنے لگے (یعنی بیٹھنے کا ارادہ کرے) تو اس سے کہہ دیا جائے کہ اس جگہ بیٹھنے کا حکم نہیں ہے۔ بادشاہ نے تم کو اپنے پاس طلب کیا ہے۔ کامران ابھی بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ بادشاہ کے حکم کے بموجب روانہ ہو گیا۔ شاہی قالین کے قریب پہنچا تو منعم بیگ خاں کی کمر سے رومال کا سرا پکڑ کے کھینچا اور اپنی گردن میں ڈالا۔ بادشاہ نے فرمایا ''رومال کی ضرورت نہیں، گردن سے نکال لو۔'' اس نے سر جھکا کر بادشاہ کی مزاج پرسی کی۔ بادشاہ اس سے بغل گیر ہوئے اور دائیں جانب جگہ دی۔ وہ آداب بجالا کر دائیں جانب بیٹھ گیا اور بہت معذرت کی۔ اس کے بعد بادشاہ نے فرمایا کہ وہ رسمی ملاقات تھی، آؤ اب بھائی بھائی کی طرح ملیں۔ دونوں بھائی کھڑے ہو کر گلے ملے اور روئے۔ تمام حاضرین خوش ہوئے۔ وہ عجیب وقت تھا۔ کسی کے دل میں کوفت نہ تھی۔ ایک پیالہ میں شربت لایا گیا۔ آدھا

بادشاہ نے خودنوش فرمایا، اور آدھا کامران کو دیا۔ جو واقعات آپس میں ہوئے تھے، سب ظاہر کر دیئے۔ چاروں بھائی ایک ہی فرش پر بیٹھے اور ساتھ کھانا کھایا[1] دعائے خیر کی اور تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ دو روز تک وہ مجلس اسی مقام پر آراستہ رہی۔ نہایت خوش وخرم رہے۔ تیسرے روز کے بعد تالیقان کے قلعے کے پاس سے کوچ کیا اور چشمہء اشک مشک[2] پر قیام فرمایا اور آپس میں قول وقرار کر کے ملک کو تقسیم کر لیا۔ سات[3] روز تک وہاں قیام کیا اور میرزاؤں اور امراء میں ملک کی تقسیم فرما کر میرزا کامران اور عسکری کو کولاب کی ولایت دی۔ چاکر بیگ کو میرزا کامران کا امیر الامراء مقرر فرمایا[4] قلعہ ظفر وتالقان اور چند پرگنوں کا علاقہ میرزا سلیمان کو دیا۔ قندوز[5] کی ولایت میرزا ہندال کو دی اور مختلف مقامات تقسیم کر کے ان لوگوں کو رخصت فرمایا اور خود بدولت کابل تشریف لائے۔ وہاں سے راستے میں قلعہ بریاں پڑا۔ اسے فتح کیا اور اس جگہ کافران سیاہ پوش کو مارا اور یہ قلعہ ملک پنجرہ[6] کے حوالے کیا اور خود کابل پہنچے۔ اس کے بعد خبر آئی کہ مرزا کامران اور چاکر بیگ میں کچھ نزاع ہو گیا۔ میرزا کامران نے ولایت کولاب سے باہر آ کر چاکر بیگ کو مارا، بادشاہ نے میرزا شاہ سلطان کو بھیجا اور فرمان لکھا کہ چاکر بیگ نے اچھا نہ کیا۔ تم اس جگہ آ جاؤ، ہم تم کو دوسری ولایت دیں گے۔ میرزا شاہ سلطان نے جا کر فرمان پیش کیا۔ میرزا کامران نہ آیا اور اس نے کہا کہ میں تارک الدنیا درویش ہو گیا ہوں۔ مجھے سلطنت سے کوئی غرض نہیں۔ زبان سے یہ کہتا تھا اور دل میں مکر وحیلہ رکھتا تھا۔ اب بادشاہ بلخ کی جانب اس خیال سے روانہ ہوئے کہ جب بلخ ہاتھ آ جائے گا تو میرزا کامران میرے پاس آئے گا، اور مجھ سے ملے گا، میں بلخ اس کو دے دوں گا۔ اس وقت بادشاہ کے ساتھ ہندال میرزا، سلیمان شاہ، میرزا حاجی محمد کوکہ، تردی بیگ، منعم بیگ اور چند اور امراء تھے۔ بادشاہ نے بلخ کی طرف کوچ فرمایا وہ سمجھتے تھے کہ میرزا کامران سے صلح ہو گئی ہے۔ وہ آ جائے گا۔ کوچ کرتے ہوئے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ مقام عیبک[7] پر پہنچے مگر میرزا کامران نہیں آیا۔ پیر محمد ازبک کے امراء میں سے ایک قلعے کے اندر تھا[8] بادشاہ نے اس قلعے کا محاصرہ کیا اور اُسے فتح کر لیا۔ تمام امراء نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ میرزا کے اہل وعیال اور چند امراء کو کابل بھیج دیا۔ میرا تالیق بیگ کو جو پیر محمد خاں کا امیر الامراء تھا اپنے ہمراہ لے کر بلخ کی طرف روانہ ہوئے۔ اتالیق بیگ نے قراچا خان سے کہا کہ بادشاہ کا بلخ کی طرف روانہ ہونا ان کے شایان شان نہیں ہے، تم منع کرو۔ قراچا خان نے کہا

کہ یہ ہمارے بادشاہوں کے آئین کے خلاف ہے۔ اتالیق بیگ نے کہا کہ بادشاہ مسلمان ہے۔ اگر ہم جیسے لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے تو خدا جانے کیا حکم فرماتے (9) انہوں نے بعض کو کابل بھیج دیا ہے اور بعض کو اپنی ملازمت میں۔ جان کی امان ہر ایک کو عنایت کی ہے۔ اس سبب سے میں صلاح دیتا ہوں۔ ازبک ایسی قوم ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر بادشاہ اُس جگہ سے دور ہو جائیں تو مناسب ہے۔ قراچا خان نے یہ بات بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دی مگر وہ منزل کرتے ہوئے بلخ جا پہنچے اور جنگ ہوئی۔ ازبک بھاگ کر قلعہ بلخ تک آ گئے۔ اور میرزا ھندال نے ان کا تعاقب تختہ پل تک کیا۔ وہاں سے بادشاہ کی خدمت میں یہ کہلا بھیجا کہ اگر حضور والا تختہ پل میں آ جائیں تو یہ غلام بلخ کے شہر میں داخل ہو جائے۔ چونکہ صبح جنگ میں شریک ہونا تھا اس لئے بادشاہ نہیں گئے۔ اس کے بعد یہ خبر ملی کہ میرزا کامران کابل پہنچ گیا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی تمام لشکر میں بے چینی پھیل گئی۔ اور یہ طے پایا کہ درگز کے راستے سے کابل روانہ ہوں۔ رات کو کوچ کر کے، شکستہ حال ہو کر کابل کے قریب پہنچے۔ بادشاہ نے منارے کے قریب قیام کیا۔ لشکر کی خرابی کے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ہمارے آدمیوں سے دیانت داری جاتی رہی اور جو کچھ بھی ہو رہا ہے، شومیٔ نفس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ (10)

بادشاہ کا سلطان محمود اور یعقوب لیث کی حکایت بیان کرنا

(اس موقع پر) بادشاہ نے فرمایا کہ سلطان محمود کے تحت بارہ ہزار آہن پوش سوار تھے۔ یعقوب لیث کے پاس ساٹھ ہزار آہن پوش تھے۔ جب سلطان محمود نے یعقوب لیث پر لشکر کشی کی تو راستے میں چلتے چلتے سلطان ایک باغ میں پہنچا جو یعقوب لیث کی حکومت میں تھا۔ اس نے دیکھا کہ باغ کے پھل پک کر زمین پر گر چکے تھے اور ایسے محفوظ تھے گویا آدمی کا اس جگہ گزر ہی نہیں ہوا تھا۔ سلطان محمود نے اپنے وزیر سے دریافت کیا کہ ہمارا لشکر تین روز سے بھوکا تھا اور اس کو کھانا نہیں ملا تھا۔ اب اس جگہ پہنچا کہ میوہ کھائے۔ وزیر نے عرض کیا کہ لشکر اس راستے سے گزرا ہے لیکن یہ میوہ ان پر حرام ہے۔ اُن لوگوں نے نہیں کھایا اس لئے کہ یہ ملک فتح نہیں ہوا ہے جب فتح ہو جائے گا تو یہ حلال ہوگا۔ یہ بات سن کر سلطان محمود سجدے میں گر گیا کہ الحمدللہ ہمارا لشکر دیانت دار اور امین ہے۔ خدائے تعالیٰ جل جلالہ سے قوی امید ہے کہ فتح ہوگی۔ جب دونوں طرف سے

لشکر لڑائی میں مقابلے پر آئے تو یعقوب لیث گھوڑے پر سوار تھا۔ ناگہاں ایک گھوڑی لشکر سے فرار ہو کر یعقوب لیث کے گھوڑے کے سامنے سے گزری۔ یعقوب لیث کا گھوڑا اس مادہ کے پیچھے ہو لیا۔ ہر چند یعقوب لیث لگام کھینچتا رہا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ گھوڑی سلطان محمود کے لشکر میں آئی اور گھوڑا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ سلطان محمود کے سپاہیوں نے ہر طرف سے گھیر کر بہت جلد یعقوب لیث کو مار ڈالا۔ جب اس آہن پوش لشکر نے دیکھا کہ اب بے سردار کے رہ گئے ہیں تو وہ ساٹھ ہزار سوار سلطان محمود کی خدمت میں آئے انہیں سلام کیا اور فتح کی مبارک باد دی۔ اس کے بعد سلطان محمود یعقوب لیث کے پڑاؤ پر آیا جو سامان اور حرم وغیرہ تھیں، ان میں سے بعض پر خود قبضہ کیا۔ مگر اس موقع پر خزانہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ سلطان محمود کا خیال تھا کہ جو کچھ خزانہ ہاتھ لگے گا وہ لشکر میں تقسیم کر دیا جائے گا لیکن خزانہ ذرا ہاتھ نہ لگا۔ (یعقوب کی) ایک بیوی سلطان محمود کی نظر سے گزری۔ سلطان نے اسے اپنے حرم میں جگہ دی۔ اس عورت کے بازو بند پر ایک قیمتی لعل تھا۔ اس نے پانی میں اترتے وقت لعل کو الگ رکھ دیا۔ ایک گدھ ادھر گزر رہا تھا چنگل مار کر اسے لے اُڑا۔ یہ خبر سلطان محمود کو ملی۔ چند سوار اس کے پیچھے دوڑائے۔ گھوڑے سرپٹ جا رہے تھے کہ سواروں نے لعل کو گدھ کے چنگل سے نکلتے دیکھا جو ایک پرانی نالی میں گر پڑا۔ سوار اس نالی کے کنارے پہنچے۔ دیکھا کہ وہ لعل نالی کے اندر ایک صندوق پر پڑا ہوا ہے۔ سلطان محمود کو خبر کی۔ نالی کے اندر جو کچھ تھا باہر نکلوایا اور ان بارہ ہزار سواروں میں جو سلطان کے ہمراہ تھے تقسیم کر دیا۔

بادشاہ نے یہ حکایت اپنے آدمیوں کو سنائی کہ نیک نیتی کا یہ پھل ملتا ہے۔ چونکہ بادشاہ کی نیت اچھی تھی اس کو فتح بھی حاصل ہوئی اور خزانہ بھی ملا۔ اور ہمارے آدمیوں کی نیت اس نوع کی ہے۔ خیر جو کچھ ہوا، ہوا۔ (11)

حوالہ جات

1- ہم نمک شدند۔

2- چشمہء اشک مشک کا صحیح نام جیسا کہ ابوالفضل وغیرہ نے لکھا ہے، شکمش اور چشمے کا نام

بند کشا ہے اس مقام پر ہمایوں نے اپنے آنے کی تاریخ کندہ کی کیونکہ اسی مقام پر بابر کے چھوٹے بھائی جہانگیر مرزا نے اس کے سامنے اطاعت کی تھی اور بابر نے اس کو معاف کرنے کے بعد واقعہ کی یادگار کے طور پر تاریخ کندہ کی تھی (اکبر نامہ۔ 282۔ تاریخ ہمایوں واکبر 102)۔

3- بایزید وغیرہ نے دوروز لکھا ہے (اکبر نامہ ص 282)۔

4- اصل نسخے کی عبارت کاتب نے مسخ کر دی ہے۔ اسٹورٹ کہتا ہے کہ چاکر بیگ کی پنشن مقرر کی۔ ابوالفضل کے الفاظ یہ ہیں۔ چاکر خاں راامیر الامرائے میرزا کامران مقرر ساختہ بہر ہی اونا مزد فرمودند (اکبر نامہ ص 282)۔

5- قندوز۔ اصل نسخے میں قندھار ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ (اکبر نامہ ص 283، ارسکن ج 2 ص 360)۔

6- ملک پنجرہ۔ اصل نسخے میں غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ابوالفضل اور بایزید نے اس کا نام، بیگ میرک، لکھا ہے (اکبر نامہ ص 83، تاریخ ہمایوں واکبر ص 105) اسٹورٹ کے ترجمے میں ملک علی، ہے (ص 93)۔

7- عیک۔ اکبر نامہ، تاریخ ہمایوں واکبر، طبقات اکبری وغیرہ کے مطبوعہ نسخوں میں ایک ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یہ قلعہ بلخ کے علاقے میں شامل تھا (اکبر نامہ ص 286 طبقات اکبری 216)۔

8- فارسی نسخے کی عبارت یہ ہے ''واز امرایاں پیر محمد خاں اوزبک درون قلعہ بود'' پیر محمد خاں بلخ کا حاکم تھا اور اس نے خواجہ اتالیق کو اس قلعے کی حفاظت کے لئے بھیجا تھا۔ (اکبر نامہ ص 287)۔

9- ابوالفضل اور بایزید نے اس واقعے کو مختلف طریقے سے بیان کیا ہے۔ بایزید کے قول کے مطابق اتالیق بیگ نے ہمایوں کے سامنے دو تجویزیں پیش کی تھیں۔ اول یہ کہ اگر بلخ فتح کرنے کی خواہش ہے تو اسے اور اس کے تمام ساتھیوں کو قتل کرا دیں۔ ہمایوں کو یہ رائے پسند نہ آئی۔ اتالیق بیگ نے دوسری تجویز نہ پیش کی کہ حاکم بلخ سے اس شرط پر صلح کر لی جائے کہ وہ اپنا کچھ علاقہ بادشاہ کو دے دے اور سمرقند و بخارا میں بادشاہ کے نام کا خطبہ

پڑھا جائے اور ایک فوج کا دستہ ہندوستان پر حملہ کرتے وقت پیش کرے۔

10- بلخ پر حملے اور وہاں سے واپسی کے حالات بایزید اور ابوالفضل نے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمایوں کی دلی خواہش تھی کہ بلخ پر قبضہ ہو جائے اور اس کو اس خواہش کی تکمیل کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا لیکن کامران کے نہ پہنچنے سے امراء اور سرداروں کو خوف ہوا کہ وہ کابل پر قبضہ کر لے گا اور ان کے اہل وعیال کامران کے ہاتھ آ جائیں گے۔ اس قسم کے خیالات نے ان کو اس قدر مضطرب کر دیا کہ انہوں نے ہمایوں کو واپس ہونے پر مجبور کیا۔ ابوالفضل کے نزدیک اس تمام ناکامی کی ذمہ داری ان امراء پر ہے جنہوں نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا تھا اور جن کو وہ باغی تصور کرتا ہے ڈاکٹر بنرجی اپنے ایک نوٹ میں (ہمایوں بادشاہ جلد دوم ص 187) لکھتے ہیں کہ گلبدن بیگم اور جوہر نے یہ غلط بیانی کی ہے کہ ہمایوں خود بلخ تک پہنچ گیا تھا۔ ہمارے خیال میں جوہر نے زیادہ غلطی نہیں کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی لفظی گرفت کی ہے اس لئے کہ بایزید صاف کہتا ہے کہ وہ (ہمایوں) ان نہروں تک پہنچ گئے تھے جو بلخ سے نیم کروہ یعنی تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھیں (تاریخ ہمایوں واکبر ص 113)

11- یعقوب اور محمود ہم عصر نہیں تھے۔ یعقوب نے سنہ 876ء میں وفات پائی اور سلطان محمود دسویں صدی کے آخر میں تخت پر بیٹھا ہے۔ ہمایوں نے سہواً کسی اور بادشاہ کا قصہ سلطان محمود کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

چوبیسویں فصل

قبچاق کی لڑائی اور بادشاہ کا تلوار سے زخمی ہونا

بادشاہ نے سلطان محمود کی حکایت ختم کی اس کے بعد وہ کابل پہنچ گئے۔ تین ماہ گزرے تھے کہ خبر ملی میرزا کامران پریشان پھر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ کابل کی سرحد میں سے ہو کر گزرے۔ بادشاہ کابل سے کوچ کر کے قراباغ میں قیام گزیں ہوئے۔ وہاں سے چار یکاران پہنچے۔ اور اس جگہ سے آب باراں تک آئے۔ وہاں سے کوچ فرما کر درہ قبچاق کی طرف روانہ ہوئے جس کے پاس ایک نہر تھی۔ بادشاہ نے اسی نہر میں اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ فوج میں سے ایک شخص بھی ساتھ نہ ہوا۔ تمام سپاہی نہر کے کنارے چل رہے تھے۔ بادشاہ نے فرمایا ''اے سرکشو بادشاہ اسماعیل صفوی نے اپنا ایک رومال پہاڑ کے اوپر سے پھینک دیا تھا اور رومال کے پیچھے بارہ ہزار سپاہیوں نے اپنے آپ کو نیچے گرا دیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور تمہاری ساری فوج میں سے ایک سپاہی بھی میرے ساتھ نہ آیا حالانکہ میں تمہارا بادشاہ ہوں۔ میں تنہا اس پانی سے گزرا اور کوئی شخص بھی میرے پیچھے نہر میں نہ آیا۔ ایسی فوج سے کیا ترقی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد قراچا خاں سے دریافت کیا کہ کیا کرنا چاہئے۔ اس نے عرض کیا کہ یہ چند درے ہیں ان کو قبضے میں کر لینا چاہئے اگر میرزا کامران کسی مقام پر گرفتار ہو گیا تو یہ سب فتنہ و فساد دور ہو جائے گا۔ بادشاہ نے حاجی محمد کوکہ اور اس کی مدد کے لئے الہ قلی بہادر، الہ قلی اندرابی [1] مصاحب بیگ اور چند دیگر افراد کو جو تلوار چلانے کے فن میں یکتا اور مشہور تھے قراچا خاں کے کہنے پر درہ کوتل [2] سرتوں پر متعین کیا اور خود بدولت درۂ قبچاق کی طرف روانہ ہوئے۔ درۂ قبچاق سے ایک کوس کے فاصلے پر جا کر قیام فرمایا۔ یہاں خبر آئی کہ میرزا کامران درہ قبچاق میں ظاہر ہوا ہے۔ بادشاہ درہ قبچاق کی جانب

روانہ ہوئے۔ میرزا کامران نے آ کر مقابلہ کیا۔ ظہر کا وقت تھا کہ سوار ہوئے اور دونوں نمازوں کے درمیان جنگ شروع ہوگئی۔ پیر محمد آختہ جس کو بادشاہ از روئے عنایت پیرک کہتے تھے اور جس کا ارادہ بادشاہ کے سامنے اپنی جان دے دینے کا تھا اس جنگ میں سب سے پہلے شہید ہوا اور دوست محمد جو میرزا قلی چوبی کا بیٹا تھا مارا گیا۔ میرزا قلی بھی زخمی ہوا۔ محمد امین کا گھوڑا تلوار کا زخم کھا کر گرا۔ بادشاہ نے اپنا کوتل گھوڑا اسے عنایت کیا اور فرمایا کہ تیرا باپ میرزا کامران کی ملازمت میں ہے تو بھی وہیں چلا جا۔ اس نے عرض کیا کہ مجھے باپ سے کوئی سروکار نہیں۔ میں حضور والا کی ملازمت سے علیحدہ نہ ہوں گا۔ اس عرصے میں ایک ملعون (3) نے آ کر بادشاہ کے تلوار ماری۔ بادشاہ کے سر پر زخم لگا۔ وہ دوبارہ تلوار کا وار کرنا چاہتا تھا کہ بادشاہ نے اس کو قہر کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا ''حقیر قلقچی''(4) اس کے سنتے ہی اس مقہور کے ہاتھ پاؤں سست پڑ گئے۔ وہ اسی پریشانی اور مصیبت میں تھا کہ فرہاد خاں عرف سکھائی نے تیزی سے بڑھ کر اسے پکڑ لیا۔ جانبیں تلاش میں مصروف تھے کہ ناگہاں بادشاہ میدان جنگ سے باہر آئے اور محمد امین اور عبدالوہاب کو حکم دیا کہ فوج کے عقب میں چلیں۔ زخم کے سبب سے بادشاہ پر ضعف غالب تھا۔ بالائی جبہ اتار دیا اور سیدل خاں عرف سنبل کے حوالے کیا۔ چونکہ شکست کھا کر بھاگ رہے تھے اس نے جبہ کو گرا دیا اور وہ میرزا کامران کے سپاہیوں کے ہاتھ آ گیا۔ اسے وہ میرزا کامران کے واسطے لے آئے اور کہا کہ بادشاہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ جو لوگ میدان میں آئے تھے خدمت والا میں حاضر ہوتے جاتے تھے۔ میر سید برکہ، خضر خاں، فرید خاں عموی، میرزا محمد حکیم، میر پولک توشک بیگی، میر افضل پسر میر غضب اور سنبل میر ہزار کے خدمت گار، میر آتش توپچی مولانا صالح مشرف انبار خانہ، درنہای (؟) ہیزم کش اور بندۂ درگاہ خاکسار جوہر آفتابچی نے میدان جنگ سے بادشاہ کی ہمراہی کی سعادت حاصل کی۔ چونکہ بادشاہ پر ضعف غالب تھا اور سواری کا گھوڑا کم رفتار تھا میر سید برکہ نے اپنا تیز رو گھوڑا بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا وہ سوار ہو گئے۔ سیدھے ہاتھ کی طرف میر سید برکہ اور بائیں جانب خضر خواجہ سہارا دیتے ہوئے چل رہے تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اس قدر بیدل نہ ہوں، بلکہ دل کو مضبوط رکھیں۔ لوگ پرانے بادشاہوں کے واقعات اور معاملات جو سنے تھے انہیں بیان کرتے اور عرض کرتے تھے کہ ایسا نہ ہو غنیم پیچھے سے آ جائے۔ حوصلہ رکھیں تقدیر میں جو کچھ لکھا تھا پورا ہوا۔ بادشاہ اس بات کو سننے کے بعد سنبھل

گئے۔عصر کی نماز کا وقت تھا کہ شاہ محمد نے آ کر شرف رکاب بوسی حاصل کیا۔ بادشاہ نے فرمایا ''حاجی محمد کہاں ہے؟'' عرض کیا کہ کوتل سرتوں سے گزر چکا ہے۔فرمایا کہ دور ہے۔اگر اس وقت آ پہنچتا تو ہم واپس ہو جاتے۔مغرب کی نماز کا وقت تھا کہ خواجہ جلال الدین محمود نے آ کر قدم بوسی حاصل کی آخر شب میں کوتل سرتوں پہنچے۔بادشاہ پر سردی کا اثر ہو گیا تھا، دوسرے تلوار کے زخم سے ضعف تھا۔میر سید برکہ نے اپنا کھال کا کوٹ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا اور انہیں پہنایا۔صبح کے وقت کوتل سرتوں کے کنارے پر پہنچ گئے۔جب ہوا میں ذرا گرمی ہوئی تو بادشاہ نے دریا کے کنارے پر نزول فرمایا اور زخم سے خون دھو کر وضو کیا۔کوئی جانماز موجود نہ تھی کہ اس پر نماز پڑھتے۔بندۂ درگاہ جوہر آفتابچی کے پاس کرسی کے گدے تھے۔جانماز کے بجائے وہی بچھائے اور ان پر بادشاہ نے نماز ادا کی قبلہ رو بیٹھے تھے کہ سلطان محمد ہراول آیا اور بادشاہ کے گرد پھر کر اپنے آپ کو نثار کرنے لگا۔بادشاہ نے اس کو بہت اطمینان دلایا اور دریافت کیا کہ حاجی محمد کہاں ہے۔اس نے کہا کہ قریب ہی ہے اور جلد پہنچ جائے گا۔بادشاہ سوار ہو گئے تھے کہ حاجی محمد خاں تقریباً تین سو کارآمد سواروں کے ساتھ جو اس کی معیت میں تھے حاضر ہوا اور قدم بوسی سے مشرف ہوا۔اس نے بادشاہ کی سلامتی پر شکر ادا کیا کہ میدان جنگ سے بخیریت واپس آ گئے اور عرض کیا کہ اس جگہ سے ہم کو جلد واپس جانا چاہئے۔(بادشاہ نے) فرمایا کہ میرزا کامران کابل پہنچ گیا ہے۔کل جس وقت شاہ محمد آیا تھا اگر موقع پر تم بھی آ جاتے تو ہمارا ارادہ تھا کہ واپسی میں اس پر ایک شبخون مارتے۔انشاء اللہ تعالیٰ ہم مرکز پر جلد واپس پہنچ جائیں گے۔بادشاہ نے دل میں سوچا کہ شاہ حسین ایک فتنہ انگیز شخص ہے۔حاجی محمد خاں کو بہکا کر ہمارے خلاف کر دے گا۔ دوپہر کا وقت تھا کہ ضحاک، ران کے مقام پر قیام فرمایا۔بہادر خاں سے کہا کہ اگر تمہارے پاس قلم دوات ہو تو لے آؤ تا کہ گھر کو خطوط لکھیں کہ ہم میدان جنگ سے بخیریت تمام واپس آ گئے۔ ان ملازمین نے بھی جو خدمت میں حاضر تھے اپنے گھروں کو خیریت کے خطوط لکھے۔اس کے بعد حاجی محمد خاں اور شاہ محمد خاں کو طلب کر کے فرمایا کہ غزنین ہم نے شاہ محمد کی جاگیر میں دیا۔ بہت جلد جاؤ تا کہ میرزا کامران کے آدمی وہاں نہ پہنچ سکیں۔تم ایک کام یہ کرنا کہ ہمارے خط کابل میں ہمارے بیٹوں کو پہنچا دینا اور خود یلغار کرتے ہوئے غزنین پہنچ جانا، ہمارے آنے تک غزنین کو مستحکم بنائے رکھنا۔الغرض خطوط دے کر روانہ کیا۔وہاں سے سوار ہو کر مقام بامیان پر

پہنچے۔ وہاں قیام کیا۔ حسن علی ایشک آقا کے پاس جو علی دوست خاں کا باپ تھا ایک ایسا شامیانہ تھا جو صرف ایک آدمی پر سایہ فگن ہو سکتا تھا۔ اس نے وہ لا کر نصب کیا۔ بادشاہ نے اس کے سائے میں آرام فرمایا۔ جب سحر ہوئی تو خاکسار جوہر آفتابچی نے حضرت بادشاہ کو بیدار کیا اور عرض کیا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ فرمایا کہ اے غلام، میرے زخم ہے۔ ٹھنڈے پانی سے وضو کیسے کر سکتا ہوں۔ غلام نے عرض کیا کہ میرے پاس گرم پانی موجود ہے۔ بادشاہ اٹھے اور وضو کر کے صبح کی نماز ادا کی اور سوار ہو گئے۔ راستے میں غسل کے واسطے اترے اور فرمایا کہ میرے کپڑے خون آلود ہیں اور مجھے تکلیف دیتے ہیں۔ بہادر خاں، اگر تمہارے پاس کپڑے ہوں تو لاؤ۔ بہادر خاں نے عرض کیا کہ اے بادشاہ، ایک تہہ کا کپڑا جو حضور نے فقیر کو عنایت فرمایا تھا، میرے پاس ہے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ جیسے کپڑے تم پہنے ہوئے ہو وہی طلب کرتا ہوں۔ اگر تمہارے پاس وہ کپڑے ہوں تو لاؤ۔ بہادر خاں کپڑا لے آئے۔ بادشاہ نے اسے پہنا اور وہ کپڑے جوان کے جسم پر تھے جوہر آفتابچی کے سپرد کر دیئے تا کہ انہیں پاک کر کے حفاظت سے رکھے۔

وہاں سے چل کر کہمرد (5) کے مقام پر نزول فرمایا۔ طاہر محمد نے جو میر خورد کا بیٹا تھا آ کر بادشاہ کی رکاب بوسی کا شرف حاصل کیا، ایک پرانا خیمہ لایا اور اسے کھڑا کیا۔ اس کے پاس کچھ تھوڑا سا کھانے کا سامان تھا وہ پیش کیا (مگر) اس بیوقوف نے کوئی چیز پیش نہ کی بلکہ کوئی سروپا تک نہ لایا۔ بادشاہ نے لوگوں کو کھانے کی اجازت دے دی اور خود پانی کے چشمے کی طرف روانہ ہوئے۔ طاہر محمد نے ایک پھٹا ہوا خیمہ تو دھوئیں سے اٹا ہوا لا کر لگا دیا (6) لیکن اس کے ساتھ کوئی غسل خانہ (طہارت خانہ) نہ لایا۔ آخر کار بندہ خاکسار جوہر آفتابچی اپنے سر پر گھاس کے دو پشتارے لایا اور بادشاہ کے لئے ایک طہارت خانہ تیار کر دیا۔ بادشاہ نے اشارہ سے کہا کہ اس نامرد سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ ایک غسل خانے کا انتظام کر دے۔ ایک ضعیف عورت نے ایک ریشمی بنیان (؟) بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ (7) انہوں نے فرمایا کہ اگرچہ مرد اسے نہیں پہنتے لیکن ضروری ہے کیونکہ ہمارا بنیان میلا ہو گیا ہے، اس لئے اسے پہن لیا۔ اس ضعیفہ کے ذریعہء معاش کے متعلق دریافت کیا اور حکم صادر فرمایا کہ کوئی شخص اس سے محصول نہ لے۔ انعام (8) کے لئے حکم نامہ لکھ کر اس کے حوالے کیا۔ اس کے بعد اطلاع ہوئی کہ تین سو گھوڑوں کا ایک قافلہ وہاں

اترا ہے الہ قلی اندرابی اور حیدر محمد آختہ بیگی کو گھوڑوں کے لئے مقرر کیا۔ وہ گھوڑے لے آئے۔ ظہر کا وقت قریب تھا کہ خبر ملی ایک ہزار سات سو گھوڑوں کا قافلہ اور آیا ہے۔ بادشاہ نے فرمایا جب تک میں خود نہ جاؤں گا کام نہ بنے گا۔ بادشاہ خود سوار ہوئے اور درے کا راستہ اپنے قبضے میں کرلیا۔ قافلے والے مجبور ہو گئے کیونکہ فرار ہونے کی کوئی جگہ نہیں رہی۔ مجبوراً آ کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس قافلے میں سے ایک بوڑھے آدمی نے ایک کمان اور نو تیر پیش کش کئے اور قدم بوسی کا شرف حاصل کیا اور کہا انشاء اللہ تعالیٰ زبردست فتح حاصل ہوگی۔ اسی جگہ قیام کیا اس کے بعد گھوڑوں کی قیمت مقرر کی اور تمسک لکھ کر سوداگروں کو دے دیا۔ اور فرمایا انشاء اللہ تعالیٰ فتح کے بعد تمہارا روپیہ ادا کر دیں گے۔ وہاں سے کوچ کرنے کے بعد الجق (9) کے مقام پر جہاں صحرانشیں لوگ رہتے ہیں نزول فرمایا۔ اس جگہ قوم ایماق آباد ہے۔ وہاں غلہ نہ تھا۔ سات روز تک اسی جگہ قیام رہا۔ ایماق لوگ ہمیشہ ساٹھ بکریاں اور ساٹھ مشک دہی پیشکش کے طور پر لاتے تھے، لوگوں کا گزارا ہوتا رہتا تھا۔ گھوڑے ہر آدمی کو تقسیم کر دیئے اور وہاں سے روانہ ہو کر دریائے بنگی کے کنارے قیام کیا۔ ایک شخص نے آ کر آواز دی کہ اے قافلے والو تم کو ہمایوں بادشاہ کی کچھ خبر ہے؟ جب یہ آواز بادشاہ کے کان میں پہنچی تو فرمایا کہ ہمارے متعلق اس آدمی سے کچھ نہ کہو اور دریافت کرو کہ تو کون ہے، تجھ کو کس نے بھیجا ہے اور تمہارے یہاں کیا خبر ہے؟ اس شخص نے کہا ''میں نظری سال النگی کا بھیجا ہوا ہوں اور قوم مشی (10) کا ایک فرد۔ ہماری قوم میں یہ خبر ہے کہ ہمایوں بادشاہ اور میرزا کامران میں ایک جنگ ہوئی، ہمایوں بادشاہ زخمی ہو کر میدان کارزار سے نکل گئے، جو بالائی جبہ بادشاہ پہنے ہوئے تھے جنگل میں ملا اور میرزا کامران کے سامنے لایا گیا۔ وہ بہت خوش ہوا کہ ہمایوں بادشاہ اب زندہ نہیں ہے۔'' اس کے بعد حضرت بادشاہ نے اس شخص کو اپنے حضور میں طلب کیا اور فرمایا ''کیا تو پہچانتا ہے۔'' اس نے عرض کیا کہ ''ہاں پہچانتا ہوں'' پھر فرمایا کہ نظری سال النگی کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ اور کہو کہ انشاء اللہ واپسی کے وقت تم میری خدمت میں حاضر ہو گے۔ ظہر کا وقت تھا کہ حاجی محمد کوکی کو حکم دیا کہ پانی زیادہ ہے، پایاب کی خبر لاؤ اور ہم کو لے چلو۔ وہ گیا، پایاب دریافت کیا اور خود عبور کر کے عصر کے وقت اپنے آدمی کے ذریعے خبر بھیجی کہ ہم پایاب سے گزر گئے ہیں، بادشاہ بھی تشریف لے آئیں، لیکن وہ آپ نہ آیا۔ بادشاہ کو فکر ہوئی کہ کہیں وہ ہم سے جدا نہ ہو جائے جب

سوار ہونے لگے تو ان کی نظر خاکسار جوہر پر پڑی اور اسے اشارہ کیا کہ تو بھی آ۔ اور روانہ ہو گئے۔ علی قلی اندرابی اور بندہ آفتابچی ایک پہر رات گزرے دریا کے پار اترے اور حاجی محمد خاں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام رات باتوں میں گزر گئی۔

حوالہ جات

1- اکبرنامہ اور تاریخ ہمایوں و اکبر میں الہ قلی کی جگہ علی قلی ہے۔
2- اصل نسخے میں کویل سر ہے لیکن یہ کتابت کی غلطی ہے۔ ایک نسخے میں صرف درہ کوتل ہے۔
3- ابوالفضل اور بایزید نے اس کا نام بابا اور بیگ بابا لکھا ہے (اکبرنامہ ص 297، تاریخ ہمایوں و اکبر ص 129)۔
4- قلقچی۔ وہ نوکر اور خدمت گار جو بادشاہ کا نوکر نہ ہو۔
5- یہ کہمر دہونا چاہئے۔ اصل نسخے میں کاتب نے کمبر کر دیا ہے دیکھو ارسکن۔ جلد دوم۔ ص 332۔
6- اصل نسخے میں عبارت غلط معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے اسٹورٹ کی عبارت کا ترجمہ کیا ہے۔ (اسٹورٹ ص 97)
7- یہاں بھی اسٹورٹ کے الفاظ کا ترجمہ کیا ہے (ص 97) اصل نسخے میں بنیان کا لفظ ہے جو کسی اور لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔
8- انعام سے مراد خط انعام یا فرمان انعام ہے۔
9- الغبق۔ اکبرنامہ کے مطبوعہ نسخے میں ''ادی خنجان'' ہے (ص 299)۔
10- مشی قبیلہ۔ دیکھو ارسکن۔ جلد 2 ص 385۔

پچیسویں فصل [1]

قبچاق کی لڑائی کے بعد بادشاہ کا اولیا خنچا میں قیام فرمانا۔ مرزا ھندال کا حاضر ہوکر آداب شاہی بجالانا، مرزا کامران کا میدان جنگ سے واپس آنا اور قلعہ کا مرزا کامران کے ہاتھ آنا اور شاہزادہ کا قید ہونا۔

بادشاہ اور حاجی محمد خاں کوکی نے ساری رات باتوں میں گزاری اور علی الصباح وہاں سے کوچ کر کے اولیا خنچا پر قیام کیا۔ مرزا ھندال بادشاہ کی خدمت میں آیا اور لباس بادشاہی، علم، توغ، نقارہ وغیرہ میں سے جو کچھ سامان اس کے پاس تھا بادشاہ کی نذر کیا (اس کے بعد) بادشاہ نے وہاں سے کوچ کر کے اندراب پر مقام کیا۔

اب ہم مرزا کامران کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ وہ میدان جنگ سے واپس ہوکر اسی روز چارکاران میں فروکش ہوا اور علی الصباح وہاں سے کوچ کر کے کابل آیا اور اس کو گھیر لیا۔ اس سے پیشتر قاسم برلاس [2] مرزا کامران کا ملازم تھا۔ جس وقت مرزا کامران کے امراء حضرت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ملازمت سے مشرف ہوئے تھے ان میں قاسم علی مذکور بھی شامل تھا۔ حضرت بادشاہ نے کابل کی حکومت قاسم علی کے سپرد کی تھی۔ مرزا کامران کے کابل کا محاصرہ کرنے پر قاسم علی کامل سے دست بردار نہیں ہوتا تھا۔ آخرکار جب حضرت بادشاہ کا جبہ دکھایا گیا اور یہ کہا گیا کہ اب تم کو کس بات کی امید ہے، تب چند روز کے بعد قاسم علی کابل سے دست بردار ہوا اور شاہزادۂ عالمیاں مرزا محمد اکبر پھر کامران کے ہاتھوں قید ہوگئے۔ بادشاہ کو یہ خبر اندراب میں ملی۔ سلیمان مرزا اور ابراہیم مرزا بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ

اگر زندگی باقی ہے تو ہم خدمت گزاری اور جان بازی میں دریغ نہ کریں گے۔ یہاں ایک مہینہ بیس روز مقام ہوا۔ خبر موصول ہوئی کہ مرزا کامران کا ارادہ ہے کہ ہندوکش کے راستے میں جو ہموار مقام ملے اس کو درہم و برہم کر دے (3) بادشاہ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے لئے مناسب یہ ہے کہ ہم اس پہاڑ پر پہنچ جائیں تا کہ وہ ان مقامات کو خراب نہ کر سکے۔ اسی روز سے تیاری شروع کر دی۔ ایک روز حضرت بادشاہ نے امراء اور مرزاؤں کو طلب کر کے ارشاد فرمایا کہ ہم تم سب کو کلام ربانی کی قسم دلاتے ہیں کہ تم ہم سے جدا نہ ہونا اور بے وفائی نہ کرنا۔ حاجی محمد خاں نے عرض کیا کہ اول حضور والا قسم کھائیں۔ مرزا ہندال نے کہا کہ حضرت اقدس کس بات کی قسم کھائیں، تم لوگ بادشاہ نہیں ہو کہ قسم دے سکو۔ بادشاہ نے فرمایا کہ کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ (4) ہاں اس لئے کہ حاجی محمد خاں اور دوسرے امراء کا مشورہ ہے کہ حارج نہ ہوں۔ جانبیں نے قسم کھائی اور عہد کیا۔ بادشاہ نے روزہ رکھا تھا۔ جمعرات کا دن تھا کہ اس جگہ سے کوچ کر کے کوہ ہندوکش کے دامن میں مقیم ہوئے اور وہاں سے روانہ ہو کر پنجشیر پر قیام کیا۔ پھر اشترگرام پر پہنچے اور دیکھا کہ مرزا کامران کے وہاں پہنچ چکا ہے۔ حضرت بادشاہ نے مرزا شاہ سلطان کو طلب کیا اور کامران مرزا کے پاس بھیج کر کہلایا کہ کابل ایسی جگہ نہیں ہے کہ ہم دونوں بھائی اس کے لئے آپس میں لڑیں۔ مصلحت یہ ہے کہ شر کو درمیان سے دور کر کے کابل اپنی لڑکی اور ہمارے لڑکے کے سپرد کر دو (5) پھر ہم یہاں سے روانہ ہو کر لغما (6) میں قیام کریں اور ملک ہند کی فکر کریں۔ مرزا شاہ سلطان (کابل) آیا اور مرزا (کامران) سے جو کچھ کہنا تھا کہا۔ مرزا نے اس معاملے کی طرف رجوع کیا مگر قراچہ بخت نے کہا کہ ہم کابل ہرگز نہیں دیں گے، ہمارا سر ہوگا اور کابل کا دروازہ، ہم یہیں جان دے دیں گے، ہم کو یہ تجویز قبول نہیں۔ مرزا کامران نے اس کم عقل کی شوخی کو پسند کیا۔ مرزا شاہ سلطان کو رخصت کیا اور اس تجویز کو رد کر دیا۔ وہ لوٹ کر حضرت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو ماجرا اور گفتگو مرزا اور قراچہ بخت کے درمیان پیش آئی تھی حضرت بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ نے مرزاؤں اور امیروں کو طلب فرما کر مشورہ کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ چار گھڑی رات رہے جاسوس منادی کر دیں کہ تمام لشکر مسلح ہو کر روانہ ہو۔ جب یہ طے پا گیا تو علی الصباح لوگ فوج کو ترتیب دے کر روانہ ہوئے۔ مرزا سلیمان اور مرزا ابراہیم داہنی طرف تھے، مرزا ہندال بائیں طرف۔ حاجی محمد خاں مقدمے کے ساتھ تھا، اور چند دیگر امراء، یہ سب اسی طریقے پر روانہ ہوئے جب قریب پہنچے اور کچھ فصل

درمیان میں نہ رہا تو حاجی محمد خاں نے عرض کیا کہ آج جنگ ملتوی رکھی جائے اور لشکر کو قیام کا حکم دیا جائے۔ چونکہ آپس میں عہد کر چکے تھے حضرت بادشاہ اس معاملے میں مجبور تھے۔ بیگ میرک کو حکم دیا کہ ہمارا لشکر قیام کرے اس عرصے میں مرزا آئے اور کہا کہ ہمارا کل آنا مصلحت معلوم نہیں ہوتا، جنگ آج ہونی چاہئے۔ ان (دشمنوں) کا ہم پر حملہ کرنا ٹھیک نہیں، بہتر ہے کہ ہم کامران مرزا سے جنگ کریں، یا ہم مارے جائیں گے یا سلامت رہیں گے۔

بیگ میرک نے بھی عرض کیا کہ بندہ سے گناہ سرزد ہوا تھا۔ میری خواہش ہے کہ اب بڑھاپے کے زمانے میں شہید ہو کر گناہ سے پاک ہو جاؤں۔ اس کے بعد تولق (7) قورچی کے لئے حکم دیا وہ بھی نہیں گیا، اور کہنے لگا کہ میں لڑائی کے وقت خدمت سے علیحدہ نہیں ہوں گا۔ اس کے بعد عبدالوہاب کو حکم دیا۔ اس کے لئے تعمیل حکم کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ گیا اور آدمیوں سے کہتا رہا لیکن وہاں چادر اور خیمے نہ تھے کہ (لوگوں کو ان میں) اتارتا اس لئے اس نے بادشاہ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ لشکر دشمن کے مقابلے پر موجود ہے اور چادر اور خیمے نہیں ہیں جن میں قیام کیا جائے۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا کہ ہم تیار ہو کر روانہ ہوتے ہیں (8) اگر لڑائی ہوئی تو خیر ورنہ دریا کے کنارے قیام کریں گے۔ روانہ ہونے ہی کو تھے کہ ایک بوڑھا سپاہی ایک طرف سے آیا اور حضرت بادشاہ کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر کہنے لگا کہ حضور کی فتح ہے، واپس ہو جایئے۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا کہ دو رکعت نماز ادا کر لیں اور نماز ادا کرنے کے بعد اس کے ساتھ روانہ ہوئے۔ مرزا کامران نے شاہزادہ عالمیان محمد اکبر کو حسن (9) آختہ کے سپرد کیا۔

حوالہ جات

1- اس فصل میں جوہر نے ہمایوں کی شکست اور پریشان حالی کے واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں جن میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اکبر نامے میں بھی موجود نہیں ہیں۔ چونکہ تمام حالات اس کے چشم دید ہیں اس لئے ان کو صحیح مان لینے میں کوئی قباحت نہیں۔

2- مسلم یونیورسٹی اور مولوی ظفر حسن کے نسخوں میں قاسم بلاس ہے جو یقیناً غلط ہے دیکھو

بایزید: تاریخ ہمایوں واکبر ص 131۔

3- اصل عبارت یہ ہے: آنجا قلب کند۔

4- ابوالفضل حاجی محمد خاں کے اس مطالبے سے سخت ناراض ہے اور اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے ''حاجی محمد خاں کو کی کہ نہ عقل ادب شناس داشت و نہ دل اخلاص گزیں'' (ص 302)۔

5- اصل نسخے کی عبارت یہ ہے: کابل را برائے عاجز شما و پسر ما بدھند'' چونکہ ابوالفضل نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ ہمایوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ کامران اپنی لڑکی کی شادی شہزادہ اکبر کے ساتھ کر دے اور کابل ان دونوں کو دے دیا جائے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کاتب نے ''دختر'' کو بگاڑ کر ''عاجز'' کر دیا ہے۔

6- لغما، یہاں لمغان کو بگاڑ کر لغما کر دیا گیا ہے۔

7- تولق، یہ لفظ، تو لک، ہونا چاہئے۔

8- اصل نسخے میں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ اسٹورٹ نے اس فقرہ کا ترجمہ نہیں کیا۔ ارسکن نے اپنی کتاب میں اس حصے کا ترجمہ کیا ہے ہم نے اس کی عبارت کا ترجمہ کر دیا ہے۔ (ارسکن، الخ 2 ص 393)۔

9- حسن آختہ کے بجائے اصل نسخے میں، حسن رحمت، ہے۔ (اکبر نامہ ص 305)

چھبیسویں فصل

مرزا کامران کی شکست قراچہ[1] قرابخت کا شتر گراں[2] پر قتل ہونا۔

مرزا کامران کا خلیل افغان کے پاس جانا اور مرزا ھندال کا شہید ہونا

الغرض بادشاہ اندراب سے روانہ ہو کر شتر گراں پہنچے۔ یہاں ایک بلند پہاڑ تھا، جس پر مرزا کامران کے آدمی موجود تھے، اور مرزا کامران کی فوج پہاڑ کے قریب ہی تھی۔ مرزا کامران کے نزدیک ہونے کے باوجود ابراہیم میرزا نے جرأت کی اور دن ہی میں اس بلندی پر قبضہ کر لیا۔ ادھر سے حضرت بادشاہ روانہ ہو کر پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہنچ گئے اور اپنے بندوقچیوں کو حکم دیا کہ پہاڑ کی بلندی پر جا کر بندوق چلائیں۔ کامران مرزا کے لشکر پر دو ہی تین مرتبہ بندوق چلائی گئی تھی کہ قراچہ قرابخت نے اپنی فوج سے بھاگ کر بادشاہ کی فوج میسرہ پر حملہ کیا اور اُسے منتشر کر دیا اور دوسری مرتبہ میمنہ پر حملہ کیا اور اللہ کے حکم سے جس کی شان **یحیی و یمیت** اور **حی لا یموت** ہے،(3) گھوڑے پر سے زمین پر گر گیا اور مرزا ہندال کے آدمیوں نے فوراً قراچہ قرابخت کا سر تن سے جدا کر دیا اور حضرت بادشاہ کے حضور میں لے گئے۔(4) مرزا کامران کو شکست ہوئی۔ بادشاہ نے قراچہ بخت کے سر کو کابل کے دروازہ پر لٹکائے جانے کا حکم دیا کیونکہ اُس نے کہا تھا کہ میں نے اپنے سر کو اس دروازے سے وابستہ کر لیا ہے، بادشاہ نے ایسا ہی کیا، اور مرزا ابراہیم کو حکم دیا کہ یلغار کر کے کابل پر چڑھائی کرے اور مرزا ہندال کو کامران کے تعاقب کے لئے بھیجا، مرزا سلیمان کو اپنی نگرانی میں رکھا۔

شاہزادۂ عالم محمد اکبر کا واقعہ

اب شہزادۂ عالمیان کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے دنیا روشن ہے۔ جب کامران مرزا نے

شکست کھائی تو حسن آختہ بیگی نے شاہزادہ عالم محمد اکبر غازی کو حضرت بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ شاہزادۂ عالم پناہ نے شرف حضوری حاصل کیا۔ بادشاہ ان سے بغل گیر ہوئے، ان کے سر اور آنکھوں کو بوسہ دیا اور بہت مسرور ہوئے، گویا حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کی ملاقات ہوئی۔ خداوند تعالیٰ عز شانہ کی درگاہ میں شکر بجالائے۔ بیت:

نخشی وصل یار کارے داں
کشت مارا فراق محبوبے
عید نوروز ہیچ دانی چیست
آنکہ طالب رسد بہ مطلوبے

الغرض وہاں سے روانہ ہو کر رات کو کابل میں پہنچ گئے اور سب عیش و عشرت میں مشغول ہوئے۔ اس کے بعد خبر ملی کہ مرزا کامران کتولکر پہنچ گیا ہے۔ حضرت بادشاہ بھی یلغار کر کے وہیں جا پہنچے۔ جب مرزا کامران نے یہ سنا تو وہاں سے بھی بھاگا اور جگری پہنچا، بادشاہ بھی یلغار کرتے ہوئے جگری پہنچ گئے۔ اس کے بعد مرزا کامران نے محمد خلیل افغان کے یہاں پناہ لی اور قیام کیا، چاہتا تھا کہ حملہ کرے۔ بادشاہ نے مصلحت اس میں دیکھی کہ افغانوں کی طرف توجہ فرمائیں اور منزل بہ منزل راستہ طے کرتے ہوئے مقام چہرہ (5) پر پہنچ گئے جو چنداں مستحکم نہ تھا۔ وہاں سے سوار ہوئے کہ کوئی بلند اور محفوظ جگہ ہاتھ آئے تا کہ لشکر وہاں اتر سکے، اور ایک قلعہ قائم کیا جائے۔ جب اس کی جگہ مقرر ہوگئی تو واپس ہوئے۔ راستے میں تین ہرن نکلے۔ ایک کو مرزا ہندال نے آگے کر لیا اور ایک کو شاہ ابوالمعالی نے، تیسرا بھاگ نکلا۔ جب مرزا ہندال ہرن کے سامنے پہنچا تو ایسا تیر مارا کہ اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی اور سر، پاؤں اور منہ آسمان کی طرف کر کے جان خدا کے سپرد کر دی جو لوگ موجود تھے حیران رہ گئے کہ شاید ہرن نے اس طرح درگاہ ایزدی میں فریاد کی۔ اس واقعے کو دو ہی دن گزرے تھے کہ مرزا افغانوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ (جس کی تفصیل یہ ہے کہ) مرزا ہرن کا شکار کرنے کے بعد بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دوسرے روز مرزا کامران چاہتا تھا کہ افغانوں کو ساتھ لے کر شب خون مارے۔ (ادھر) بادشاہ نے یہ طے کر لیا تھا کہ شب خون ہوا تو ہم بلندی پر رہیں گے اور دوسرے لوگ چاروں طرف مورچوں پر۔

چنانچہ مرزا ہندال رات بھر مورچوں پر گشت لگاتے رہے اور لوگوں کو اطمینان دلاتے رہے۔ خبر ملی کہ افغانوں نے شب خون مارا اور مرزا ہندال کے مورچے پر جمع ہو گئے۔ مرزا ہندال کے پاس ایک کمان اور دو تیر کے سوا اور کچھ نہ تھا، پریشانی کی وجہ سے ان کے ہاتھ کوئی اور ہتھیار نہ لگا۔ اسی کمان اور دو تیروں سے مقابلہ کیا۔ ان ملعونوں نے مرزا ہندال کو جنگ مغلوبہ (؟) میں شہید کر دیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون (6) چونکہ اُن مقہوروں کو مدد نہ پہنچی اس لئے واپس ہو گئے۔ اس کے بعد بادشاہ نے مرزا ہندال کے متعلق دریافت کیا تو کسی کو اتنی ہمت نہ تھی کہ یہ واقعہ عرض کرے۔ حضرت بادشاہ اس بلندی پر سے آواز دے رہے تھے اور باوجود اس کے کہ تین سو کے قریب آدمی موجود تھے کسی نے جواب نہ دیا۔ عبدالوہاب سے فرمایا کہ جاؤ مرزا ہندال کی خبر لاؤ۔ وہ گیا اور خبر لے کر آ رہا تھا کہ راستے میں ایک بندوقچی نے عبدالوہاب کو افغان سمجھ کر بندوق چلا دی اور مشار الیہ شہید ہو گیا۔ اس کے بعد میر عبدالحئی کو خبر لانے کے لئے بھیجا۔ وہ خبر لایا اور یہ شعر پڑھا:

شہا نور دو عالم رفت برباد
گل صد برگ سوری را بقا یاد

بادشاہ خیمے میں تشریف لائے اور پریشان تھے، اتنے میں امراء حاضر ہوئے اور سمجھانے لگے کہ یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ حضور کی خدمت میں شہادت پائی۔ حضرت بادشاہ سلامت رہیں۔ وہاں سے کوچ کر کے قلعہء بے سوت (7) میں اُترے۔ افغانوں نے جنگل میں (قیام کیا)۔ افغان ہمیشہ مغلوں پر طنز کرتے تھے کہ تمہاری قوت ہم میں آ گئی ہے (ہم) افغان نہایت اطمینان سے میدان میں آ ٹھہرے اور تم میں اتنی طاقت نہیں کہ حملہ کر سکو۔

حوالہ جات

1- اس کا اصل نام قراچہ خاں تھا۔
2- اصل نسخے میں اس مقام کو ''شتر گراں'' لکھا ہے۔ بایزید بیات نے اس جگہ کا نام ''اشتر

گرام'' لکھا ہے(ص106)۔ابوالفضل نے''اشترکرام'' لکھا ہے۔(اکبرنامہ ص306)

3- ''وہی زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے مرنے والا نہیں۔''

4- احمد یادگار نے''تاریخ شاہی'' میں لکھا ہے کہ قراچہ بیگ کو زندہ پکڑ کر ہمایوں کے پاس لایا گیا تھا۔ بعد میں علی بہادر کے بیٹے نے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اس کو مار ڈالا۔

5- چہرہ، بایزید نے چیریار لکھا ہے۔(صفحہ 145)

6- مرزا ہندال کی وفات سنہ 958ھ میں ہوئی اور''شب خون'' سے تاریخ نکلتی ہے۔

7- اکبرنامہ میں بہشود لکھا ہے(ص314)۔یہی صحیح ہے۔دیکھوارسکن۔ص402۔

ستائیسویں فصل

شہزادہ کا افغانوں پر حملہ کرنا اور فتح پانا اور اُن کو لوٹ کر قید کرنا۔ مرزا کامران کا اسلام خاں سور کے پاس جانا وہاں سے بھاگ کر سلطان آدم کے پاس آنا۔ بادشاہ کا سلطان آدم کے گھر پہنچنا اور مرزا کامران کو اندھا کرانا۔

امراء اور دوسرے لوگوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ افسوس ہے کہ ہم قلعے کے اندر رہوں اور افغان لوگ اطمینان کے ساتھ میدان میں رہیں، اور ان کو کچھ اندیشہ نہ ہو۔ اگر ہم اُن پر حملہ کریں تو کیا مضائقہ ہے۔ بادشاہ نے فرمایا کسی باخبر جاسوس کو لاؤ جو افغانوں کے رہنے سہنے کی کل کیفیت بتلائے کہ کس حال میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں، ان کا کیا شغل ہے۔ چنانچہ ایک جاسوس پیش کیا گیا۔ اس نے بیان کیا کہ وہ لوگ اپنے زعم میں قطعی طور پر مطمئن ہیں۔ مرزا کامران کو ہر قبیلہ ایک ایک ہفتہ اپنے پاس رکھتا ہے۔ وہ اسی طرح دن گزار رہے ہیں۔ یہ کیفیت جمعہ کے روز معلوم ہوئی تھی۔ بادشاہ، شاہزادہ جلال الدین اور شاہ ابوالمعالی نے سر کے بال منڈوائے اور غسل کیا۔ نماز جمعہ کے بعد افغانوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ سنیچر کے دن صبح کی نماز کا وقت تھا کہ ایک زبردست فتح حاصل ہوئی۔ الا ماشاء اللہ، مردوں اور عورتوں میں سے قریب قریب بارہ ہزار نفر گرفتار ہوئے۔ واللہ اعلم، اور تین لاکھ مویشی گائے بکریوں میں سے ہاتھ آئے۔ حکم فرمایا کہ عورتوں کو فروخت کر دیا جائے۔ اُس کے بعد بادشاہ فتح و نصرت کے ساتھ کابل میں داخل ہوئے اور مرزا کامران ہندوستان میں اسلام خاں سور کے پاس چلا گیا۔ جب بادشاہ تشریف لائے تو امراء و حکام کو دعوت دی اور ہر ایک کو حسب مراتب خوش ہو کر اطمینان دلایا۔ اب ہندوستان روانہ

ہونے کی فکر کی۔ چاہتے تھے کہ قندھار پہنچ کر ہندوستان کی تدبیر کریں، اُسی اثنا میں سلطان آدم گکر کی طرف سے ایک عرضداشت پہنچی کہ مرزا کامران میرے پاس پہنچ گیا ہے، حضرت بادشاہ بہت جلد یہاں تشریف لائیں۔ چنانچہ بادشاہ کوچ کر کے بنگش (1) میں آ گئے اور سنا کہ ایک شخص شیخ مدنی (2) نے بنگش کے گرد ونواح میں اپنے واسطے ایک جگہ قائم کر لی ہے اور لوگوں کو بہکاتا ہے۔ بادشاہ نے قراچا خاں اور کچھ آدمیوں کو بھیجا کہ اُس کو سزا دیں۔ اُنہوں نے اُس کے اہل وعیال کو قید کر لیا اور وہ خود دھنکوٹ کی طرف بھاگ گیا۔ اُس کے بعد بادشاہ نیلاب (3) کے کنارے پر آئے اور رشی کی گزرگاہ سے عبور کیا۔ کوچ کرتے ہوئے سلطان آدم کے علاقے میں پہنچے۔ سلطان آدم قریب دس کوس کے فاصلے پر تھا کہ اُس کا ایک ایلچی مسمی دھارن آیا اور کہا کہ بادشاہ بہت جلد تشریف لائیں۔ چنانچہ آدھا دن باقی تھا کہ حضرت بادشاہ بیرولہ کے قریب پہنچے اور مرزا کامران سے ملنے کے لئے ایک جگہ مقرر کی اور شامیانے وغیرہ نصب کرائے۔ اُس وقت دھارن نے آ کر کہا مرزا کامران کہتا ہے پہلے آپ تشریف لائیں۔ بادشاہ نے متعجب ہو کر کہا کہ ہم نے ایک جگہ تیار کرائی اور شامیانے وغیرہ لگوائے، اُس کی کیا وجہ ہے مرزا نے ڈھیل دی۔ بہرحال مصلحت کی وجہ سے ذرا اور آگے چلے گئے اور وہاں بھی ایک جگہ تیار کی۔ یہاں بھی دھارن اور بھوان دو ہندو آئے اور عرض کیا کہ مرزا کامران کہتے ہیں اور آگے آئے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ اچھا مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد آئیں گے۔ اسی عرصے میں قرابہادر، بادشاہ زادہ اور سلطان آدم آ گئے اور ان کے ساتھی بھی پہنچے۔ بادشاہ نے دو رکعت نماز ادا کی اور پلنگ پر بیٹھ گئے۔ قرابہادر اور سلطان آدم نے حاضر ہو کر شرف قدمبوسی حاصل کیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ اے سلطان آدم تم نے تباہ کر دیا۔ سلطان نے عرض کیا کہ میں دریائے سندھ کے کنارے پر حاضر ہو کر قدم بوسی سے مشرف ہوتا لیکن میرے ہاں مہماں تھے اس لئے حاضری سے مجبور تھا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ یہاں کی حاضری وہاں کی حاضری سے بہتر ہے۔ اس کے بعد سلطان آدم نے کہا کہ مرزا کامران آپ کو اور آگے بلاتا ہے۔ اس بات سے بادشاہ کے دل میں کچھ شبہ پیدا ہوا۔ سلطان آدم نے عرض کیا کہ مرزا کامران میری قید میں ہے، حضور والا تشریف لے چلیں۔ اس پر بادشاہ دریا کے کنارے جا کر ٹھہر گئے۔ دو گھڑی رات گزری تھی کہ مرزا کامران حاضر ہوا اور سر نیچے کر لیا۔ بادشاہ نے مزاج پوچھا اور اپنے داہنے ہاتھ کی جانب بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ مرزا کامران پلنگ سے تکیہ لگا کر

سیدھے ہاتھ کی طرف بیٹھ گیا۔ بائیں ہاتھ کی جانب شاہزادۂ عالمیاں محمد اکبر شاہ اور سامنے شاہ ابوالمعالی، تردی بیگ خاں، سلطان آدم اور منعم خاں بیٹھ گئے۔ حضرت بادشاہ نے کمالی کو طلب فرمایا۔ ایک دو اچھی پوریاں نوش فرمائیں۔ آدھی مرزا کامران کو دی۔ اسی اثنا میں مرزا کامران نے کہا کہ محمود خاں نیازی اور کمالی خاں پسر سلطان شاہ اور اسلام خاں نیازی اور سلطان آدم کے بیٹے لشکری کل بادشاہ کی قدم بوسی سے مشرف ہوں گے۔ بادشاہ نے فرمایا 'ٹھیک ہے' اور سلطان آدم کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ وہ لوگ ہم سے کل ملیں۔ سلطان مذکور نے عرض کیا کہ بہت مناسب ہے۔ وہ کل حضور سے ملیں۔ یہ ان کی بڑی کم نصیبی ہوگی کہ بادشاہ اتنی دور سے تشریف لائیں اور وہ شرف قدم بوسی حاصل نہ کریں۔ سلطان مذکور نے ایک آدمی بھیجا کہ وہ آئیں اور قدم بوسی سے مشرف ہوں۔ اس کے بعد وہ آئے۔ پہلے محمود خاں نیازی پھر کمال خاں پسر سلطان شاہ پھر اسلام خاں نیازی اور پھر سلطان کے بیٹے لشکری نے شرف قدم بوسی حاصل کیا۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ شامیانے لگا دیئے گئے ہیں۔ فرمایا کہ بس قیام گاہ پر چلنا چاہئے۔ (پھر) حضرت بادشاہ نے فرمایا 'کہیں پان ملے گا'۔ سلطان آدم کے بیٹے لشکری نے بارہ بیڑے پیش کئے۔ ایک خود کھالیا اور گیارہ، گیارہ آدمیوں کو تقسیم کئے۔ فرمایا کہ لشکری نے عجیب کام کیا ہے، جتنے پان درکار تھے اتنے ہی لایا۔ اس کے بعد حضرت بادشاہ سوار ہو کر قیام گاہ پر تشریف لائے اور شاہی مجلس آراستہ کی۔ خوش آواز گویوں نے گایا بجایا۔ تمام رات عیش میں گزاری۔ صبح کو بعد نماز فجر حضرت بادشاہ سو گئے۔ مرزا کامران بھی اپنی قیام گاہ پر چلے گئے۔ ظہر کی نماز کے بعد کھانا لگایا گیا۔ کھایا اور دسترخوان اُٹھایا گیا۔ یہ رات بھی عیش وعشرت میں بسر کی۔ دوسرے روز امراء نے کہا کہ مرزا کامران کے معاملے پر غور فرمایا جائے۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا سلطان آدم کو خلعت دے کر جو کچھ مناسب ہوگا وہ کریں گے۔ تیسرے روز سلطان آدم کو خلعت عطا کیا اور علم ونقارہ جو بادشاہی کے مراتب ہیں اس کو خود مرحمت فرما کر رخصت کیا۔ چوتھے روز مرزا کامران کے معاملے پر غور کیا اور یہ طے فرمایا کہ مرزا کامران کے آدمیوں کو علیحدہ کیا جائے۔ خنجر بیگ، عارف بیگ، علی دوست اور سیدی محمد بیکنہ اور بندۂ کاکسار جوہر کو حکم دیا کہ مرزا کامران کی خدمت میں جائیں اور ارشاد ہوا کہ اے غلام تو جانتا ہے کہ تجھ کو کہاں بھیجا جاتا ہے۔ خاکسار جوہر نے جواب دیا کہ حضور میں جانتا ہوں۔ فرمایا کہ خیمے کے اندر کی خدمت تیرے سپرد ہے۔ نیند اپنے اوپر حرام کر لے۔ حضرت

بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں ہم عصر کے وقت مرزا کامران کے پاس پہنچے۔ مرزا نے جانماز طلب کی۔ بندہ جوہر نے جانماز پیش کی اور مغرب کی نماز خیمے کے اندر ادا کی۔ بندہ سے دریافت کیا 'اے غلام تیرا کیا نام ہے۔' میں نے عرض کیا 'بندہ جوہر' پھر کہا 'اے مہتر تو خدمت گاری جانتا ہے؟' بندہ نے عرض کیا کہ ہاں اپنی بساط کے مطابق۔ اس کے بعد میں خدمت گاری میں مشغول ہو گیا۔ دریافت کیا کہ حضرت بادشاہ کی خدمت میں تو کتنے سال سے ہے۔ میں نے عرض کیا انیس (4) برس سے خدمت میں ہوں۔ فرمایا تو بہت پرانا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں۔ پھر فرمایا کہ کیا تو مرزا عسکری کی خدمت میں بھی رہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ لیکن جلال نامی ایک (غلام) میرے ساتھ تھا جو مرزا عسکری کی خدمت کرتا تھا۔ پھر فرمایا کہ رمضان المبارک سنہ 60ھ میں ہمارے روزے قضا ہو گئے تھے، (5) کیا تو ہمارے عوض روزے رکھ سکتا ہے۔ فقیر جوہر نے عرض کیا کہ ہاں میں قضا روزے رکھ سکتا ہوں، لیکن مرزا کو اپنے قضا روزے خود رکھنے چاہئیں، ذرا ہمت رکھئے اور بزدلی کو دل میں جگہ نہ دیجئے۔ اس کے بعد دریافت کیا کہ تجھ کو کچھ معلوم ہے کہ مجھ کو قتل کیا جائے گا۔ فقیر نے جواب دیا کہ حضرت (بادشاہ) مزاج شاہانہ رکھتے (6) ہیں لیکن میں اپنی عقل سے اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ کوئی شخص اپنے ہاتھ کو خود نہیں توڑتا اور حضرت بادشاہ محمد ہمایوں تو بہت بامروت ہیں۔ رات اسی طرح پر گزری، علی الصباح ہندوستان کی طرف کوچ کیا اور یہ طے (7) کیا کہ مرزا کامران کو اندھا کر دیا جائے۔ جب بادشاہ یہ حکم دے کر روانہ ہو گئے تو کوئی شخص مرزا کامران کی آنکھوں پر نشتر نہیں چلاتا تھا۔ لوگ آپس میں ایسے شخص کو تلاش کرتے تھے۔ اتنے میں سلطان علی بخشی نے (علی) دوست ایشک آقا سے کہا کہ تو نشتر مار۔ علی دوست نے جواب دیا کہ ''جب تو کسی کو ایک شہرخی بھی دیتا ہے تو حضرت بادشاہ سے عرض کر دیتا ہے۔ میں حضرت بادشاہ کے حکم کے بغیر صرف تیرے کہنے سے یہ کام کیسے کر سکتا ہوں۔ کل اگر حضرت بادشاہ نے دریافت کیا کہ یہ کام تو نے کیوں کیا اور ہمارے بھائی کو بیکار کر دیا تو کیا میں اس وقت یہ کہوں گا کہ سلطان علی نے کہا تھا۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔'' وہ آپس میں یہی گفتگو کر رہے تھے۔ جوہر خاکسار نے کہا کہ میں جا کر، بادشاہ سے عرض کرتا ہوں۔ علی دوست نے بھی (ترکی میں) بادشاہ سے عرض کیا کہ اے بادشاہ، تابعداروں میں کوئی شخص یہ کام نہیں کرتا۔ حضرت بادشاہ نے ترکی میں گالی دے کر فرمایا کہ تجھ کو کیا ہو گیا ہے، تو تعمیل کر۔ اس حکم کے بعد لوگ مرزا کامران کے پاس

آئے اور غلام علی نے مرزا سے عرض کیا کہ اے مرزا یہ بات اگر میں خود کہتا ہوں تو خدائے تعالیٰ میری زبان گدی سے کھینچ لے لیکن حضرت بادشاہ کے حکم میں چارہ نہیں۔ حکم یہی ہے کہ تمہاری آنکھوں پر نشتر مارا جائے۔ مرزا نے کہا کہ مجھ کو مار ڈالو۔ غلام علی نے جواب دیا، خداوند کون تم کو مار سکتا ہے۔ پھر وہ اس کام کو انجام دینے کی فکر میں لگ گئے۔ اُس کے ہاتھ میں رومال تھا، اُس کو گولہ بنایا اور اُس فراش نے جس نے میرزا کے پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا تھا میرزا کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اُس کے بعد وہ میرزا کے ہاتھ پکڑ کر خیمے سے باہر لائے اور مرزا کو لٹا کر اُس کی آنکھوں میں نشتر لگایا۔ الا ماشاء اللہ پچاس نشتر مارے (8) لیکن اُس بہادر مرد نے دم بھی نہ مارا، جو شخص میرزا کے زانو پر بیٹھا تھا مرزا نے اس سے صرف یہ کہا کہ تو میرے زانو پر کس لئے بیٹھا ہے، جب تک تمہارا اطمینان نہ ہوگا، تم نہ چھوڑو گے۔ سوائے اُس بات کے اور کچھ نہ کہا اور مردوں کی مانند مستقل مزاج رہا۔ کردی (9) بیوہ دار نے اُس کی آنکھوں میں نمک چھوڑ دیا۔ اس مجبوری کی حالت میں اُس نے اللہ کا نام لیا اور اُس کے بعد یہ الفاظ کہے ''اے خدا! دنیا میں جو کچھ میں نے کیا اُس کی سزا مجھے ملی۔ عقبیٰ میں (معافی کا) اُمیدوار ہوں۔'' اُس کے بعد مرزا کو سوار کر کے لشکر میں لائے۔ قریب ہی سلطان فیروز شاہ کا بنایا ہوا ایک باغ تھا، اُسی میں قیام کیا کیونکہ ہوا گرم ہوگئی تھی۔ اُس کے بعد سوار ہو کر لشکر میں آ گئے۔ مرزا قاسم (کوہ) پور کے خیمے کھڑے تھے وہیں اترے۔ جوہر فقیر کہتا ہے، چونکہ مرزا کو بہت زیادہ بیتاب اور پریشان دیکھا تھا اُس کے سامنے ٹھہر نہ سکا، اپنی قیام گاہ پر آیا اور کارخانے میں آ کر متفکر ہوں۔ علی دوست سلطان باربیگی، غلام علی شش انگشت داروغہ فراش خانہ اور فقیر جوہر گھوڑے دوڑا کر بادشاہ کی خدمت میں گئے سر جھکائے بیٹھا تھا کہ اس فقیر پر بادشاہ کی نظر پڑی۔ جان محمد کتاب دار کو فقیر کی طرف روانہ کیا کہ اس غلام سے دریافت کرے کہ وہ جس کام پر متعین کیا گیا تھا اس کا کیا انجام ہوا اور اس جگہ پر کیسے آیا۔ بندہ خاکسار جوہر نے عرض کیا کہ جس کام پر میں بھیجا گیا تھا وہ پورا ہو گیا۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا اب تو وہاں مت جا اور غسل کا پانی تیار کر۔ اس کے بعد حضرت بادشاہ کوچ کرتے ہوئے بیرانہ (10) جانوہ کے علاقے میں پہنچے۔ پیرانہ مزکور نے آ کر شرف قدم بوسی حاصل کیا۔ سلطان آدم نے پیرانہ کے لئے درخواست کی اور حضرت بادشاہ نے اسے سلطان آدم کے حوالے کیا۔ کرچھاک کے مقام پر کم وبیش پچاس گاؤں کے لوگ درس سنکر کی طرف سے جمع ہوئے تھے حضرت بادشاہ نے اس پر حملہ کیا۔ سنکر کو شکست ہوئی

اور بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔ حضرت بادشاہ نے حکم دیا کہ جس کو رہا کریں اس سے روپیہ لے کر رہا کریں۔ لشکر کے ہر ایک آدمی کو اس کے لائق حصہ ملا۔ اس کے بعد حضرت بادشاہ نے کشمیر کا ارادہ کیا۔ تمام امراء نے متفقہ طور پر کہا کہ یہ کشمیر جانے کا وقت نہیں ہے۔ حضرت بادشاہ نے اصرار کیا۔ شاہ ابوالمعالی نے کشمیر جانے کے سبب سے ایک مغل کے تیر مارا کہ فوراً کشمیر کی طرف روانہ ہو کیونکہ بغیر روانہ ہوئے چارہ نہیں۔ جب امراء نے دیکھا کہ حضرت بادشاہ مصر ہیں تو جمع ہو کر سلطان آدم کے پاس گئے اور اس سے واقعہ کہا۔ اس نے حضرت بادشاہ کے پیر پکڑ کر عرض کیا کہ اس موقع پر کشمیر جانے کا ارادہ ملتوی فرمائیں۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ اسلام خاں سور نے اس طرف کا ارادہ کیا ہے۔ اور وہ افغان جو قلعہ رہتاس کو چھوڑ کر دریائے چناب کے پار چلے گئے تھے پھر اسی دریا پر واپس آ گئے ہیں بہتر یہ ہے کہ اس مرتبہ کابل اور قندھار کو تشریف لے چلیں اور وہاں سے خان خاناں بیرم خاں کو ساتھ لے کر آئیں۔ ہندوستان بھی ہاتھ آ جائے گا کشمیر بھی۔ اب دریائے سندھ کو درمیان میں کر لیں۔ دیکھیں خدائے جل جلالہ کی طرف سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1- بنگش۔ دیکھو ہسٹری آف انڈیا، ارسکن، جلد دوم ص 407

2- شیخ مدنی۔ ارسکن نے 'مذہبی' لکھا ہے۔

3- نیلاب یا نیل آب یعنی دریائے سندھ۔

4- چونکہ یہ واقعات سنہ 960ھ کے ہیں اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوہر 941ھ میں ہمایوں کی خدمت میں آیا ہوگا۔

5- رمضان المبارک سنہ 60ھ سے مراد رمضان المبارک سنہ 960ھ ہے۔ عموماً صدی کا عدد حذف کر کے صرف سنہ کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ ولیم ارسکن نے جوہر کے بیان میں سے اس حصے کا ترجمہ حسب ذیل کیا ہے۔

It was then Ramzan and he told his attendant that he had

انتیسویں فصل

حضرت بادشاہ کا اقبال وکامرانی اور دولت ابدی کے ساتھ ہندوستان کی طرف روانہ ہونا اور اس کو فتح کرنا

نخشبی روزگار منقلب است — پاسبانی دھد بہ جمشیدے
راحتے کو ز محنتے بیروں — روز اول کہ دید خورشیدے
عاقلاں روزگار گردندہ ست — غم و شادی در و پیہم باشد
راحتے کس مدام کم بیند — محنتے ھم مدام کم باشد

جب حضرت بادشاہ مبارک گھڑی میں کابل سے جلال آباد تشریف لائے تو وہاں سے ایک جالہ [1] پر بیٹھ کر بڑی خوشی وخرمی کے ساتھ پشاور تک آئے۔ یہاں دو روز قیام کیا۔ سلطان دام کے نام ایک فرمان صادر فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم ہندوستان کا رخ کریں گے۔ اس کے بعد متواتر کوچ کرتے رہے اور منزلیں طے کر کے دریائے سندھ پر پہنچے۔ دریا عبور کیا ہی تھا کہ خاکسار جوہر کی نظر نئے چاند پر پڑی۔ حضرت بادشاہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کی کہ اے بادشاہ عالم نیا چاند، دریا عبور کرنا اور ہندوستان میں داخل ہونا مبارک ہو۔ حضرت نے تین مرتبہ انشاء اللہ، فرمایا۔ اس کے بعد کوچ کرتے ہوئے برہالہ کے اطراف میں پہنچ گئے۔ اُس مقام پر حضرت بادشاہ نے خاکسار جوہر سے فرمایا کہ شاہزادۂ عالمیاں ونور دیدۂ جہانیاں کو غسل دے کر کپڑے پہناؤ اور ہماری خدمت میں حاضر کرو۔ شاہزادۂ عالمیاں نے فرمایا کہ میں تمہارے سامنے برہنہ نہیں ہوسکتا، مجھے اپنا جسم برہنہ کرنے سے شرم آتی ہے۔ خاکسار جوہر نے عرض کیا کہ اگر حضور کی رائے ہو تو رفیق کو بلالوں۔ فرمایا 'ایسا ہی کرو'۔ رفیق کے آنے پر غسل فرمایا اور کپڑے پہن کر

تشریف لے آئے۔ خاکسار جوہر حضرت بادشاہ کے حضور میں لے گیا۔ حضرت بدولت خود قبلہ رو بیٹھے اور شاہزادۂ عالمیاں کو اپنے سامنے بٹھایا اور بار بار کچھ پڑھتے تھے اور شاہزادۂ عالمیاں کے منہ پر دم کرتے تھے۔ اس قدر اظہار خوشنودی فرماتے تھے کہ گویا (تمام) نعمت واقبال وکامرانی اور دولت جاودانی اُسی روز انہیں مرحمت ہوگئی ہے۔ اُس کے بعد وہاں سے برہالہ سے چار کوس پر قیام فرمایا اور ارشاد ہوا کہ ہم بشارت نیک یعنی شگون لیں گے اور سپاہیوں کا ضروری سامان ملاحظہ کریں گے۔ ہم الف سے شروع کریں گے اور چونکہ آفتابچی میں الف ہے اس لئے آفتابچیوں کو چاہئے کہ اسلحہ لگائیں۔ لشکر خاں عرف محمد حسین آیا اور آفتابچیوں کو یہ حکم پہنچایا۔ اُس حکم کے بموجب خاکسار جوہر، مہتر صبیح، توفیق اور دیگر آفتابچیوں نے ہتھیار لگائے اور کھڑے ہو گئے۔ حضرت بادشاہ اُن کو دیکھ کر خوش ہوئے اور فرمایا، مبارک ہو ہم نے نیک شگون لے لیا۔ ملازمین میں سے بھی ہر ایک نے مبارکباد پیش کی کہ انشاءاللہ تعالیٰ حضرت کی دعا نیک خواہوں کے حسب منشاء مقبول ہوگی۔ آمین یارب العالمین۔ ساز وسامان ملاحظہ کرانے کے بعد آفتابچیوں اور چند غلاموں مثل مہتر سہاگا وفرہاد خاں اور بعض احباب نے عرض کیا کہ ہم نے واجبی سامان باندھ لیا ہے۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا وہ جو ساز وسامان رکھتے ہیں ہم کو معلوم ہے لیکن ہم نے شگون لیا ہے (اور ہمیں کامیابی کی) اُمید ہے۔ اُس کے بعد دولت واقبال کے ساتھ کوچ کرتے ہوئے چناب کے قریب پہنچے، دریائے چناب چار کوس باقی تھا کہ حضرت بادشاہ کی نظر مبارک ایک بلند جگہ پر پڑی۔ اُسی جگہ حکم دیا کہ شامیانے کھڑے کئے جائیں اور مغزیات سے آش تیار کیا جائے۔ اُس کے بعد شامیانے کھڑے کئے گئے اور آش تیار کیا گیا۔ آش نوش فرمایا اور امراء کو (خدمات پر) متعین کیا۔ خان خاناں بیرم خاں، سکندر خاں اوزبک، تردی بیگ خاں، لال بیگ اور سلطان کے بعض امراء کو رخصت فرمایا اور حکم دیا کہ دامن کوہ کے اطراف وجوانب کو زیر کرتے ہوئے جالندھر تک جائیں اور معلوم کریں کہ گردونواح میں کہیں افغان ہیں اور حضرت بادشاہ کو مطلع کریں، اگر نہ ہوں تو دریائے ستلج کو عبور کر کے خطہء سرہند میں پہنچ جائیں۔ میر منشی اور شہاب خاں، فرہاد خاں عرف مہتر سکھائی (2) داروغہ توشہ خانہ مہتر صبیح آفتابچی اور چند اور لوگوں کو لاہور کی طرف روانہ فرمایا۔ اسی عرصہ میں بریا آبدار (3) نے عرض کیا کہ میرے اہل وعیال لاہور میں ہیں، حکم ہو تو ان کی خیر وعافیت معلوم کر آؤں۔ حضرت نے فرمایا، اگر تو وہاں چلا گیا تو پانی کی گردنی کون اُٹھائے

گا۔خواجہ سلطان علی میر بخشی نے عرض کیا کہ اُس کا بھائی فتح اللہ اُٹھائے گا۔حضرت بادشاہ نے قبول نہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اچھا وہ جا سکتا ہے۔ہم گردنی کسی اور کے سپرد کر دیں گے۔اُس کے بعد گردنی خاکسار جوہر کے حوالے فرمائی۔بریا تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اُس کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر گردنی کسی اور خدمت گار کے سپرد کر دی تو خدا جانے پھر ملے یا نہ ملے۔اس خیال سے پریشان ہو کر ایک رات گزرنے کے بعد واپس آ گیا۔چونکہ گردنی فقیر جوہر خاکسار کے سپرد فرما دی تھی، اُس نے عرض کیا کہ یا حضرت، فقیر آب دار خانے میں رہے یا آفتاب خانے میں۔حکم ہوا کہ آفتاب خانے میں، لیکن ایک پانی پینے کا پیالہ، ایک چینی کا پیالہ اور ایک گردنی اپنے پاس رکھ۔پانی کے کوزے کو بے مہر کے نہ چھوڑ اور رات میں پانی کی گردنی کو خالی رکھ۔جب ہمارے واسطے پانی لائے اور ہم کو پلائے تو چینی کے پیالے میں پلا۔سواری کے وقت گردنی لے کر سوار ہو۔حضرت بادشاہ نے یہ ہدایتیں فقیر جوہر کو دیں۔

اب نفس مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں: جب بریا رات گزرنے کے بعد واپس آیا تو کوچ کے وقت وہ گردنی طلب کرنے کے لئے جوہر کے پاس آیا۔چونکہ الانسان مرکب من الخطاء والنسیان مشہور ہے، جوہر نے اپنی نادانی سے گردنی بریا کے حوالے کر دی۔جب سواری کے وقت حضرت بادشاہ نے گردنی بریا کے ہاتھ میں دیکھی تو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھایا اور جب وضو کرنے کے لئے نیچے آئے تو فقیر جوہر کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔چونکہ اس پر خاص لطف و عنایت فرماتے تھے اس لئے اسی پر اکتفا فرمایا، اور کہا ہم نے ایک خدمت تیرے سپرد کی تھی تو نے پھر اس کے حوالے کر دی۔الغرض جو امراء جالندھر کی طرف بھیجے گئے تھے دریائے ستلج کو ماچھیواڑہ سے عبور کر کے سرہند پہنچ گئے اور تاتار خاں کاشی کا جو کچھ مال و خزانہ تھا سب لوٹ لیا۔(4) حضرت بادشاہ کلانور میں تشریف لائے اور چند روز یہیں قیام کیا۔شاہ ابوالمعالی اور حضرت بادشاہ نے آپس میں یہ طے کیا کہ پہاڑی علاقے میں جائیں۔امراء اس پر تیار نہ تھے۔لیکن حضرت بادشاہ کے سامنے عرض نہیں کر سکتے تھے۔مگر بندۂ خاکسار جوہر نے ذمہ داری لے کر عرض کیا کہ حضرت بادشاہ کی رائے ہے کہ پہاڑوں میں گھس جائیں؟ حضرت نے فرمایا کہ تیرا منشاء کیا ہے؟ بندہ جوہر نے عرض کیا کہ اس زمانے میں کام بہت ہے۔آئندہ جو حکم ہو۔حضرت بادشاہ نے فرمایا کہ اچھا ہم لاہور کی جانب جائیں گے۔آخر یہی طے ہوا اور لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔لاہور سے دس

کوس پر ایک مقام پتہ بہری (5) ہے وہاں قیام فرمایا۔ لاہور کے معززین اور سادات، مخدوم الملک شیخ عبداللہ میاں حاجی مہدی، قضاۃ اور دوسرے لوگوں نے حضرت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی غرض سے پیام بھیجا کہ ہمارے اور مخدوم الملک کے درمیان جھگڑا ہے۔ ایک جگہ ایک وقت میں حاضر ہو کر خدمت سے مشرف نہیں ہو سکتے۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا، ہم تمہارے درمیان صلح کرانے آئے ہیں تا کہ تم میں باہم خلوص ومحبت ہو۔ اب تم کو اختیار ہے۔ آخر کار یہ طے پایا کہ مخدوم الملک پہلے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوں اور اس کے بعد میاں حاجی مہدی جب مخدوم الملک اپنے ہمراہیوں کے ساتھ حضرت بادشاہ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوئے تو بعد ملاقات حضرت بادشاہ نے فرمایا کہ طرفین کی یہ ملاقات حضرت یعقوب، حضرت یوسف علیہما السلام کی ملاقات یاد دلاتی ہے۔ الحمدللہ رب العالمین۔ گفتگو کے بعد نان اور شربت پیش کیا گیا۔ کھانے اور پینے کے بعد خیر وعافیت کے لئے دعا کی۔ اس کے بعد میاں حاجی مہدی حضرت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جو گفتگو مخدوم الملک سے ہوئی تھی ان سے بھی ہوئی، اور نان وشربت پیش کیا گیا۔ حاجی مہدی نے کہا 'میں غیروں کے گھر کھانا نہیں کھاتا' حضرت بادشاہ نے فرمایا 'گیہوں کابل کے ہیں اور خود کاشت زراعت کے ہیں۔ شربت کابل کے تربوزوں سے نکلا ہوا آیا ہے (6) جس کے گھڑے ابھی پہنچے ہیں اور ہندوستان ہنوز قبضے میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کھانا بے شبہ ہے۔ حاجی مہدی نے جواب دیا کہ بیشک شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن میں اکثر کسی کے گھر کھانا نہیں کھاتا (7) حضرت بادشاہ نے فرمایا 'ہمارا جو قاعدہ اور طریقہ ہے ہم اسے بجالائے، آئندہ تم کو اختیار ہے۔ اس کے بعد وہاں سے کوچ کر کے دولت واقبال کے ساتھ لاہور پہنچے اور یہ قرار پایا کہ گرد ونواح کے پرگنوں کی تحصیل کے لئے خاص خدمت گار مقرر کرنا چاہئیں اور فقیر جوہر کو پرگنہ ہیبت پور بنی کے لئے نامزد کیا۔ یعقوب زریں قلم نے عرض کیا کہ جوہر کو پرگنہ ہیبت پور بنی کے لئے حکم ہوا ہے اس کی اجازت ملنی چاہئے۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا 'اے غلام تو نے سنا ہے، ایک مغل لشکر سے باہر آیا اور بائیں جانب کے ایک شخص سے دو کمبل لے لئے اور کہا (8) اے مردک میں تحصیل کے لئے جا رہا ہوں۔ اس حکم کے سننے کے بعد جوہر نے عرض کیا ہاں بادشاہ سلامت ایسا ہی ہے۔ لیکن انشاء اللہ تعالیٰ حضرت بادشاہ کے جوتوں کی برکت سے اور بادشاہ کے ہاتھ دھلانے کے تصدق میں کام صحیح طریقہ پر انجام پائے گا۔ پھر فرمایا 'بھلائی چاہتے ہو تو اچھا ہے اور بدی کے

لئے تو سزا اور تنبیہ مقرر ہے۔ فی الجملہ جب فقیر جوہر پرگنہء مذکور میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ افغانوں کے اہل وعیال بنیوں کے پاس رہن ہیں اور اتنا روپیہ میسر نہیں ہے جس سے کسی طرح چھٹکارے کی کوئی صورت ہو۔ بندہ جوہر نے جہاں کہیں افغانوں کا غلہ مل سکا کھیتی وغیرہ میں سے نکال کر فروخت کیا اور بنیوں کا روپیہ ادا کر کے اُن کے اہل وعیال کو چھڑایا۔ یہ واقعہ بادشاہ تک پہنچا۔ پسند کیا اور فرمایا ایک ہفتہ قبل ہم نے کہا تھا کہ نیکی کا بدلا نیک ملے گا۔ پھر عزت افزائی کی اور نثار خاں لودھی کا ضبط کیا ہوا خزانہ فقیر جوہر کے سپرد کیا۔

اب یہاں سے عمر خاں گھکر کی لڑائی کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ (عمر خاں مذکور) چاہتا تھا کہ بارہ ہزار سوار لے کر ملتان کی طرف پرگنہء جوہی اور پرگنہء فیروز پور کے درمیان جائے اور ہندوستان میں افغانوں سے جا ملے۔

حوالہ جات

1- جالہ، پانی عبور کرنے کا ایک آلہ یعنی چوگھڑا یا گھڑنائی جو مٹی کے برتنوں اور دوسری چیزوں سے بنایا جاتا ہے اور اس پر بیٹھ کر دریا سے عبور کیا جاتا ہے۔

2- مہتر سکھائی اصل نام تھا اور فرہاد خان خطاب، جو ہمایوں نے لاہور کا حاکم بناتے وقت عطا کیا تھا۔ یہ تقرر اُن واقعات کے بعد ہوا تھا لیکن جوہر نے پہلے ہی سے اُس کو فرہاد خاں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ دیکھو تفصیل کے لئے تاریخ ہمایوں واکبر ص192۔

3- بریا آب دار۔ یہ نام اصل نسخے میں اسی طرح لکھا ہے۔ اسٹورٹ نے اس کو ھربی لکھا ہے۔

4- جوہر نے فتح پنجاب کے واقعات کو بہت مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ لیکن اکبرنامہ، طبقات اکبری اور دوسری ہم عصر تاریخوں میں یہ واقعات تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھو طبقات اکبری ص220۔

5- اسٹورٹ کے نسخے میں یہ نام نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس نے لکھا ہے کہ جب بادشاہ لاہور

سے دس کوس کے فاصلے پر تھا تو وہاں کے عمائد وغیرہ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

-6 اصل نسخوں کی عبارت بے ربط اور غلط ہے۔ زیر نظر نسخوں میں 'کہ جور سیدہ اند' لکھا ہے۔ غالباً 'جرہ ھایش رسیدہ اند' ہوگا۔

-7 اصل عبارت یہ ہے 'اما اکثر این جانب از خانہ کسے نمی خورد'

-8 مطلب یہ ہے کہ کسی مغل کو مال گزاری وصول کرنے کا کام سپرد کیا گیا تھا اس نے اپنے علاقے میں کسی شخص کے کاندھے سے کمبل اتار لئے اور کہا میں تحصیل کرنے کے لئے مقرر ہوا ہوں۔

تیسویں فصل

عمر خاں گھکر پر شاہ ابوالمعالی کی پہلی فتح

حضرت بادشاہ کو جب علم ہوا کہ محمد عمر خاں گھکر پرگنہء جوہی اور فیروز پور ہو کر دریائے بیاہ کو بائیں طرف چھوڑ کر ہندوستان جا رہا تو حضرت بادشاہ نے اپنے امراء سے مشورہ کیا۔ اس پر سب کا اتفاق ہوا کہ اس وقت اس سے لڑنا مناسب ہے۔ حضرت بادشاہ نے شاہ ابوالمعالی، و محمد قلی پلاس، خان زماں، بہادر خاں الہ قلی اندرانی اور چند دیگر امراء کو عمر خاں کے مقابلے کے واسطے متعین فرمایا۔ وہ کوچ کرتے ہوئے پرگنہء جوہی پہنچے۔ اس طرف سے عمر خاں بارہ ہزار سوار کے ساتھ آ گیا۔ حضرت بادشاہ کے امراء کے ساتھ صرف سات سو سوار تھے۔ فریقین میں لڑائی شروع ہوئی۔ افغانوں نے ابوالمعالی پر حملہ کیا۔ شاہ ابوالمعالی کے سر پر تلواروں کے سائے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اور قریب تھا کہ شاہ ابوالمعالی کو گھوڑے پر سے گرا لیں۔ اُس وقت مریدوں میں سے امیر سعدان شاہ یکہ طبل باز اور قورچیوں میں چند آدمیوں نے جن کو شاہ طہماسپ صفوی نے حضرت بادشاہ کے ساتھ مقرر فرمایا تھا خود کے چمڑے کے ٹکڑے کر کے سر پر رکھے [1] اور شور کرتے ہوئے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے لڑائی میں شاہ ابوالمعالی کے پاس پہنچ گئے اور عمر خاں گھکر پر حملہ کر کے اُس کو گھوڑے سے گرا دیا۔ افغانوں نے شکست کھائی اور بہت سے گرفتار ہو گئے۔ خیال کیجئے، کہاں سات سو سوار اور کہاں بارہ ہزار! لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم مدد پر تھا اور اقبال و کامرانی شامل حال تھے اس لئے فتح جاودانی نصیب ہوئی۔ پہلی فتح جو اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائی یہ تھی۔ شاہ ابوالمعالی اور دیگر امراء نے ایک عرضداشت اس فتح عظیم کی مبارکباد میں حضرت بادشاہ کی خدمت میں روانہ کی۔ حضرت بادشاہ نے نہایت مہربانی و دلدہی کے ساتھ جواب تحریر

فرمایا کہ انشاءاللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے مراتب ومناصب آپ کی خیراندیشی کے مطابق مقرر ہوں گے، اطمینان رکھیں، اور جو افغان گرفتار ہوئے ہیں سب کو یہاں لے آئیں۔ فرہاد خاں نے عرض کیا کہ حضرت بادشاہ نے اللہ کے سامنے کچھ عہد کیا تھا۔ فرمایا کہ مجھے یاد نہیں، تمہیں یاد دلاؤ۔ فرہاد خاں نے کہا کہ حضرت نے عہد کیا تھا کہ کسی کو قید نہ کریں گے۔ فرمایا کہ ہاں جو کچھ تم کہتے ہو ٹھیک ہے، جاؤ اور تمام قیدیوں کو آزاد کردو۔

حوالہ جات

1- پیش نظر نسخوں میں فارسی عبارت واضح اور صاف نہیں معلوم ہوتی۔ ترجمہ سیاق کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔

اکتیسویں فصل

ماچھیواڑہ کی فتح

جس وقت فرہاد خاں کو قیدیوں کے آزاد کرنے کا حکم ملا، ایک عرضداشت بیرم خاں، سکندر خاں ازبک، لالہ بیگ، شاہ قلی نارنجی (1) اور دوسرے امراء کی طرف سے پہنچی کہ تتار خاں کاشی، حبیب خاں سلطانی، فتح برادر مبارک خاں اور ایسے ہی دوسرے امراء جو سرہند کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اس وقت وہ سب جمع ہو کر آئے ہیں، جو کچھ حکم ہو بجالائیں۔ حضرت بادشاہ نے ایک فرمان صادر فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ شاہ ابوالمعالی نے جو بہت کم عمر ہے اور جس نے کبھی لڑائی نہ لڑی تھی نہ دیکھی تھی صرف سات سو سوار سے عمر خاں گھکر کے بارہ ہزار سواروں کو پسپا کر کے غارت کر دیا۔ تم نے جو ہماری خدمت میں عرضداشت لکھی ہے اُس سے تمہارے دل میں کیا خیال آ رہا ہے، شاید تم لوگ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے۔'' اس فرمان کے پہنچنے سے امراء کی بہادری اور دلیری بڑھ گئی۔ افغانوں نے جن کے دماغ میں غرور اور گھمنڈ بھرا ہوا تھا دریائے ستلج کو ماچھیواڑہ کے قریب عبور کرنے کے لئے پل بنایا تھا اور سوچا تھا کہ جب بھاگیں گے تو پل کے اُس راستے میں سے گزر کر کسی دوسرے کو نہ جانے دیں گے۔ لیکن چونکہ غرور اور گھمنڈ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے حضرت ذوالجلال والاکرام نے اپنے الطاف نامتناہی سے حضرت بادشاہ کی امداد فرمائی اور حضرت بادشاہ کے امراء اُسی پایاب سے گذرے جہاں افغانوں نے پل بنایا تھا اور جو آگ افغانوں نے گاؤں میں لگا دی تھی اُسی کی روشنی میں افغانوں کو تیروں اور گولیوں کا نشانہ بنایا۔ افغانوں میں بھگدڑ پڑ گئی اور اقبال و کامرانی کی بدولت ماچھیواڑہ میں افغانوں پر فتح حاصل ہوئی۔ لشکر فاتحانہ انداز سے سرہند میں داخل ہوا (2) یہ خبر آئی کہ حضرت بادشاہ کے امراء کا لشکر فتح و فیروزمندی کے ساتھ سرہند

میں پہنچ گیا۔ وہاں سے اُن لوگوں نے ایک عرضداشت حضرت بادشاہ کی خدمت میں لکھی کہ سکندر سور نے اس طرف کا رخ کیا ہے۔ جو کچھ حکم ہو (بجالائیں)۔ پھر ایک دوسری عرضداشت امراء کی طرف سے حضرت بادشاہ کی خدمت میں یہ آئی کہ اسکندر سور 70 ہزار (3) سوار فوج کے ساتھ قریب آ پہنچا ہے اور یہ خدام سات یا آٹھ سو سواروں سے اُس کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتے۔ یا حضرت بادشاہ خود تشریف لائیں یا ہم خادموں کو اپنے پاس طلب فرمالیں۔ حضرت بادشاہ نے فرمان صادر کیا کہ دو روز صبر کرو، ہم وہاں پہنچتے ہیں۔ اُس کے بعد اُسی زمانے میں حضرت بادشاہ کوچ کرتے ہوئے ماچھیواڑہ سے گزر کر بہادری اور اقبال و کامرانی کے ساتھ سرہند میں داخل ہو گئے۔ اُدھر سے سکندر سور آ گیا۔ دونوں طرف کے لشکروں نے ایک دوسرے کے مقابل پڑاؤ ڈالا۔ سکندر سور نے کہا کہ ہمایوں بادشاہ کا دماغ اور ہمت قابل تعریف ہیں کہ پانچ ہزار سوار لے کر ہمارے 70 ہزار سواروں کے مقابلے پر آئے ہیں۔

اب ہم اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ میرزا شاہ سلطان امین، پابوس خاں فوجدار، فرہاد خاں حاکم، تاتار خاں عرف خواجہ طاہر محمد دیوان لاہور اور بندۂ درگاہ جوہر آفتابچی کو سرکار پنجاب و ملتان کا خزانچی مقرر فرمایا تھا۔ اس عرصے میں مہمند افغانوں کی ایک جماعت اپنے فاسد خیالات کی وجہ سے تقریباً چار سو سوار اور قبیلہ فر کے لوگوں کو ساتھ لے کر ملتان کو تاراج کرتی ہوئی لاہور کی طرف سے آئی۔ یہ خبر حاکمان مذکور تک پہنچی۔ بندہ جوہر نے عرض کیا کہ یہ قبیلہ اچھا نہیں۔ بندہ جوہر اور فرہاد خاں حاکم کے درمیان مشورہ ہوا کہ ابھی حضرت بادشاہ دشمن کے مقابلے میں مصروف ہیں اگر یہ خبر افغانوں تک پہنچے گی تو اُن کی ہمت اور بڑھ جائے گی اور یہ اچھا نہ ہوگا۔ مرزا شاہ سلطان امین اور پابوس خاں دونوں کو عذر کا موقع ہے کہہ دیں گے کہ ہم بے قصور ہیں۔ پس جو کچھ بھی ہوگا بندہ جوہر اور فرہاد کے سر پر ہوگا، اس لئے کہ لوگ کہیں گے ان غلاموں سے اتنا کام بھی نہ ہوا اور بعض خاندان بھی چاہتے ہیں کہ کسی قسم کی ملامت ان پر آئے۔'' فرہاد خاں نے کہا پھر کیا کرنا چاہئے۔ بندہ جوہر نے کہا اپنے سوار مقرر کرنے چاہئیں حضرت بادشاہ کا اقبال زبردست ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم کو فتح ہوگی۔ جلال سنبھلی ایک ہوشیار اور اچھا جوان تھا، اُس کو ہراول مقرر کیا اور مہتر صبیح کو بھی اُس کے ساتھ کیا۔ تقریباً چار سو سواروں کی ایک جماعت فرہاد خاں اور بندۂ جوہر کی طرف سے تیار ہوگئی۔ ایک پہر کے قریب رات (4) گزری تھی کہ ہم نے یلغار کیا۔ صبح کے وقت افغان

پتہ ہری میں نمودار ہوئے۔ سب کے سب دریا کے اندر گھس گئے۔ اس کے بعد جب وہ غافل ہو گئے تو فرہاد خاں کا نام لیتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ فرہاد خاں آ گیا، افغانوں پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت بادشاہ کے اقبال و کامرانی کی بدولت افغانوں کو زیر کر لیا اور فتح حاصل ہوئی۔ افغانوں کے پانچ سردار قید ہوئے۔ یہ واقعہ حضرت بادشاہ کی خدمت میں تحریر کیا۔ اطلاع موصول ہونے پر حضرت بادشاہ نے فرمایا 'ہمارے غلاموں کو یہ فتح ہوئی ہے، انشاء اللہ تعالیٰ (بڑی مہم میں بھی) ہمیں کو فتح ہوگی، حوصلہ افزائی کے لئے ایک فرمان صادر فرمایا کہ یہ کام مناسب اور پسندیدہ ہوا، وفاداری ایسی ہی ہونی چاہئے، جو جو افغان تمہارے قبضے میں ہیں اُن کو قید میں رکھو، فتح کے بعد جیسا مناسب ہوگا حکم دیا جائے گا۔'

حوالہ جات

1- دیکھو تاریخ ہمایوں واکبر ص 80۔

2- دوسری ہم عصر تاریخوں میں اس جنگ کی مزید تفصیلات موجود ہیں۔ مثلاً نظام الدین نے لکھا ہے کہ اس فتح کے بعد بہت سا سامان اور ہاتھی مغلوں کے ہاتھ آئے (دیکھو طبقات اکبری ص 220)

3- اسٹورٹ نے اپنے ترجمے میں 80 ہزار تعداد لکھی ہے طبقات اکبری میں بھی 80 ہزار ہے۔ (دیکھو ص 220)

4- قلمی نسخوں میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے عبارت مہمل ہوگئی ہے۔ اسٹورٹ نے ان الفاظ کو 'دریائے زنگی سار' پڑھا ہے، جو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔

بتیسویں فصل

حضرت بادشاہ کا مقام سرہند پر فتح حاصل کرنا اور سکندر سور کا شکست کھانا

جب حضرت بادشاہ اور سکندر سور قریب ایک مہینے کے ایک دوسرے کے مقابل سرہند میں پڑے رہے تو حضرت بادشاہ نے فرمایا کہ سکندر سور سے ہم اسی طرح لڑائی لڑیں گے جیسے سلطان بہادر سے گجرات میں لڑے تھے۔ ایسی ترکیب کرنی چاہئے کہ ان کو غلہ اور رسد نہ پہنچے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تردی بیگ خاں کو مقرر کیا گیا۔ اُس نے رسد کو لوٹا اور سکندر سور کے بھائی کو مار ڈالا اور اُس کا ماہی مراتب لے آیا۔ فتحمند لشکر کے لئے یہ فتح بھی ایک پیغام فتح تھی۔ اُس کے بعد جب مبارک گھڑی آئی تو فوجیں جنگ کے لئے آراستہ کی گئیں۔ پہلے بادشاہ کا مقدمۃ الجیش تھا۔ دوسری فوج خان خاناں بیرم خاں کی مع بہادر امیروں کے تھی۔ تیسری فوج شاہ ابوالمعالی اور تردی بیگ خاں کی تھی، چوتھی فوج سکندر خاں ازبک، الہ قلی اندرانی اور دیگر امراء کی تھی۔ (یہ سب) سامنے آئیں۔ چونکہ خان خاناں بیرم خاں کی فوج بہت زیادہ اور مستحکم تھی، سکندر سور نے خیال کیا کہ جو کچھ ہے یہی فوج ہے، اس لئے سکندر سور نے خان خاناں کی فوج پر حملہ کیا۔ خانخاناں بیرم خاں نے دیکھا کہ ایرانی سپاہیوں کے گھوڑے مست ہاتھیوں سے ڈر کر بھاگتے ہیں تو اپنے آپ کو بچا کر قلعے میں آ گیا۔ حضرت بادشاہ جائے نماز پر بیٹھے ہوئے اپنے خالق کی درگاہ میں مناجات کر رہے تھے کہ خان خاناں کے متعلق یہ خبر پہنچی۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا کہ ذرا یہ خبر لاؤ کہ خان خاناں زندہ ہیں یا قتل ہو گئے۔ مخبروں نے خبر دی کہ خان خاناں زندہ ہیں اور تدبیر کے ساتھ سکندر سور کے مقابل برسر پیکار ہیں۔ حضرت بادشاہ نے شاہ ابوالمعالی اور تردی بیگ خاں کو حکم دیا کہ چونکہ سکندر سور خان خاناں کے تعاقب میں زیادہ بڑھ گیا ہے اس لئے تم اُس کے قلب پر حملہ کرو۔

شاہ ابوالمعالی اور تردی بیگ نے ایسا ہی کیا اور سکندر سور کے پیچھے سے حملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے جو ایک پل میں فقیر کو بادشاہ اور بادشاہ کو فقیر بنا دیتا ہے اور حضرت بادشاہ کے اقبال و دولت سے صبح سعادت آئی اور حضرت بادشاہ کے فتح مند لشکر کو فتح جاودانی حاصل ہوئی۔

ترا فتح و دولت میسر مدام
بحق محمد علیہ السلام

سکندر سور کو ادبار و شومیٔ قسمت نے گھیر لیا۔ شکست کھائی اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔

قطعہ:

نخشبی در دعاے شاھاں باش
کار خانی وجود شاں دلق است
زندگانی دعاے شاھاں گو
زندگانی شہاں ھمہ خلق است

قطعہ:

نخشبی روزگار گردند است
غم و شادی ھم او تواند داد
گر کسے را غمے دھد روزے
شادئے ھم بدو تواند داد

قطعہ:

نخشبی رنج کس نشد ضائع
بار دارد درخت گل گنجے
شاخ خدمت بدون زر نشود
نیست بیروں زراحتے رنجے

جب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت بادشاہ کو فتح ونصرت نصیب ہوئی تو حضرت خود بدولت دارالملک دہلی کی طرف متوجہ ہوئے۔ سکندر سور شکست کھا کر پہاڑوں میں گھس گیا۔ حضرت بادشاہ نے شاہ ابوالمعالی کو حکم دیا کہ وہ جالندھر میں قیام کرے اور سکندر سور کو دفع کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن شاہ ابوالمعالی جالندھر میں ٹھہرا۔ اور لاہور چلا گیا۔ لاہور میں حضرت بادشاہ کے جو عہدہ دار موجود تھے اُنہوں نے مصلحت یہی سمجھی کہ لاہور کو نہ دیں۔ لیکن کوئی صورت نہ بنی اور شاہ ابوالمعالی قلعے کے اندر آ گیا۔ (1) جوہر کے واسطے حضرت بادشاہ کا حکم تھا کہ تو دامن کوہ اور کابل وقندھار کے اطراف و جوانب سے خبردار رہ، جو خبر تجھ کو معلوم ہو ہمیں پہنچا دے اور خود اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اس معاملے کے لئے مستعد و ہوشیار اور کاربندرہ۔ اس وجہ سے خاکسار جوہر نے سکندر سور کی طرف جاسوس بھیجے تھے جو یہ خبر لائے کہ جب افغانوں کو شکست ہوئی تو حبیب خاں سلطانی کوہ مری میں آ گیا تھا۔ سکندر سور بھی انہی پہاڑوں میں گھس گیا اور حبیب خاں کو مع اُس کے بھائی کے قتل کر ڈالا۔ خزانے میں سے پانچ کروڑ کے قریب مال سکندر کے ہاتھ لگا۔ یہ خزانہ ملنے کے بعد یہ لوگ جہاں کہیں جاتے لوگوں کو بے سروسامان اور بھوکا پاتے۔ سکندر نے ان کو روپیہ دے کر ایک فوج تیار کر لی تھی اور قلعہ مانکوٹ و بہری کے قرب و جوار میں رہتا ہے'' خاکسار جوہر نے یہ اطلاع شاہ ابوالمعالی کو پہنچائی۔ شاہ مذکور ہوش میں آیا اور غور سے سننے لگا اور کہا تو کیا کہتا ہے۔ خاکسار نے جو حقیقت اور واقعہ تھا عرض کر دیا۔ شاہ ابوالمعالی اُن امراء سے جن کو حضرت بادشاہ نے ہمراہ کر دیا تھا مثل محمد قلی پلاس، اسماعیل سلطان دلدی، خواجہ جلال الدین محمود، مصاحب بیگ، فرہاد خاں اور اُن تمام ملازموں سے جو لاہور میں تھے مشورہ کیا کہ آیا ہمیں سکندر سور سے لڑنا چاہئے یا نہیں۔ خاکسار جوہر نے عرض کیا کہ بغیر ارابہ (2) کے سکندر سے ہرگز نہیں لڑنا چاہئے۔ شاہ ابوالمعالی نے کہا ایسا ہونا چاہئے کہ بغیر ارابہ کے ہم نہ لڑیں۔ پھر ارابہ کی تیاری کا اہتمام شروع کیا اور اس لکڑی سے جو لاہور کے قلعے کے لئے لائے تھے ارابے بنانا شروع کئے۔ جوہر نے کہا کہ یہ کام آ جائے گی اور گاڑیوں کے قلابوں وغیرہ کے لئے بھی زنجیریں کافی ہیں اور باقی کام کے واسطے کچے چمڑے کی گاڑیاں ہونی چاہئیں۔ اور لوہے سے چمڑا زیادہ مضبوط ہے۔ اتنی گاڑیاں تیار کر لیں جن کے اندر لشکر سما سکے اور وہ لشکر کے چاروں طرف آ سکیں۔ فقیر جوہر نے بادشاہ کی مہم کامیاب بنانے کی غرض سے تین سو کمانیں (3) تین سو تیروں کے دستے۔ تین سو

نیزے۔ ڈھائی سوڈھالیں۔ پچاس من بارود بندوق۔ تیس من سیسہ اور ایک زرہ شاہ ابوالمعالی کی خدمت میں پیش کی۔ شاہ مذکور بہت خوش ہوئے اور خاکسار جوہر کی بہت زیادہ دلجوئی کی اور کہا کہ میں تیری قدر نہیں جانتا تھا۔ بادشاہ سے ملاقات ہونے پر جو کچھ معلوم ہوا ہے اُس کی سفارش کروں گا۔ اس کے بعد اسلحہ و یراق مذکورہ بالا سپاہیوں میں تقسیم کئے اور کم و بیش پانچ سو مغل بہادر (واللہ اعلم) ولایت سے ابوالمعالی کے پاس آئے۔ اُنہوں نے خاکسار جوہر سے دریافت کیا کہ ان پیادہ مغلوں سے کیا کام لیا جائے۔ فقیر جوہر نے عرض کیا کہ ہر ایک کو ایک کمان اور ایک تیروں کا دستہ اور دو سو مرادی تنکے دیئے جائیں۔ اس لئے کہ آپ کی اور سکندر سور کی مہم ایک مہینہ سے زیادہ نہیں رہے گی۔ ان کے واسطے ایک ماہ کی تنخواہ کافی ہے۔ شاہ ابوالمعالی نے کہا کہ دو سو تنکہ مرادی میں ہر ایک کا کام کیسے چلے گا۔ جوہر نے عرض کیا کہ ہر ایک کے لئے ایک گھوڑے (4) کی ضرورت ہے جو اسلحہ وغیرہ اُٹھائے۔ چالیس تنکہ ماہانہ گھوڑے کے لئے اور دو تنکہ یومیہ سپاہی کی خوراک کے واسطے چاہئیں۔ اس طرح ایک مہینہ میں ساٹھ تنکے ہوئے۔ چالیس اور ساٹھ کل سو تنکے ہو گئے۔ باقی رہے سو تنکے تو اس میں اپنا لباس وغیرہ تیار کریں گے۔ شاہ ابوالمعالی نے یہ رائے پسند کی اور ہر ایک کا مقررشدہ حصہ اُس کو پہنچا دیا۔ اور کوچ کرتے ہوئے سکندر سور کے مقابلہ میں پہنچ گئے۔ دو کوس چلتے تھے اور ہر منزل پر ارابہ اور قلعہ بندی کرتے تھے۔ اور اس کو مستحکم کر کے وہیں قیام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سکندر سور پہاڑ میں آ گیا۔

لاہور آنے سے قبل شاہ ابوالمعالی کی باتوں میں بے اعتنائی اور غرور پایا جاتا تھا۔ اس غرور کی وجہ سے لوگوں کا خیال اُس کے متعلق خراب تھا۔ بعض لوگوں نے یہ باتیں حضرت بادشاہ اور لاہور کے عمال تک پہنچا دی تھیں کہ اگر بادشاہ خود اس طرف تشریف لاتے ہیں تو ایسا انتظام فرمائیں کہ ابوالمعالی کو اپنی خدمت میں بلا لیں۔ (5) بادشاہ نے اس پر شہزادہ عالمیان۔ نور چشم جہانیاں جلال الدین محمد اکبر (خلد اللہ ملکہ ابداً) اور خان خاناں بیرم خاں اور چند دیگر امراء کو مقرر فرمایا۔ یہ لوگ سرہند کے قریب پہنچے تھے کہ محمد قلی برلاس۔ خواجہ جلال الدین محمود۔ فرہاد خاں۔ محمد طاہر۔ میر خورد اور مہتر تمر شربتی جو شاہ ابوالمعالی کے ساتھ رہنے کے لئے نامزد کئے گئے تھے قراولی کے بہانہ نکل آئے اور شاہزادہ عالمیان اور خان خاناں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ ابوالمعالی نے سکندر سور کو جالندھر کے گرد و نواح میں گھیر لیا تھا اور اگر یہ امراء جدا نہ ہوتے تو شاہ ابوالمعالی، سکندر سور کو

زیر کر لیتا۔ (6) غرضکہ ان امراء کے معاملہ کو جو شاہ ابوالمعالی سے علیحدہ ہو کر شاہزادہ عالمیان سے جا ملے تھے، اُس نے تفصیل کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ سکندر سور کو ہم نے دامن کوہ میں گھیر لیا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ اس پہاڑ سے کچھ ایسا حصہ حاصل کریں جس سے سب احباب بہرہ مند ہوں۔ (7) لیکن جن امراء کا ذکر عرضداشت میں درج ہے قراولی کے بہانے علیحدہ ہو کر شہزادہ عالمیان اور خان خاناں سے جا ملے۔ اگر یہ لوگ اس موقع پر بے وفائی نہ کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ سکندر سور کس طرح ہم سے لڑتا ہے۔ ہر چند سپاہیوں کو آگے بڑھایا لیکن کوئی صورت نہ بنی کہ پہاڑ کے اندر گھس جاتے۔ سب منتشر ہو گئے اور کچھ نہ کر سکے۔ (8)

شاہ ابوالمعالی نے ایک عریضہ شہزادہ عالمیان اور خان خاناں کو لکھا کہ ہم نے ملک کو دشمنوں سے خالی کر لیا۔ تقصیر اور تاخیر کا کیا سبب ہے۔ اب مناسب یہی ہے کہ بہت جلد پہنچ جائیں کیونکہ ہم نے سکندر کو دامن کوہ تک دھکیل دیا ہے۔ اور ہم خود لاہور کی طرف جاتے ہیں۔ خان خاناں کا عریضہ بادشاہ کی خدمت میں پہنچا کہ ہم سرہند کے علاقہ تک پہنچ گئے ہیں اور شاہ ابوالمعالی نے سکندر کو دامن کوہ تک پہنچا دیا ہے۔ انشاء اللہ میں پنجاب کے کنارے تک پہنچا دوں گا۔ ابوالمعالی درگاہ عالم پناہ میں حاضر ہوا۔

اب ہم عرضداشتوں کے جوابات بیان کرتے ہیں۔ جب شاہ ابوالمعالی کا عریضہ بادشاہ کی خدمت میں پہنچا تو اُنہوں نے جواب صادر فرمایا کہ عرضداشت اس فرزند رشید وار جمند وسعادت مند کی پہنچی جو کچھ تم نے چند خبطی اور احمقوں کی بیوفائی کے متعلق لکھا ہے (اس کا حال) معلوم ہوا۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب یہ لوگ ہمارے حضور میں پہنچیں گے ان سے جواب طلب کیا جائے گا اور ہر ایک کے لائق اُس کو تنبیہ کی جائے گی۔ تم اس طرف چلے آؤ۔

شاہزادہ عالمیان اور خان خاناں کا جواب شاہ ابوالمعالی کو

تمہارا خط پہنچا۔ جو کچھ لکھا تھا وضاحت سے معلوم ہوا۔ تم خیریت کے ساتھ اس طرف آ جاؤ اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو، اور ہم لوگ جلد ادھر آتے ہیں۔

بادشاہ کا جواب خان خاناں کو

یار وفادار جان سپار خان خاناں بیرم خاں سپہ سالار فرزندی۔ معلوم ہو کہ فرزند ار جمند شاہ

ابوالمعالی کا عریضہ (اس مضمون کا) پہنچ گیا ہے کہ میں نے ملک کو مخالفوں سے خالی کر دیا ہے۔ تو اب جلد کیوں نہیں پہنچ جاتے۔

اب ہم واقعات کی طرف پھر آتے ہیں۔ جس وقت شاہ ابوالمعالی لاہور میں آیا تھا تو اُسی وقت خان خاناں کا ایک ایلچی مسمیٰ بندہ علی توربیگی پہنچا۔ اُس نے کہا تم لاہور میں بلاسبب آ گئے ہو۔ فوراً بادشاہ کی خدمت میں روانہ ہو جاؤ۔ یہ بات سن کر شاہ ابوالمعالی نے کہا امراء کو طلب کرو۔ اسمٰعیل سلطان دلدی نے کہا چودہ پندرہ کوس راستہ چل کر آئے ہیں۔ راستہ کی تکان ہے۔ شام کا وقت ہے اور ابر و بارش بھی ہے۔ اگر خیریت رہی اور مصلحت ہوئی تو علی الصباح روانہ ہوں گے۔ مولانا خواجہ کشمیری، شاہ ابوالمعالی کا وکیل موجود تھا۔

اسمٰعیل سلطان مذکور نے کہا کہ بندہ علی کس کا مہمان ہوگا۔ شاہ ابوالمعالی نے فرمایا کہ مہتر جوہر کا مہمان ہوگا۔ اس پر خاکسار جوہر، بندہ علی مذکور کو اپنے مکان پر لے آیا۔ مہمان داری کی جملہ ضروریات، اللہ جل جلالہ، کے کرم سے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں اور حضرت بادشاہ کے اقبال سے موجود اور تیار تھیں جیسا کہ ہونا چاہئے شرائط مہمانداری بجالایا۔ علی الصباح شاہ ابوالمعالی لاہور سے چل کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

حوالہ جات

1- ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ابوالمعالی کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا تھا۔ نظام الدین کے الفاظ یہ ہیں ''میر ابوالمعالی کو سکندر کے تعاقب میں لاہور بھیجا کیونکہ وہ سوالک کے پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا تھا'' صفحہ 221۔

2- ارابہ ایک قسم کی گاڑی تھی۔

3- اسٹورٹ کے ترجمے میں تین سو ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے سامنے جو نسخہ تھا اُس میں سہ صد تھا۔ ہمارے پاس جو نسخے ہیں اُن میں سی صد ہے۔ یہ کتابت کی صریح غلطی ہے اس لئے سہ صد کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

4- نسخہ میں باجی کا لفظ ہے۔

5- ابوالمعالی کے متعلق لوگوں کا خیال اچھا نہ تھا۔ اس کو جالندھر میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن وہ زبردستی لاہور آ گیا اور وہاں شاہانہ شان وشوکت سے رہتا تھا۔ اس نے لاہور کے حاکم کو نکال کر اپنے ایک آدمی کو مقرر کیا۔ اس پر مقامی عمال نے بادشاہ کو بتلایا کہ اس کی طرف سے بغاوت کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے شہزادہ اکبر کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا۔

6- جوہر نے ابوالمعالی کی برطرفی کا واقعہ جس طرح بیان کیا ہے وہ دوسرے مورخوں سے تفصیلات میں قدرے مختلف ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے نوٹ میں بیان کیا گیا ہے۔

7- یہاں کتابت کی غلطی ہے۔ ترجمہ قیاساً کیا گیا ہے۔

8- یہاں اس عرضداشت کا مضمون ختم ہوا جس میں شاہ ابوالمعالی نے اُن امراء کا معاملہ تفصیل کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

تینتیسویں فصل

بادشاہ کا دارفنا سے دار بقا کی طرف رحلت فرمانا اور حضرت ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کا تخت خلافت پر جلوس فرمانا۔

شاہ ابوالمعالی، بادشاہ کی درگاہ میں حاضر ہوا اور وہاں دو روز قیام کیا۔ اس کے بعد کوچ کرتے ہوئے کلانور میں پہنچے۔ اور اُس طرف سے شاہزادہ عالمیان اور خان خاناں اور دوسرے امیروں کی جماعت بھی پہنچ گئی۔ اور سب ایک جگہ جمع ہو گئے اُس نامبارک زمانہ میں یہ خبر سنی گئی کہ بادشاہ نے ساقیٔ اجل کے ہاتھ سے "**کل نفس ذائقة الموت**" کا شربت پیا اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق **لکل اُمتہ اجل، فاذا جاء اجلهم لا يستاخرون ساعة ولا يستقد مون** عالم وجود سے جانب ملک عدم روانہ ہوئے **انا للّٰہ و انا الیه راجعون**۔ یہ حقیقت عاقلوں پر ظاہر ہے کہ اس عاریتی وجود کو بقا اور عارضی رنگ و بو کو قیام نہیں۔ جس نے زندگی کا لباس پہنا ہے اُس کو موت کا پیالہ چکھنا پڑے گا۔ یہ منزل سب کو درپیش ہے۔

ہر آن کہ زاد بنا چار بایدش نوشید
زجام درد[1] مئے کُل من علیہا فان

ہر وہ درخت جو بار آور ہوا آخر اس کو ذلت کی خاک میں ملنا ہے اور ہر وہ پتا جس میں تری اور تازگی ہے زمانہ کی بادخزاں کے ہاتھوں پژمردہ ہو کر رہے گا۔

کدام سروسہی را زمانہ آبے داد
کہ باز خشک نہ کردش بآتش بیداد

کاہی[2] نے ہمایوں بادشاہ کی تاریخ وفات یوں لکھی ہے۔

ہمایوں بادشاہ آن آفتا بے
کہ فیض شامل او عام افتاد
بناے دولتش چوں یافت رفعت
اساس عمرش از انجام افتاد
چو خورشید جہاں تاب از بلندی
بپایان در نماز شام افتاد
بے تاریخ او کاہی رقم زد
ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

بیشک اس فلک بے مدار کا یہی کام ہے کہ ہر شریعت کے بعد ڈنک مارتا ہے اور فراغت کے شہد کے ہر گھونٹ کے بعد سو قطرے ملامت کے زہر کے چکھاتا ہے۔ خدائے لایزال کی قوت اور اُس کی بے زوال اور روشن دلیل کے سامنے کوئی چارہ نہیں۔ اس جگہ جان دینے کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔ قدم صبر کے راستہ میں رکھنا چاہئے۔ آخر کار سب کو اپنا سر مٹی کے تاریک پردہ میں چھپانا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ جل جلالہ، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُن کی آل کے طفیل میں[3] صبر جمیل اور جزاے جزیل عطا فرمائے۔

رباعی:

اے مرگ ہزار خانہ ویراں کردی
در ملک وجود غارت جاں کردی
ہر گوہر قیمتی کہ آمد بہ جہاں
بردی و بہ زیر خاک پنہاں کردی

اب ہم شہزادہ عالمیان کے تخت پر بیٹھنے کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ (4)

جب بادشاہ سکندر سور کو شکست دے کر دارالملک دہلی میں تشریف لائے تو اُنہوں نے اپنے دعا گو جوہر کو لاہور میں سرکار پنجاب اور سرکار ملتان کا خزانچی مقرر کیا تھا۔ اور یہ دعا گو رات دعا میں مشغول تھا۔ یکا یک اس دعا گو نے عالم غیب سے خواب میں دیکھا کہ بادشاہ اس سے فرماتے ہیں کہ ایک جگہ تیار کر۔ یہ دعا گو گیا۔ ایک پہاڑ تھا جس پر سبز فرش بچھایا گیا تھا۔ اُس فرش پر ایک اعلیٰ قسم کا درباری خیمہ لگایا گیا اُس کی رسیاں سمندر پار تک (کا علاقہ) گھیرے ہوئے تھیں۔ جب یہ عجیب وغریب جگہ درست ہوگئی تو اُس دعا گو نے بادشاہ سے عرض کیا کہ میں نے جگہ تیار کر لی ہے۔ فرمایا کہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کو اس جگہ لے آؤ۔ جب اس دعا گو نے حضرت بادشاہ کی زبان مبارک سے یہ بات سنی تو دل میں خیال کیا کہ ہمیشہ بادشاہ ان کو یعنی (شاہزادہ کو) میرزا کہا کرتے تھے۔ شاید اب ان کو بادشاہی عنایت کی۔ (5) الغرض شاہزادہ عالمیان کو لائے اور اُس جگہ پر بٹھایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اُن کے دست مبارک میں ایک سفید شال ہے۔ کبھی اس کو لپیٹتے ہیں اور کبھی کھولتے ہیں۔ اس دعا گو نے عرض کیا۔ حضرت آپ کو اس جگہ کھیل کے واسطے نہیں بٹھایا۔ اس پر حضرت خود کھڑے ہو گئے اور ایک دیگ اس دعا گو کے ہاتھ پر رکھی اور فرمایا کہ اس کو تھامے رہو۔ اور (کہا) تجھ کو ہمارے کھیل سے کیا غرض۔ یہ دیکھنے کے بعد آنکھ کھل گئی۔ اس واقعہ کو سات روز گزرے تھے کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ، وعم نوالہ، کے فضل سے علم دولت بلند ہوا اور مبارک ساعت میں خلافت اور سرداری اور سلطنت اور جہانداری کا تاج سنہ 962ھ میں کلانور کے مقام پر محمد جلال الدین اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ کے مبارک سر پر رکھا گیا۔ (6) اُس وقت سے سلطنت کی تقدیر خداوند بخشندہ کے انوار بخشش سے چمک رہی ہے اور مصالح ملکی روشن ہیں۔ اللہ نے انوار کی چمک دمک سے دولت کے چراغ روشن کر دیئے ہیں اور خوش رنگ تیغ وخنجر کو سعادت کی صیقل سے مجلیٰ کر دیا ہے۔ تلوار کی دھار کو سعادت دارین کے جوہر سے تیز کیا تا آنکہ مشروعات و مکروہات کی تاریکی وتیرگی ملک سے دفع ہوگئی۔ پس تعبیر اس خواب کی اور ان رسیوں کی جو کہ سمندر سے آگے نکل گئی تھیں یہ ہوئی کہ حضرت رفیع الدرجات کے فضل وکرم سے اور اُس کے بے انتہا رحم سے اور حضرت رسالت پناہ کے صدقہ میں اور خاندان صاحبقراں کے طفیل میں دنیا کا تمام ملک اس بادشاہ کے زیر نگیں ہے۔

جوہر خاکسار نے نعرہ لگایا کہ خدایا دہلی کی سلطنت کا طالع قیامت تک قائم و برقرار رہے!
آمین یارب العالمین، بمنہ وکمال کرمہ۔ اس باب میں چند سطریں حضرت ظل سبحانی کے نام پر لکھتا ہوں جو تخت کشور ستانی پر متمکن ہیں، دنیا کے امن وامان کا باعث، باغ جہاں کا نور، سیستانی چراغ کی ضیا، درخت باغ کامرانی کا ثمر، سکندر مثال بادشاہ، انجم سپاہ، حامیٔ دین اور خسرو عالم پناہ ہیں۔

رباعی[1]:

ہست کفش بجز جود و کرم
جود ہمہ نزد وجودش عدم
ملک ہمہ تابع فرمان او
گوے سخا در خم چوگان او
قاطع زنار جفا و ستم
جامع انواع وفا و کرم

انسان کے آنکھ کی پتلی اُس کے بادرفتار گھوڑے کی نعل اور شہسواران عالم کے کانوں کا حلقہ اُس کی جولان گاہ بنے، اُس کا شجر دولت مرادوں کے باغ میں صرصر حوادث کی تکلیف سے مامون ومحفوظ رہے بندۂ خاکسار جوہر کی طرف سے دعا اور فرشتوں کی طرف سے آمین ہو۔ اہل فضل و کمال کے آئینہ مثال ضمائر کی خدمت میں عرض ہے کہ سہو وخطا کو معاف فرمائیں اور اس کی غلطی سے درگزر کریں تو یہ بات موجب افتخار ہوگی۔

کتاب تذکرۃ الواقعات ہمایونی تالیف کردہ جوہر آفتابچی ہمایوں بادشاہ ختم ہوئی۔

حوالہ جات

1- اصل نسخے میں جام درد ہے لیکن صحیح 'جام دھر' ہے اس لئے اس مصرعے کو 'ز جام دھر مئے کل من علیہا فان' پڑھنا چاہئے۔

2- ان کا پورا نام ملا قاسم کا ہی تھا۔ بایزید نے ان کا نام اکبر کے ملازموں کی فہرست میں لکھا ہے۔

3- ہمایوں رمضان سنہ 962 میں دہلی آیا تھا (طبقات اکبری صفحہ 221 بدایونی صفحہ 125) آئندہ سال ربیع الاول میں اُس کا انتقال ہوا۔ صاحب طبقات لکھتا ہے کہ ہمایوں 7 ربیع الاول کو پھسل کر گرا اور 15 ربیع الاول سنہ 963ھ یعنی آٹھ روز بعد انتقال ہوا۔ بایزید اور عبدالقادر بدایونی نے بھی یہی تاریخ دی ہے۔ اسمتھ نے لکھا ہے کہ ہمایوں گرنے کے بعد صرف تین روز بے ہوش رہا۔ ارسکن نے چار روز لکھا ہے۔ (جلد دوم۔ صفحہ 528)

4- اس ترجمے کے ضمن میں جو دوسرا نسخہ میرزا حسین ہمدانی کا لکھا ہوا ہمارے پیش نظر ہے اور جس پر تاریخ تحریر سنہ 1287 نبوی درج ہے، اُس میں اکبر کی تخت نشینی کا حال درج نہیں۔ یہ نسخہ اس رباعی پر ختم کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد خاتمہء کتاب کی عبارت لکھی ہوئی ہے۔

5- اصل الفاظ یہ ہیں۔ حالا مگر بادشاہی بہ ایشان مقرر داشتند۔

6- صحیح تاریخ سنہ 963ھ ہے نہ کہ سنہ 962ھ۔
اکبر کی تخت نشینی کی تاریخ 2 ربیع الاخر ہے۔ طبقات اکبری و منتخب التواریخ مطبوعہ نولکشور لکھنو میں 2 ربیع الاول ہے۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ اس لئے کہ ہمایوں کی وفات کی تاریخ 10 ربیع الاول ہے (طبقات ص 222 بداؤنی ص 123)۔

7- پیش نظر نسخے میں ''رباعی'' ہی ہے۔ لیکن اشعار مثنوی کی بحر میں ہیں۔ ممکن ہے کاتب نے اپنی طرف سے ''رباعی'' بڑھا دیا ہو۔ رباعی کا وزن اور اس کا طرز علم عروض میں مخصوص ہے۔ اس میں خاص بحر میں صرف چار مصرعے ہوتے ہیں۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

ماہنامہ بدلتی دنیا کراچی

ایڈیٹر: یاسین شیخ

اسسٹنٹ ایڈیٹر: میاں آفتاب احمد کم ذات

رابطہ آفس: 513 یونی شاپنگ سینٹر عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی

ڈاکٹر مبارک علی کی کتابوں کے نئے ایڈیشن

1- تاریخ اور فلسفہ تاریخ	180/-
2- تاریخ کی آواز	180/-
3- تاریخ اور عورت	100/-
4- علماء اور سیاست	100/-
5- برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ	90/-
6- مغل دربار	100/-
7- تاریخ اور تحقیق	180/-
8- جدید تاریخ	200/-
9- آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان	100/-
10- جہانگیر کا ہندوستان	90/-
11- اکبر کا ہندوستان	120/-
12- تاریخ کی روشنی	120/-
13- یورپ کا عروج	140/-
14- در در ٹھوکر کھائے	120/-
15- تاریخ اور سیاست	120/-

ڈاکٹر مبارک علی کی نئی کتب

1- تاریخ اور آج کی دنیا	100/-
2- گمشدہ تاریخ	100/-
3- سہ ماہی تاریخ شمارہ نمبر 28	100/-

قاضی جاوید کی کتابیں

1-	صحت مند مغز ہ	200/-
2-	پنجاب کے صوفی دانشور	180/-
3-	جدید مغربی فلسفہ	110/-
4-	وجودیت	90/-
5-	بھرپور زندگی گزاریئے	130/-

جاوید شاہیں کی کتابیں

1-	سرمایہ داری کے داخلی تضادات	150/-
2-	میرے ماہ وسال (یادداشتیں)	120/-
3-	تعلیمات ماؤزے تنگ	100/-
4-	سی آئی اے کی سیاہ کاریاں	160/-
5-	دیر سے نکلنے والا دن (شاعری)	120/-

دیگر نئی کتب

1-	میرا داغستان	160/-
2-	گورکی کی آپ بیتی	400/-
3-	جنگ اور امن (مکمل)	700/-
4-	ہلاکت گریز عالمی علم سیاسیات	200/-
5-	برصغیر میں اُردو ناول	250/-
6-	دہشت گردی: اسباب نتائج اور حل	120/-